الاسلام

حصہ دوم

از

علامہ ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی

نفیس اکیڈیمی

بلاسس اسٹریٹ ——— کراچی

قیمت دس روپے

ناشر

چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندری

مالک

نفیس اکیڈمی و مسعود پبلشنگ ہاؤس

بلاسس اسٹریٹ کراچی

فون ــــ ۲۳۲۹۵۶

بہ اہتمام ــــ خالد اقبال گاہندری

طبع اوّل ــــ اپریل سنہ ۱۹۰۲ء

طبع دوم ــــ اپریل سنہ ۱۹۶۹ء

مطبوعہ

(باہتمام مستفیض احمد صدیقی انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپا)

حرفِ اوّل

از: محمد اقبال سلیم گاھندری

علامہ ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی گورکھپوری کی مشہور و مقبول کتاب الاسلام پیشِ خدمت ہے۔ علامہ عباسی اس بیسویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی میں ایک بہت بڑے فاضل، روشن دماغ، صاحبِ قلم اور وسیع مطالعہ رکھنے والے عالم تھے۔ وہ انگریزی زبان کے بھی مصنف تھے اور عربی و فارسی کے بھی اچھے عالم تھے۔ انھوں نے اُن اعتراضوں اور بے جا حملوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا جو غیر مسلم اور متعصب مستشرقین کی طرف سے مذہب اسلام اور تعلیمات اسلامی پر بار بار ہوتا رہتا ہے۔ ان کے پاس قیمتی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ اور اس ذخیرہ میں وہ ہمیشہ اضافہ کرتے رہتے تھے۔

اپنی اس کتاب الاسلام میں انھوں نے جہاں بے جا اور جاہلانہ اعتراضات کا مدلل و مسکت جواب دیا ہے۔ وہاں ہر قسم کے عقلی، تاریخی اور علمی دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ دین اسلام اور اسلامی تعلیمات اللہ جل جلالہٗ کی طرف سے دنیائے انسانیت کے لئے ایک نعمت اور سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس نعمت خداوندی کی قدر نہ کر کے انسانیت اپنا نقصان کر رہی ہے اور ان دکھوں اور دردوں سے کراہ رہی ہے جن کا مداوا صرف اس نعمت کی قدر پہچاننے اور اس سے فائدہ حاصل کرنے سے ہی ممکن ہے۔

یہ کتاب بہت مقبول ہوئی تھی اور اہل علم نے اس کتاب کے متعلق بڑے تعریفی ملاحظات لکھے تھے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب جتنی اس وقت مفید مانی گئی تھی اس سے زیادہ مفید اس وقت ثابت ہو سکتی ہے اور جس قدر اس کی ضرورت اس وقت ہو سکتی تھی آج اس سے کہیں زیادہ اس کی ضرورت ہے اگرچہ:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی!

لیکن شاید اس زمانے میں شرار بولہبی بڑی قوت کے ساتھ چراغ مصطفوی سے جنگ آزما ہے۔ افکار و اعمال کی دنیا میں ایک خلفشار سا بپا ہے۔ جو جتنا دانا سمجھا جاتا ہے اتنا ہی بے یقین ہے۔ اور جو جس قدر آزادی فکر کا مدعی ہے اتنا ہی زیادہ ذہنی انتشار کے پیچ در پیچ پھندوں میں الجھا ہوا ہے۔

غرض اس یقین کے ساتھ کہ آج اس کتاب کی ضرورت کل سے زیادہ ہے، ارادہ کر لیا گیا کہ اس کتاب کا ایک جدید ایڈیشن شائع کیا جائے۔ ویسے بھی یہ کتاب مطبع بنقو ٹرسٹ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ میں ۱۹۰۲ء میں چھپی تھی اور اب کمیاب ہی نہیں بلکہ نایاب ہو چکی ہے۔

نفیس اکیڈیمی کی طرف سے نایاب کتابوں کی جدید اشاعتوں کا جو سلسلہ جاری ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کتاب اس سلسلہ کی ایک مفید اور کارآمد کتاب ثابت ہوگی۔ اور اس خدائے بزرگ و برتر سے جس کے قبضہ میں انسانوں کے قلوب ہیں دعا کرتے ہیں کہ اس کتاب کو ناظرین کے لئے مفید اور کارآمد اور ایمان و ایقان کی استواری کیلئے اسے ایک سبب بنا کر ہماری اس حقیر کوشش کے سر پر قبولیت کا تاج رکھ دے۔ آمین

تبلیغ

فہرست مضامین

باب چہارم

شخصی معاملات اور ضابطہ عدالت

باب پنجم

عقائد و علمی مباحث

باب چہارم (۴)

شخصی معاملات اور ضابطۂ عدالت

فصل نمبر ۳

شرکت کاروبار

انسان اپنی خلقت میں ایک دوسرے کا محتاج پیدا ہوا ہے۔ بنی نوع انسان کو باہم مل جل کر کام کرنا ناگزیر ہے۔ کوئی قوم کوئی فرقہ کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں چند آدمیوں کا ایک دل ہو کر شرکت باہمی سے کاروبار کرنا محمود نہ خیال کیا جاتا ہو۔ یہی شرکت کبھی اتفاق کے لفظ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ بہر حال یہ مُسلّم ہے کہ دنیاوی کاروبار میں ایک انسان کا دوسرے انسان سے مدد مانگنا یا بہ شرکت اس کے کام کرنا لابدی ہے۔ اب بحث یہ ہے کہ کن کن امور میں شرکت مناسب ہے۔

اعاظم امور میں شرکت کے نفع یا اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور کیونکر کیا جائے جب دنیا میں کوئی فرد بشر اس سے بے نیاز نظر نہیں آتا۔ گفتگو صرف یہ ہے کہ خانگی امور میں بھی شرکت نفع بخش اور آسائش رساں ہو سکتی ہے۔ یہاں شرکت سے مراد ایک کا دوسرے سے مدد حاصل کرنا نہیں ہے ورنہ یہ حالت تو کسی صورت میں مضر نہیں سمجھی جا سکتی اور نہ کوئی شخص اپنے کو دوسروں کی اعانت سے کسی حالت میں مستغنی کہہ سکتا ہے ہم ماندو بود کی شرکت سے بحث کرتے ہیں اس شرکت میں جہاں سیکڑوں فائدے ہیں وہاں ہزاروں مضرتیں بھی ہیں اس کی بدولت بغض اور حسد کو ترقی ہوتی ہے۔ خانگی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں نفاق کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ ایک دوسرے پر تکیہ کرنے لگتا ہے اس لئے ہمت اور جفاکشی سلب ہو جاتی ہے۔ آدمی نکما ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان سب باتوں پر نظر ڈال کر یہ بات مستحسن خیال کی گئی ہے کہ خانگی اور جزوی معاملات میں شرکت سے گریز کیا جائے۔ قومی باتوں میں، اہم معاملات میں یا ایسے کام میں جسکو عوام سے تعلق ہو شرکت بیشک نفع بخش ہوتی ہے۔ بلکہ انسانی ترقی کا مدار اسی پر ہے۔ لیکن خانگی معاملات میں اس سے جتنا نفع حاصل ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ زحمتیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ تمام عالم کے باشندوں

کے طرز تمدن پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ دانشمند قومیں اپنے خانگی معاملات میں شرکت سے بہت زیادہ اجتناب کرتی ہیں۔ اور اس قسم کی شرکت کو ام الخبائث جانتی ہیں۔ انگریزوں کو دیکھئے کہ وہ اپنے خاندان والوں سے کس طرح برتاؤ کرتے ہیں۔ اپنے یگانے بھائی بھتیجے سے شرکت رکھنا کیسا وہ حتی الوسع یہ چاہتے ہیں کہ باپ بیٹے بھی یکجا نہ رہیں۔ بیٹے ذرا ہوشیار ہوئے کہ کسی بورڈنگ ہاؤس میں داخل کئے گئے وہاں سے نکلے تو فکر معاش میں پڑے۔ مگر باپ سے بالکل الگ ہو کر۔ معیشت کی صورت بندھی تو گھر بسانے کی سوجھی لیکن وہ بھی کبھی کبھی باپ سے بھی استمزاج کئے بغیر۔ ان میں باپ بیٹے کی یکجائی کا زمانہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ جب تک بیٹا خود معاش پیدا کرنے کے قابل ہوگا باپ اس کا بھوکوں مرنا گوارا نہ کرے گا خرچ سے ضرور مدد کرے گا لیکن یہ نہ ہوگا کہ بیٹے باپ کے ساتھ سکونت اختیار کریں اور اسطرح باپ کی آزادی میں خلل ڈالیں۔ یہاں ان حالتوں کا تذکرہ نہیں ہے کہ باپ اپنے کسب معاش یا اجرائے پیشہ میں دلسوز ملازمین یا معاونین کا محتاج ہو اور اس غرض سے وہ اپنے بیٹوں کی معیت مرجح تصور کرے اس قسم کی یکجائی ممالک یورپ میں بھی دیکھی جاتی ہے مگر اس طور پر بیٹے اور باپ کی شرکت وہیں تک قائم رہے گی جہاں تک غرض مشترک کو تعلق ہے ان کے خانگی معاملات پھر بھی علیحدہ علیحدہ رہیں گے۔

انگریزوں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کے پاس کسی منصبی کام کے انصرام میں (ملنے کی غرض سے نہیں) آکر ٹھہر گیا تو چلتے وقت خانساماں نے خرچ خوراک کا بل پیش کر دیا۔ ہم لوگوں کا طرز تمدن اس کو بہت ہی مکروہ بتاتا ہے۔ لیکن فی الواقع یہ ہماری بھول ہے اس میں کوئی اکراہ نہیں یہ معاملہ کی صفائی ہے۔ جب تک ہم خود اپنے قوت بازو سے کماتے ہیں دوسرے کا احسان کیوں لیں۔ یا جب کوئی ہماری بخششوں کا محتاج نہیں ہے تو ہم اس کے ساتھ کیوں سلوک کریں۔ تحائف اور ہدایا کا بھیجنا خواندہ مہمان ہونا یہ دوسری باتیں ہیں جن سے محبت کو ترقی ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم کسی دنیاوی کام کی غرض سے کہیں آئیں تو کیا ضروری ہے کہ کسی عزیز کے گھر ہی ٹھہریں۔ کوئی دوسری جگہ ٹھہرنے کے لائق عمدہ نظر نہ آئے اور اس لئے اپنے کسی رشتہ دار کے پاس جا اتریں تو یہ کیا کہ خواہ مخواہ اس پر اپنے خرچ کا بار بھی ڈالیں۔

ہندوستان میں شرکت کا معاملہ بالکل نرالا ہے۔ اب تو کچھ ترمیم ہو چلی ہے ورنہ وہ پہلے تو تین تین اور چار چار پشتیں گزر جاتی تھیں مگر خاندان کی حالت مشترک رہتی تھی۔ کبھی کبھی ممبروں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ جاتی تھی لیکن کاروبار مشترک رہتا تھا۔ خاندان میں ایک ہی شخص امام یا پیشوا ہوتا تھا باقی سب مقتدی ہوتے تھے یا نیم غلام ہوتے تھے۔ اس قسم کا طرز تمدن بیشک مصلحتوں پر نظر ڈال کر

اختیار کیا گیا تھا۔ مصالح سے ہم کو اس وقت گفتگو نہیں ہے۔ کہنا یہ ہے کہ نفع سے ضرر بڑھا ہوا ہے۔ ہندوستان میں آزادی بہت کم ہے۔ ہمتیں پست طبیعتیں بجھی ہوئیں۔ خیالات محدود۔ دل غلاموں سے بھی زیادہ کمزور۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آب و ہوا کا یہ اثر ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا بھی ہو لیکن ان برائیوں کے پیدا کرنے میں یہ طرز تمدن ضرور شریک غالب ہے۔

عربوں کے اصول بھی انگریزوں سے ملتے جلتے ہیں وہ اپنے خانگی کاروبار میں کسی کی شرکت پسند نہیں کرتے۔ "مال عرب پیش عرب" اپنا مال اپنے قبضہ اور اختیار میں ایک کو دوسرے سے لگاؤ نہیں حتیٰ کہ زن و شو کے درمیان بھی مال و دولت اور اثاثہ کی تفریق ہوتی ہے۔ اس برتاؤ کے اثر سے جو سچی خوشی سچی آزادی اور بے فکری (جس کو لطف زندگانی کہتے ہیں) عربوں کو اس گئی گزری حالت میں بھی حاصل ہے وہ بیان کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ آنکھوں سے جا کر دیکھنے کی چیز ہے۔

برٹش عدالتیں ہمیشہ ملکی رسم و رواج کی پابند ہوتی ہیں۔ ہندوؤں میں شرکت خاندانی اس درجہ عام ہے کہ ممبران خاندان ہنود کی نسبت قانونی قیاس شرکت کا قائم ہوتا ہے اور خاندان کا منقسم ثابت کرنا اس فریق کے ذمہ ہوتا ہے جو ایسا بیان کرے یہ اصول ہمارے نزدیک بہت زیادہ ترقی کا مانع ہے۔ تجارت کرنے نوکری کرنے یا کسی اور اعلیٰ ذریعہ سے غیر ملکوں کا سفر کر کے دولت پیدا کرنے میں ہر سمجھدار کو یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ اس کی محنت میں حصہ لینے کی غرض سے وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے جو چچیرے بھائی یا اس سے بھی دور کے رشتہ دار ہیں۔

ہند کے مسلمانوں نے بھی اپنے پڑوسیوں کا طرز تمدن اختیار کیا اور ان میں بھی اس قسم کے شوق اور خیالات بہت زیادہ پھیل گئے۔ اگر ایک شخص ذرا فارغ البال ہے تو تمام کنبہ اس پر بار ہے۔ وہ تو ترقی کرنا چاہتا ہے مگر کنبہ پروری کا بوجھ اسے ابھرنے نہیں دیتا۔ لوگ اس قسم کے سلوک کو نہایت مستحسن سمجھتے ہیں اور مفلس اعزہ اپنے اس استحصال بیجا کو عیب نہیں سمجھتے۔ لیکن ہمارے نزدیک منعم اور منعم لہٗ دونوں بر سر خطا ہیں۔ اگر ہم کو خدا مالدار کرے تو دوسروں پر احسان کرنا اقتضائے شکران نعمت ہے۔ لیکن گفتگو یہ ہے کہ احسان کا پیرایہ اور شکران نعمت کا طریقہ کیا ہے۔ کوئی غریب بھائی ہمارا دست نگر ہو تو ہم کو چاہیئے کہ اس کے لئے کاشتکاری کا بندوبست کرا دیں۔ بیل مول لے دیں۔ کھیت ٹھہرا دیں۔ گھر۔ اثاثہ اور کچھ دنوں کے کھانے کا سامان مہیا کرا دیں اور پھر اس سے کہدیں کہ تم الگ اپنے بال بچوں میں آزادی کے ساتھ بسر کرو۔ اگر وہ اس ڈھب کا نہیں ہے تجارت کا خواہش مند ہے یا کسی حرفت وصنعت کی طرف اس کی طبیعت راغب ہے یا نوکری کرنا چاہتا ہے تو ویسا سامان کر دیں۔ اگر سچ

پوچھئے تو سچے سلوک کی یہ سب صورتیں ہیں۔ باقی رہی مروجہ صورت وہ ہمارے نزدیک نہ سچی سخاوت ہے نہ پوری ہمدردی بلکہ ایک قسم کی ریاکاری اور خاصی فرعونیت ہے۔ کوئی غریب بھائی مدد کے لئے آیا۔ اس کا کھانا مقرر کردیا۔ دونوں وقت وہ "مگسِ خوان اغنیا بودن" کا مصداق ہے۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ فلاں رئیس کے دسترخوان پر بیسیوں آدمی روٹی کھاتے ہیں۔ تمام کنبہ کا بار اس کے سر پر ہے نام تو بہت بڑا پایا لیکن فی الواقع جو کچھ کیا اپنی خودغرضی سے۔ یہ جتنے گھر میں بھرے ہوئے ہیں غلام سے بھی بدتر حالت میں ہیں اور نوکروں سے بھی زیادہ کام کرتے ہیں۔

ہم مختلف پیرایہ سے یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ شرکت بسااوقات بجائے نفع کے مضرت پہنچاتی ہے لیکن یہ بحث چنداں محتاج ثبوت نہیں ہے۔ کم وبیش سب ہماری تحریر سے اتفاق کریں گے۔ اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اس شرکت کے مسئلہ نے انگریزی عدالتوں یا انگریزی انصاف پر کیا اثر ڈالا۔

ایک تو ہندو خاندان مشترکہ کی صورت ہے۔ کبھی تو پیشوائے خاندان دوسرے کمزور ممبروں کی حق تلفی چاہتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بے تعلق اشخاص اپنے متمول رشتہ داروں کی مکسوبہ جائدادوں میں حصہ لینے کی غرض سے اسے خواہ مخواہ اپنا پیشوا ٹھہراتے ہیں۔ دیوانی اور فوجداری کے مقدمات کی مسلیں الٹی جائیں تو نہ معلوم کتنے مقدمے ایسے نکلیں گے جنکی بنیاد یہیں سے شروع ہوئی ہے۔

دوسری صورت اشتراک کی یہ ہے کہ اکثر دیہات کی پٹے داریاں مشترک ہیں نمبردار یا زبردست حصہ دار چاہتا ہے کہ آسامی اسی کے اختیار میں رہے دوسرے حصہ داروں کا وہ خواہ مخواہ منیجر بنا رہے۔ جتنے ہیں سب اس کے دستنگر رہیں ادھر دوسرے کمزور حصہ دار ہیں کہ اپنا رنگ علیحدہ جمانا چاہتے ہیں یہی آگے چل کر نفاق کا سبب بن جاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھئے اور کل نزاعات کے ابتدائی اسباب پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جتنے مقدمات دیوانی، فوجداری اور کلکٹری عدالتوں میں دائر ہوتے ہیں ان میں سے نصف اسی پٹے داری مشترک کے سبب سے قائم ہوتے ہیں۔ ان دقتوں کے مٹانے کے لئے تقسیم کا ایک چارہ کار قانونی ہے مگر اس کی کارروائی میں اتنی تاخیر ہوتی ہے اور فریق متمول کو جائز و ناجائز کارروائی کے مواقع اتنے ملتے ہیں کہ کمزور شرکا تقسیم کے نام سے گھبراتے ہیں۔ کیونکہ تقسیم سے قبل جھوٹی، سچی حصہ داری کی صفت قائم بھی رہتی ہے۔ مالگزاری گھر سے دینا نہیں پڑتی ہے تقسیم میں کہیں بجز اور ناقابل زراعت زمین حصہ میں آئی تو سرکاری مالگزاری بھی گھر سے دینا پڑے گی۔ گو اس قسم کے معاملات بہت کم ہوتے ہیں۔ کمزور حصہ داروں کے لئے تقسیم سے اچھا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ مگر ناسمجھ لوگ اس عمدہ چارہ کار کے اختیار کرنے سے بہت زیادہ گریز کرتے ہیں اور ایک سیدھی راہ کے بھولنے سے ایسے ایسے

نقصان اٹھاتے ہیں کہ ناگفتہ بہ۔

یہاں تک تو شرکت کاروبار کی مذمت ہی بیان کی گئی۔ اب کچھ اس کی بھلائیاں بھی لکھنا چاہیئے۔ شرکت کاروبار صرف خانگی معاملات میں یا جزئیات میں نامناسب ہے۔ ورنہ بڑے معاملات میں شرکت ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر کامیابیوں اور ترقی کا مدار ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ جتنا ہی ہم کو چھوٹے معاملات میں شرکت کا شوق ہے اتنا ہی بڑے معاملات میں شرکت سے نفرت ہے۔ ہم جانتے ہی نہیں کہ بڑے بڑے معاملہ میں شرکت سے دنیا کی دوسری قومیں کیا کیا منافع اٹھاتی ہیں۔

ہندوستان میں اشتراک کاروبار کی ایک بہترین یادگار موجود ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہند کی حکومت اسی ذریعہ سے حاصل کرلی۔ لیکن ہم سے کبھی یہ نہ ہوگا کہ کوئی کوٹھی اشتراکی قائم کرکے کچھ اپنا جوہر دکھائیں انگریزوں کے منہ چڑھانے کو ہندوستان میں بھی سیکڑوں لیٹڈ کمپنیاں قائم ہوگئیں۔ لیکن کامیابیاں زیادہ تر انھیں کمپنیوں کو ہوئیں جو انگریزوں کے ہاتھوں میں تھیں یا جن میں شریک غالب یوروپین تھے۔

اب ہم دکھاتے ہیں کہ شرع محمدیؐ نے ان دو قسموں کی شرکتوں کی نسبت کیا بتایا ہے اس میں شبہ نہیں کہ خانگی معاملات کی شرکت اسلام نے بہت زیادہ ناپسند کی ہے۔ اس کے ثبوت میں خود آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ سند میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ آنحضرتؐ کی متعدد ازواج مطہرات تھیں۔ جن میں سے ہر ایک کے مکانات جدا تھے اور کھانے پینے کا سامان بھی علیحدہ تھا۔ باری باری سے آنحضرتؐ ازواج مطہرات کے گھروں میں شب باش ہوتے تھے۔ اور خود آنحضرتؐ کا قیام بھی اپنے ازواج کے گھروں میں گویا بطور مہمان کے ہوتا تھا۔ یعنی آنحضرتؐ کی چیزوں اور ازواج مطہرات کی چیزوں میں امتیاز کیا جاتا تھا۔ اور ہر ایک کو اپنے اسباب میں آزادانہ حقوق حاصل تھے۔ اسکے بعد حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے ساتھ جو برتاؤ آنحضرتؐ کا تھا وہ بھی قابل لحاظ ہے۔ حضرت علیؓ آنحضرتؐ کے چچازاد بھائی تھے اور آنحضرتؐ نے مثل فرزند کے انکی پرورش کی تھی۔ حضرت علیؓ کے ماں باپ مرچکے تھے سوائے آنحضرتؐ کے دوسرا ان کا مربی نہ تھا آنحضرتؐ نے جب اپنی چہیتی بیٹی حضرت فاطمہؓ کو ان کے ساتھ بیاہا تو پہلے حضرت علیؓ سے ان کا اثاثہ بکوا کر خانہ داری کا سامان مہیا کروالیا تب کہیں حضرت فاطمہ کو ان کے حوالے کیا۔ آنحضرتؐ کو بیٹی اور داماد کی روٹی دوبھر نہ تھی۔ بلکہ محض اپنے طرز عمل سے یہ تعلیم کرنا مقصود تھا کہ شادی کرنے کے بعد زن وشوا پنے کنبے سے علیحدہ ہوکر رہیں گے جب ہی وہ آزادی کا مزا اٹھائیں گے اور دین ودنیا کے فائدے حاصل کرسکیں گے مزید توضیح

کے لئے ۱۰ اخوۃ اسلامی، فصل ۱۹ کتاب ہذا پڑھنا چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بڑے بڑے امور میں مسلمانوں کے اشتراک پسند کرنے سے ظاہر ہے کہ پیغمبرؐ اور بعد پیغمبرؐ کے خلفائے اربعہ کل بلاد اسلام کے تنہا شہنشاہ تھے معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی چند روزہ لڑائیاں نظر انداز کی جائیں۔ تو بنو امیہ بھی سو برس کے قریب تمام بلاد اسلام پر قابض تھے۔ فرانس سے لے کر ہندوستان اور تاتار تک جہاں اب اس تہذیب کے زمانہ میں بھی بیسیوں شہنشاہ جدا جدا حکومت کرتے ہیں۔ تنہا بنو امیہ حکمران رہے۔ بنو عباس بھی شروع شروع تمام بلاد اسلام پر تنہا قابض تھے کچھ دنوں کے بعد اندلس نکل جانے پر بھی تمام افریقہ اور ایشیا کے بلاد اسلام پر اپنے عروج کے زمانہ میں تنہا بنو عباس کی حکومت تھی ان حکومتوں کو یوں سمجھئے کہ بادشاہ کوئی چیز نہیں ہوتا۔ ارا کین دولت حکومت کی جان ہوتے ہیں۔ مشرق سے مغرب تک جتنے ارا کین دولت تھے وہ نسل عرب سے تھے۔ باپ دادا سے وہ سبق سنتے آئے تھے جن میں رسول اللہ نے اہم کاموں کو بالاتفاق انجام دینے کی بابت تاکیدیں کی تھیں یہ اسی سبق کا اثر تھا کہ جب تک مسلمانان عرب با حکومت تھے کبھی ان کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ وہ علیحدہ علیحدہ حکومتیں کریں لیکن وہی ملک جب دوسری قوم کے حاکموں اور گورنروں کے ہاتھ آیا تو وہ شرکت کی برکات نہ سمجھ سکے اور جا بجا خود مختارانہ روش اختیار کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ یہ بھی واضح رہے کہ جب تک سلطنت عربوں کے ہاتھ میں تھی بادشاہ سلطنت کو کاروبار شراکت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں سمجھتا تھا اور نہ خود کو کوٹھی شراکتی کے مینیجر سے بڑھ کر جانتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ تمام یورپین مورخ بالاتفاق کہتے ہیں کہ دنیا کی شہنشاہی عربوں سے اچھی کسی نے نہیں کی۔ سلاطین اسلام نے زمانہ مابعد میں جو حالت اختیار کی وہ اس طرز سے بالکل جداگانہ تھی جس پر سلاطین عرب قائم تھے اور یہی وجہ روز بروز ان کے انحطاط کی ہوئی۔ غرض کہ جس طرح اس وقت دنیا کی زندہ قومیں خانگی معاملات میں شرکت ناپسند کرتی ہیں اور بڑے بڑے کاموں میں شرکت کی دلدادہ ہیں یہی کیفیت تمام مسلمانوں کی زمانۂ عروج میں تھی۔ رہے نام اللہ کا۔ کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

فصل نمبر ۳۳

توریث

نکاح اور وراثت یہ دو باتیں انتظام عالم قائم رکھنے کے لئے نہیں تو تمدنی حالت کو اعلیٰ درجہ پر رکھنے کے لئے بہت ہی اہم ہیں۔ مسلمانوں کو اس پر ناز تھا کہ ان دو مباحث پر ان کے قانون اتنے عمدہ اور مستحکم اصول پر ہیں کہ اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ "ناز تھا" کا یہ مطلب ہے کہ اب اس پر ناز نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس خود ہند کے مسلمانوں کا تو یہ خیال ہے کہ خدا نے اگر قرآن میں کچھ غلطی کی ہے تو وہ انھیں مسئلوں کے متعلق کی ہے۔ ہمارے نزدیک جن لوگوں کے خیالات ایسے ہوں وہ ہرگز ہرگز بھی مسلمان نہیں ہیں۔ ہم مسلمان ہو کر شراب پئیں۔ بدافعال کے مرتکب ہوں۔ سود کھائیں اور دل میں ہم سمجھیں کہ برا کرتے ہیں تو ہم صرف مسلمان ہیں دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوئے لیکن اس کے ساتھ اگر ہم یہ خیال کریں کہ شراب ایسی پاک اور عمدہ چیز قرآن میں "من عمل الشیطان" کہی گئی ہے تو یہ سراسر نامناسب ہے زنا کرنے والوں کے لئے جو سخت سزا قرآن میں لکھی گئی ہے ہرگز مناسب حال نہیں ہے۔ سود کھانے کو اکل نار لکھا ہے یہ بالکل ہی مصلحت عامہ کے خلاف ہے۔ تو ہمارا یہ سوچنا یہ معنی پیدا کرے گا کہ قرآن کے احکام موجودہ زمانہ کے موافق نہیں رہے اب ایک دوسرا نبی اور دوسری کتاب نازل ہونا چاہیئے جو موجودہ ضرورتوں کو سمجھے اور موجودہ حالت کے موافق ہو۔ جب ہمارا یہ اعتقاد اپنے مذہب اور مذہبی کتاب کی نسبت ہوا تو ہم مسلمان کہاں رہے۔ اقرار باللسان صرف ایک منافقانہ فعل رہ گیا۔ تصدیق بالقلب کہاں رہی اور ہم بے اس کے مسلمان کہاں رہے۔ قرآن کو دل سے ناپسند کریں اور اس کے حکم کو خلاف مصلحت جانیں اور پھر مسلمان کے مسلمان بنے رہیں۔ اچھا اسلام ہے۔

ابتدائے اسلام میں ایک یہودی اور ایک مسلمان میں کچھ جھگڑا ہوا۔ یہودی آنحضرت

محمدؐ کو رسول اللہ نہیں مانتا تھا لیکن ان کو ایک اچھا منصف تسلیم کرتا تھا۔ مسلمان نام کا مسلمان تھا لیکن دل سے منافق تھا۔ اس خاص جھگڑے میں وہی برسرخطا تھا اس لئے اسے کسی منصف مزاج کی بھی ضرورت نہ تھی۔ یہودی نے آنحضرتؐ کو فیصلے کے لئے ثالث مقرر کیا۔ مسلمان اس خیال سے راضی ہوگیا کہ شاید مذہبی خیال سے آپؐ میرے موافق فیصلہ کریں گے۔ جب آنحضرتؐ نے اس منافق کے خلاف فیصلہ کیا تو وہ راضی نہ ہوا اور عمرؓ بن الخطاب کے پاس یہودی کو لے آیا اور چاہا کہ یہاں سے دوسرا فیصلہ اپنے موافق صادر کرائے۔ عمرؓ بن الخطاب کو جب معلوم ہوا کہ یہ مسلمان برسرخطا ہے اور پیغمبر خدا کے فیصلہ کو غلط سمجھ کر مجھ سے اس کے خلاف امید رکھتا ہے تو وہ مکان کے اندر چلے گئے اور تھوڑی دیر میں ننگی تلوار لے کر نکلے اور اس منافق کو قتل کر دیا اور کہا کہ "اب حق اور باطل میں فرق ہوگیا۔ زبانی فیصلہ سے یہ مردود کبھی راضی نہ ہوتا۔" اسی واقعہ سے حضرت عمرؓ کو الفاروق خطاب دیا گیا۔ مسلمان ہوکر جو توریث کے متعلق جھوٹی تدبیریں سوچتے ہیں اور احکام خدا اور رسولؐ کی قدر نہیں کرتے وہ خود سمجھیں کہ زمانہ رسولؐ میں وہ کیا سمجھے جاتے۔

نکاح کے متعلق جو خوبیاں مذہب اسلام میں رکھی گئی ہیں ان کا بیان فصل نمبر ۳۸ "نکاح" میں ہوگا۔ یہاں صرف مسائل توریث اور انکی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں۔

آیات قرآنی

"ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں مردوں کا حصہ ہے اور اسی طرح عورتوں کا بھی تھوڑا بہت مال باپ اور رشتہ داروں کے ترکے میں حصہ ہے اور ٹھہرایا ہوا ہے۔ تقسیم ترکہ کے وقت رشتہ دار یتیم اور مساکین آموجود ہوں تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دیدیا کرو اور نرمی سے گفتگو کرو۔"[1]

(سورۂ نساء رکوع ۱)

"تمہاری اولاد کے حق میں اللہ بتاتا ہے کہ مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ دیا جائے اور اگر عورتیں ہی ہوں تو دو سے زیادہ کو ترکہ کی دو تہائی اور اگر ایک ہو تو اس کو آدھا۔ میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کو (اگر اس میت کے اولاد ہو) ترکے کا چھٹواں حصہ اور اولاد نہ ہو اور ماں باپ دونوں وارث ہوں تو ماں کو ایک ثلث اور میت کے بھائی بہنیں ہوں تو ماں کو ایک سدس ترکے کی

---

[1] للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منہ او کثر نصیبا مفروضا واذا حضر القسمۃ اولوا القربی والیتمی والمسکین فارزقوھم منہ وقولوا لھم قولا معروفا۔

کی تقسیم ادائے وصیت (اگر میت نے وصیت کی ہو) یا قرض کے بعد ہے۔ تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ اور بیٹوں میں سے کون تم کو زیادہ نفع پہنچائے گا۔ اللہ کی طرف سے حصے مقرر ہیں کہ وہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اگر تمہاری بیویاں اولاد نہ چھوڑیں تو تم کو نصف ترکہ ملے گا اور اولاد ہو تو چوتھائی ترکے کی یہ تقسیم ادائے وصیت (اگر میت نے وصیت کی ہو) یا قرض کے بعد ہے۔ اور تمہارے ترکے میں تمہاری بیویوں کا حصہ اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو ایک چوتھائی ہے اور اولاد ہو تو آٹھواں حصہ ترکہ کی یہ تقسیم ادائے قرض یا تعمیل وصیت کے بعد ہے۔ اگر میت نے کچھ وصیت کی ہو۔ کوئی مرد یا عورت بے اصل و فروع ہو اور اخیافی بھائی یا بہن چھوڑے تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ہے اور اس سے زیادہ ہوں تو وہ ایک ثلث میں شریک ہیں ترکے کی یہ تقسیم بعد ادائے قرض یا تعمیل وصیت کے ہے اگر میت نے وصیت کی ہو اور ضرر ان میں نہ ہو۔ یہ اللہ کی وصیت ہے۔ اللہ دانا اور بردبار ہے۔ اللہ کی یہ حدیں ہیں۔ جو کوئی اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔ جسکے نیچے نہریں جاری ہیں اور جہاں ہمیشہ رہنا ہوگا اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ جو کوئی اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدوں سے بڑھ جائے گا اسے اللہ دوزخ میں ڈالے گا اور اس پر ذلت کا عذاب ہوگا۔[1]

(سورۂ نساء رکوع ۲)

ماں باپ اور رشتہ دار جو کچھ چھوڑیں اس کے حق دار ہم نے ٹھہرا دیئے ہیں اور جن لوگوں کے ساتھ تمہارے عہد و پیمان ہیں کچھ حصہ ان کو بھی دے دو۔ ہر چیز اللہ کے پیش نظر

---

[1] یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین فان کن نساءً فوق اثنتین فلھن ثلثا ما ترک وان کانت واحدۃ فلھا النصف ولابویہ لکل واحد منھما السدس مما ترک ان کان لہ ولد فان لم یکن لہ ولد وورثہ ابواہ فلامہ الثلث فان کان لہ اخوۃ فلامہ السدس من بعد وصیۃ یوصی بہا اودین اباؤکم وابناؤکم لاتدرون ایھم اقرب لکم نفعاً فریضۃ من اللہ ان اللہ کان علیماً حکیماً ولکم نصف ما ترک ازواجکم ان لم یکن لھن ولد فان کان لھن ولد فلکم الربع مما ترکن من بعد وصیۃ یوصین بہا اودین ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترکتم من بعد وصیۃ توصون بہا اودین وان کان رجل یورث کللۃ اوامراۃ ولہ اخ او اخت فلکل واحد منھما السدس فان کانوا اکثر من ذالک فھم شرکاء فی الثلث من بعد وصیۃ یوصی بہا اودین غیر مضار وصیۃ من اللہ واللہ علیم حلیم۔ تلک حدود اللہ ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنت تجری من تحتھا الانھر خلدین فیھا وذلک الفوز العظیم ومن یعص اللہ ورسولہ ویتعد حدودہ یدخلہ ناراً خالداً فیھا ولہ عذاب مھین۔

ہے ؎۱ سورۂ نساء رکوع ۵ ۔

پیغمبر! لوگ تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں تو کہہ دو اللہ کلالہ کے بارے میں تم کو حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی مرد لاولد مر جائے اور اس کی بہن موجود ہو تو بہن کو اس کے ترکے کا آدھا اور بہن لاولد مر جائے تو اس کے کل مال کا وارث بھائی ہو گا۔ اگر بہنیں دو ہوں تو دونوں کو ترکے کا دوثلث ملے گا۔ اور اگر بھائی بہن ہوں کچھ مرد اور کچھ عورتیں تو دو عورتوں کے برابر ایک مرد کا حصہ ہو گا تمہارے بھٹکنے کے خیال سے اللہ تم سے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ سورہ نساء رکوع ؎۲ ۲۴۔

ان آیات قرآنی سے فقہ نے مختلف صورتیں پیدا کر کے مسائل وراثت کو اتنے عمدہ طور پر ظاہر کیا ہے کہ کسی طرح اس سے اچھی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ مختصر یہ ہے کہ جن کے حصے قرآن میں معین ہیں۔ وہ ذوی الفروض کہلاتے ہیں ان کے حصے دینے کے بعد عصبات کو جو عموماً ایک جدی ہوتے ہیں حصہ ملتا ہے بعد ازاں ذوی الارحام پاتے ہیں جس میں دوری اور مادری رشتہ دار شامل ہوتے ہیں ۔

سورۂ نساء میں چند مقامات پر آپ زیادہ غور کیجئے۔ شروع میں خدا نے مردوں کا حصہ عورتوں سے دو چند قرار دیا ہے اب اس پر بھی مرد شکر نہ کریں تو سخت نا فرمانی ہے اولاد کے ہوتے ہوئے والدین کو حصہ دینا بعض جہلائے عرب کو پسند نہ تھا اس لئے ان نافہموں کے لئے وسط رکوع میں خدا کہتا ہے "تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ یا اولاد میں سے تم کو کون زیادہ نفع پہنچائے گا" اس کا منشا یہ ہے کہ خدا تم سے زیادہ سمجھتا ہے۔ تم لوگ یہ خیال نہ کرو کہ میراث کی یوں تقسیم ہوتا تو اچھا تھا۔ اور یہیں سے صریح تردید اس خیال کی بھی ہوتی ہے کہ بیٹوں کے ہونے سے یا بیٹوں میں جائداد کے رہنے سے بقائے نام

؎۱ ولکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون والذین عقدت ایمانکم فاتوہم نصیبہم ان اللہ کان علی کل شیٍ شہیداً۔

مسلمان جب مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گئے تھے رشتہ داروں سے قطع تعلق ہو گیا تھا اس وقت آپس میں لوگوں نے بھائی چارہ کر لیا تھا۔ پھر جب اسلام پھیلا ہر ایک کے شرعی وارث موجود ہوئے اور آیت توریث بھی نازل ہو چکی تھی تب یہ حکم ہوا کہ جن سے عہد و پیمان ہے یا جن سے حسن سلوک سے ہے ان کو بھی کچھ جیتے جی دیدو یا مرنے کے بعد انکے حق میں وصیت کر دو۔ وصیت کی فصل میں مشرح بیان کیا جائے گا کہ وصیت کے مصالح کیا ہیں اور کسی حالت میں وصیت ایک ثلث سے زیادہ روا نہیں ہے ۔

؎۲ یستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ ان امرؤ ہلک لیس لہ ولد ولہ اخت فلہا نصف ما ترک وہو یرثہا ان لم یکن لہا ولد فان کانتا اثنتین فلہما الثلثٰن مما ترک وان کانوا اخوۃ رجالاً ونساءً فللذکر مثل حظ الانثیین یبین اللہ لکم ان تضلوا واللہ بکل شیٍ علیم۔

رہے گا اور مورث کو کچھ نفع پہنچے گا۔ اس کے بعد ہی خدا کہتا ہے "اللہ کی طرف سے حصے مقرر ہیں کہ وہ جاننے والا حکمت والا ہے" یعنی یہ حصے جو مقرر ہیں خدا کے مقرر کئے ہوئے ہیں کوئی اس سے عدول نہ کرے۔ کسی کے دل میں یہ خیال نہ گزرے کہ یہ حصے مصلحت وقت کے خلاف ہیں کوئی ایسا بے ادب خیال دل میں لائے گا تو خدا کو معلوم ہو جائے گا۔ وہ دلوں کی بات جانتا ہے۔ کیا تم کو خدا کے حکیم ہونے میں شبہ ہے اور تم سمجھتے ہو کہ تم خدا سے اچھا قانون بنا سکتے ہو۔ ہرگز نہیں۔ خدا نے اخیر میں کہدیا کہ دین یا وصیت تقسیم ترکے سے پہلے جب ہی قابل لحاظ ہے کہ اس میں ضرر نہ ہو یعنی جب محض ورثا کی محرومی کے لئے وصیت یا دین عاید نہ کیا گیا ہو۔ سیدھے سیدھے طور پر سمجھا کر اور پھر حکم خدا پر چلنے والوں کے لئے جنت کی بشارت دے کر انسان ایسی سرکش مخلوق کے لئے اخیر رکوع میں پھر خدا صاف صاف کہتا ہے کہ۔ جو کوئی اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدوں سے بڑھ جائے گا اسے اللہ دوزخ میں ڈالے گا۔ اور اس پر ذلت کا عذاب ہوگا" اب وہ حضرات جو خدا کے حکم اور خدا کے وعدوں کو محض امر موہوم سمجھتے ہیں۔ حقوق غصب کرنے میں نڈر ہیں مرنے کے بعد خوب سمجھ جائیں گے کہ خدا کے وعدے کیسے سچے ہیں۔ لیکن افسوس کہ اسوقت کی سمجھ کچھ کام نہ آئے گی۔

مذہب اسلام نے توریث کا قانون بنانے میں مفصلہ ذیل امور پر لحاظ رکھا ہے۔

۱:۔ ایک کو دوسرے کی کمائی یا دوسرے کے مال میں حق نہیں ہے۔ ہر ایک کو اپنی محنت مزدوری پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ متوفی کے اعزّہ کو محض اس لئے ترکہ دیا جاتا ہے کہ متوفی کے بعد اس کے مال کے تصرف کے لئے کوئی انتظام نہ ہوگا تو جھگڑے پیدا ہوں گے۔

۲:۔ مرنے والے کی دولت اس کے تمام اعزّہ میں جہاں تک ہو سکے متفرق ہو کر تقسیم ہونا چاہیئے کہ وہ تمام لوگ فائدہ اٹھا سکیں جو اس کی حیات میں متمتع ہوتے تھے یا متمتع ہونے کا حق رکھتے تھے۔

۳:۔ عورتوں کو خود کما کھانے کے ذریعے بہت کم ہیں اس لئے ان کے حقوق تخصیص کے ساتھ قرآن میں محکوم ہوئے۔

۴:۔ اس لحاظ سے کہ مردوں پر دوسروں کے نان ونفقہ کا بار ہوتا ہے مردوں کا حصہ عورتوں سے دوچند رکھا گیا ہے۔

۵:۔ شرع میں یہ بہت ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے کہ ایک شخص ضرورت سے بہت زیادہ متمول ہو جائے اور دوسرا بہت زیادہ مفلس ہو کر گزران کرے شرع کے احکام ہر امر میں مساوات چاہتے ہیں اس لئے متوفی کے ترکہ میں بھی بہت سے حصے کر دیئے جاتے ہیں۔

قرآن میں حکم ہے کہ جب کوئی مرے اور ترکہ تقسیم ہونے لگے تو اقتضائے شکر گزاری یہ ہے کہ ورثا کی
مورث اپنا حصہ لیں تو بس اس کے ان تمام اقربا اعزّہ اور پڑوسیوں کو کچھ کچھ دیں جو وقت تقسیم کے موجود
ہوں یہ حکم نہایت تعمیم کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس لئے فرض نہیں ہوا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل
اسلام کے نزدیک مورث کے ترکہ میں حصہ لینے کی نوعیت کیا ہے۔ بعض کمینہ خصلت جو مورث کی دولت
پر اپنے مکسوبہ مال سے زیادہ اپنا حق قائم کر کے اس کے مرنے کے متمنی بیٹھے رہتے ہیں ان کو اسلام نہایت
ہی ناپاک سمجھتا ہے۔

ہندوؤں کا قانون

ہندوؤں میں خاندان مشترکہ ہو تو لڑکیاں یا بیوائیں عموماً ترکہ نہیں پاتیں۔ بیٹے کی موجودگی میں
باپ بالکل محروم رہتے ہیں۔ خاندان مشترکہ میں عورتوں کا حق کچھ بھی نہیں ہوتا اور جب ہوتا ہے تو ایسا
کہ خاندان کے منقسم ہونے کی حالت میں کل کی بیاہی ہوئی بیوی کل پر قبضہ کر لیتی ہے اور ماں باپ منہ تکتے
رہ جاتے ہیں ان کے یہاں بہنیں کسی حالت میں وارث نہیں ہوتیں۔ کھینچ کھانچ کر بھانجوں کو تو برٹش عدالتوں
نے ورثا میں شامل کر دیا ہے لیکن بہنیں ہنوز محروم ہیں۔ جائداد ضبط سرکار ہو جائے گی مگر بہن کو نہ
ملے گی۔ عجیب قانون ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ ہندو مقننوں کو عورتوں سے کیوں اتنی خلش تھی اس
موقع پر مجھے ایک گفتگو یاد آئی۔ میں (مؤلف) ایک روز اپنے ایک ہندو دوست سے گفتگو کر رہا تھا
وہ اپنے یہاں کے مسئلہ توریث کی خوبیاں بیان کر رہے تھے اور میں ان کے نقائص بیان کر رہا تھا کہ اسی اثنا
میں ان کے پیچھے ایک ہندو فقیر (گداگر) آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ خواہ مخواہ اگر
آپ مر جائیں تو آپ کی تمام املاک یہ بابا جی جو پیچھے کھڑے ہیں پا سکتے ہیں لیکن آپ کی بہن نہیں پائے
گی۔ اس پر میرے دوست نے پوچھا کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ میں نے کہا یہ تو بہت صاف مسئلہ ہے ہر
ایک اس سے واقف ہے کہ بہنیں کسی صورت سے وارث نہیں ہوتیں۔ بہن کے لئے مرد بن جانا
دشوار ہے اور جب تک وہ عورت ہے محروم رہے گی۔ لیکن بابا جی ممکن ہے کہ دو جھوٹے گواہ
عدالت میں گزار کر خود کو آپ کا گور بھائی ثابت کر دیں اور جائداد کے مالک بن جائیں خیر اس کا جواب
تو ہمارے دوست سے نہ بن آیا۔ لیکن انھوں نے یہ کہا کہ تم کو یہ عجیب دھن ہے کہ خواہ مخواہ
اپنی شرع کے مسائل کو تمام دنیا کے قوانین پر افضل سمجھتے ہو یہ عیب تمہاری طرح اور بھی چند
مسلمانوں میں پایا گیا ہے۔ آجکل چند ہندو بھی لیسے ہیں جو اپنے مسائل کو تمام عالم پر فوقیت
دیتے ہیں۔ تم ایسے محبان قوم کو مالیخولیا ہو گیا ہے کہ گئے گزرے زمانے کی باتیں اس زمانے

میں پیش کرتے ہو اور موجودہ تہذیب سے مقابلہ کرتے ہو۔ جو باتیں پہلے تھیں ضرور مناسب وقت تھیں لیکن اب زمانہ بدل گیا زمانے کے موافق جو باتیں ہیں اب وہی قابل تقلید ہیں۔ پرانی باتوں پر حاشیہ چڑھانا بالکل بے کار بے سود ہے" میں نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا اس کا خلاصہ بیان کرنا مضمون سے کسی قدر الگ ضرور ہو جاتا ہے لیکن خالی از دلچسپی نہیں ہے۔

میں نے کہا: میں مسلمانوں کے موجودہ قواعد کو ہرگز عمدہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتا اگر میں ایسا کروں تو میری غلطی ہے۔ اور اسی طرح اپنے موجودہ زمانے کی باتوں کو ہنود مناسب ثابت کرنے کی کوشش کریں تو وہ بھی غلطی پر ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ اپنے عروج کے زمانے میں اسلام کے تمام مسائل پراز حکمت تھے تو بے موقع نہیں ہے اور اسی طرح ہنود اگر یہ دکھانا چاہیں کہ اپنی ترقی کے زمانہ میں ہنود میں تمام خوبیاں ہر قسم کی موجود تھیں تو بھی بے موقع نہیں ہے۔ بے شک ہندو کے زمانہ عروج کو گزرے ہوئے اتنا عرصہ ہوا کہ وہ اپنے عروج کی تمام باتیں جان نہیں سکتے اور نہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا حالت ان کے تمدن کی زمانہ عروج میں تھی پھر بھی جہاں تک ان کے علما دریافت کر سکے انھوں نے اچھی طرح ثابت کر دیا کہ زمانہ عروج کے عادات و مراسم زمانہ حال سے بالکل بھی مطابق نہیں ہیں اور جو برائیاں اس وقت ہیں وہ ان کی ترقی کے زمانہ میں ہرگز ہرگز نہ تھیں برخلاف اس کے مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ابھی تین صدی قبل تک تمام عالم پر یہ روشن تھا کہ مسلمانوں کی رفتار، گفتار، عقائد، عبادات، معاملات اور تمدن دوسروں کے لئے قابل تقلید تھے اور دنیا میں کوئی تمدن مسلمانوں کے تمدن کے برابر نہ تھا۔ ابھی زمانے نے کوئی بہت بڑا پلٹا نہیں کھایا ہے وہی لیل و نہار ہیں اور وہی رفتار زمانہ ہے۔ مسلمان اپنی خوبیاں چھوڑ بیٹھے اور تاریکی میں آ گئے ہونہار قوموں نے ان کی خوبیاں اختیار کر لیں اور روشنی میں آ گئیں۔ عربوں نے جو روشنی فرانس سے سرہند تک اور سرحد یمن سے سرحد چین تک ایک دل ہو کر پھیلائی اور بعد ازاں کسی قدر تنزل کے ساتھ لیکن پھر بھی دوسری قوموں سے کہیں بڑھ چڑھ کر مسلمانوں کی مختلف طاقتوں نے اس روشنی کو خلیج بنگالہ تک پورب میں اور سرحد جرمنی اور آسٹریلیا تک مغرب میں وسعت دی اگر اس روشنی کے اسباب کا ہم ذکر کریں تو یہ تحقیقات علمی مالیخولیا کی مد میں داخل ہو گی؟ ہرگز نہیں۔ ہم صرف یہ دکھاتے ہیں کہ ہیرے کا ٹکڑا تین سو برس تک کسی خاکستر میں دبے رہنے سے اپنی اصلی آب و تاب نہیں کھو سکتا۔ ہمارا یہ کہنا بالکل بے تعصبانہ ہے۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح دو نقطوں کے درمیان میں خط مستقیم ایک ہی ہو سکتا ہے اسی طرح دنیا میں ترقی کرنے کی راہ مستقیم جسے راہ خدا کہتے ہیں اصولاً

ایک ہی ہے۔ جس راہ پر ہنود اپنی ترقی کے زمانے میں چلے اسی راہ پر یونانی اور رومی اپنے اچھے دنوں میں چلے۔ مسلمان بھی اپنے زمانہ عروج میں اسی راہ پر تھے اور عیسائی بھی اس زمانے کے اسی راہ پر ہیں بے شک اس وقت کے عیسائی اپنی رفتار میں موجودہ مسلمانوں سے زیادہ تر راہ مستقیم پر ہیں۔ لیکن اس امر کو ہم کیا کوئی ذی عقل بھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ کبھی راہ مستقیم پر مسلمان نہ تھے اور اسی طرح یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہنود کبھی اس راہِ مستقیم پر نہ تھے۔ ہم کوئی نئی بات نہیں کہتے ہیں بلکہ صرف یہ کہتے ہیں کہ ہاں مسلمان بھی اسی راہ مستقیم پر تھے۔ اس پر اگر ہم اتنا اور مستزاد کر دیں کہ راہ مستقیم جب مسلمانوں کے زیر مشق تھی تو زیادہ تر بارونق تھی تو چنداں بے موقع نہ ہو گا۔ ہزار برس تک مسلمانوں کا قرآن تمام کرۂ ارض پر اپنی روشنی پھیلائے ہوئے تھا جسکی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ احکام قرآن پر غیر قومیں بھی انکی خوبیوں کے لحاظ سے مفتون تھیں اور کبھی ان کو یہ خیال نہ ہوتا تھا کہ ان پر کسی قسم کا اعتراض ہو سکتا ہے اب اگر ان پر زمانے کی گردش سے کچھ خاک پڑ گئی ہے اور ہم اس خاک کو جھاڑ کر عوام کے سامنے انکی خوشنما صورت پیش کرتے ہیں تو یہ کوئی انوکھا کام نہیں ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی ہٹ دھرمی ہے۔

یورپ کا قانون

یہ بات صرف اہل اسلام میں ہے کہ یورپ، ایشیا، افریقہ جہاں کہیں وہ ہیں ان کی توریث قرآن کے موافق ہے۔ اگر وہ غیر قوم کی رعایا ہیں جب بھی توریث میں عدالتیں ان کے درمیان انھیں کا قانون جائز رکھتی ہیں۔ اسے برکات اسلام میں شمار کرنا چاہیئے۔ ورنہ یورپ ایسے مہذب ملک کے عیسائیوں کے لئے جتنے ممالک ہیں اتنے ہی قانون ہیں بلکہ ایک ہی ملک میں مختلف جائدادوں کے لئے مختلف قوانین جاری ہیں۔ مثلاً انگلستان میں زمینداریوں کا قانون جدا ہے اور دیگر مال و اسباب اور زرنقد کے لئے جدا ہے وہاں زمینداری میں جائداد اور خطاب ہمیشہ بڑے لڑکے کو ملتا ہے اگر باپ نے دوسری اولاد کے لئے کچھ وصیت کر دی تو خیر ورنہ بڑے لڑکے کی مرضی پر ہے کہ اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ کچھ سلوک کرے یا نہ کرے۔ اسی کے قریب قریب تعلقہ داران اودھ کے لئے بھی گورنمنٹ نے قانون بنا دیا ہے ہندوؤں میں راج بھی بڑے لڑکے کو ملتا ہے لیکن شاید یہ فرق ہے کہ ہندوستان کے راجہ قانوناً مجبور ہیں کہ اپنے بھائی بہنوں کی خوراک اور پوشش کا سامان کر دیں۔ انگلستان کے برعکس اس پابندی سے بھی غالباً آزاد ہیں۔ انگلستان میں زمینداری کا قانون زمانہ جاہلیت کی یادگار ہے کیا معنی کہ جب رومنس انگلستان سے چلے گئے تو برٹینس (قدیم باشندگان انگلستان) نے فاتحیں اینگلو سیکسن کی غلامی میں

آئے جنھوں نے انگلستان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے آپس میں بانٹ لئے اور ان ٹکڑوں کے باشندوں کو زمین کی ملکیت میں کچھ حق نہیں دیا۔ بعد اینگلوسیکسن کے جب نارمن آئے تو انھوں نے بھی یہی طریقہ قائم رکھا اور بجائے اینگلو سیکسن سرداروں کے نارمن سردار مختلف ٹکڑوں کے قابض اور حاکم ہو گئے اسی اثناء میں جب سلطنت مہذب کی گئی تو تمام سردار رکن سلطنت قرار پائے لیکن بادشاہ نے یہ جرأت نہ کی کہ ان سرداروں کے حقوق زمینداری میں کچھ مداخلت کرے اور نہ زمانہ جاہلیت کے اس قاعدے کو کہ ہمیشہ خلف اکبر تنہا قابض رہے وہ مٹا سکے تہذیب پھیلنے پر تو شان حکومت میں فرق آگیا۔ لیکن توریث کا یہ قاعدہ بدستور قائم رہا کہ زمینداری تنہا خلف اکبر کو ملے اگر کچھ ترمیم ہوئی تو اتنی کہ وصیت کا اختیار مورث کو دیا گیا اور تہذیب کے ساتھ اس وصیت کا دستور بھی بڑھتا رہا لیکن وصیت کا موقع نہ ملنے کی حالت میں جو حق تلفی اکثر اولاد کے حق میں ہو سکتی ہے اس کا کوئی تدارک اب تک نہ ہوا برخلاف اس کے مسلمانوں نے حکومت قائم کرتے ہی دل کڑا کر کے امیر و غریب سب کو اصول انصاف کی ایک رسی میں باندھ لیا اور سمجھے کہ انصاف ہی کرنے میں سلطنت کو قوت پہنچے گی اور شخصی تشخصات سے بجائے مدد پہنچنے کے ضعف آئے گا۔ شاہ غسان کی حکایت مشہور ہے کہ وہ عیسائی بادشاہ تھا اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے سامنے وہ ایک بازاری آدمی کے مقابلے میں فریق مقدمہ بنا۔ کچھری اپنی عزت اس معمولی آدمی سے زائد نہ پا کر جب شاہ غسان گھبرایا تو حضرت عمرؓ نے اسے آگاہ کیا کہ اسلام تشخصات کا مٹانے والا اور تمام بنی نوع انسانی کو ایک راہ پر چلانے والا ہے۔

علاوہ زمینداریوں کے اور جائداد کی نسبت انگلستان کا قانون اور نیز یورپ کے دیگر ممالک کے قوانین ہندوؤں کے قوانین سے بدرجہا اچھے ہیں اور ممکن ہے کہ بہت سی باتیں مسلمانوں سے لی گئی ہوں کیونکہ ترکے کا بہت سے حصوں میں تقسیم ہونا اور ایک وقت میں ذکور اور اناث اور چھوٹوں بڑوں کو ملنا مسلمانوں کی طرح ان میں بھی ہے ورنہ یورپ کے ایام جاہلیت میں جسکی لاٹھی اسکی بھینس ترکہ کا مختلف حصوں میں تقسیم ہونا اور مختلف رشتہ داروں کو ملنا زمانہ امن کا یہ مہذب دستور لوٹ کھسوٹ میں کہاں پیدا ہو سکتا تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ رومن لا کی تقلید تمام یورپ میں کی گئی ہے تو پھر اختلاف کا باعث کیا ہے۔ بہرحال رومن لا کا اثر مسلمانوں کی تقلید۔ ملکی رسم و رواج، مقننوں کی رائیں سب ملا کر مختلف حالتیں مختلف مقامات پر پیدا ہو گئیں ہم چند مسائل توریث کا مقابلہ کر کے فرق دکھاتے ہیں۔ اچھے برے کی نسبت ناظرین رائے قائم کریں یورپ میں اولاد ذکور اور اناث

کو برابر حصے ملتے ہیں اور مسلمانوں میں مردوں کو عورتوں سے دوگنا ملتا ہے۔ مسلمانوں میں مردوں کو دوگنا اس لئے نہیں ملتا کہ مرد عورتوں سے زیادہ پیارے ہیں بلکہ اس لئے کہ ان کو عورتوں سے زیادہ احتیاج ہوتی ہے مردوں پر بیویوں کا نان ونفقہ فرض ہوتا ہے اور عورتوں پر اپنے شوہروں کا کھلانا فرض نہیں ہے بلکہ اپنی اولاد کی پرورش کا بار بھی انپر نہیں ہوتا یہ بھی شوہروں ہی کے سر پر ہوتا ہے۔ فرانس میں اقربا کی موجودگی میں شوہر کو کچھ ترکہ نہیں ملتا۔ انگلستان میں سب کا سب شوہروں کو ہی مل جاتا ہے۔ اسلام میں یہ اعتدال رکھا گیا ہے کہ اگر اولاد ہو تو شوہر کو چوتھا اور اولاد نہ ہو تو نصف۔ نصف سے زیادہ نہیں پاتا فرانس میں زوجہ کو بھی اقربا کے ہوتے ہوئے ترکہ نہیں ملا۔ یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرانس میں حقوق زناشوئی اتنے بھی نہیں ہوتے جتنے مسلمانوں میں مدخولہ عورتوں کے ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ مدخولہ عورتوں پر کبھی کبھی منکوحہ کا قیاس ہوتا ہے تو وہ زوجہ بن کر وارث ہوتی ہے۔ انگلستان میں زوجہ تنہا ہو تو اسے نصف ملتا ہے اور باقی بیت المال میں چلا جاتا ہے مسلمانوں کے یہاں زوجہ کے ہوتے ہوئے کبھی بیت المال میں ترکہ نہیں جاتا بیویوں کا حصہ مفروضہ زیادہ سے زیادہ ایک چہارم ہے لیکن دوسرے رشتہ داروں کے نہ ہونے کی حالت میں سب کا سب اسے مل جائے گا۔ انگلستان میں اگر زوجہ اور زوجہ کی اولاد ہو تو زوجہ کو ایک تہائی ملتا ہے اور مسلمانوں میں ایسی حالت میں ایک ثمن ملتا ہے یہ کمی عورتوں کے مدارج گھٹانے والی نہیں ہے۔ بلکہ اور ورثاء کے حقوق کی نگہبانی کرنے والی ہے۔ علاوہ بریں تعداد مہر ایک ایسی چیز ہے جو تقسیم ترکہ پر مقدم ہے اور تعین مہر کا اختیار بیویوں کو اور ان کے اولیاء کو پہلے سے حاصل ہوتا ہے اس لحاظ سے مسلمانوں کا ایک ثمن انگلستان کے ایک ثلث سے تمام جوانب پر نظر کر کے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔

دیگر مختلف قومیں

بعض قومیں دنیا میں ایسی ہیں کہ ان میں مردوں کو وراثت پہنچتی ہی نہیں اس خیال سے کہ مرد خود کما سکتے ہیں متوفی کا سارا ترکہ عورتوں کو دیا جاتا ہے پارسیوں میں لڑکیوں کا حق اتنا مضبوط ہے کہ ان کے مرنے پر ان کے شوہر قائم مقام ہوتے ہیں یعنی داماد اور بیٹے برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ ابھی حال میں بمبئی ہائی کورٹ سے ایک مقدمہ کا فیصلہ ہوا ہے۔ جس میں یہ بحث تھی کہ اگر داماد پہلی بیوی کے غم کو دل سے بھلا کر دوسری شادی کرلے جب بھی وہ پہلی بیوی کے خاندان میں حصہ پا سکتا ہے؟ حکام نے تجویز کیا کہ جب داماد وارثوں کے زمرہ میں شامل ہے تو اس کا رنڈوا رہنا یا نہ رہنا کوئی

فرق نہیں ڈالتا۔ اب ان قوانین کے مقابلہ میں شرعی قانون کا اعتدال ملاحظہ کے قابل ہے۔ کہیں عورتیں کچھ پاتی ہی نہیں اور کہیں مردوں کے برابر پاتی ہیں اور بعض جگہ مردوں کو محروم کر کے سب کا سب پاتی ہیں۔ مسلمانوں کا اعتدال قابل قدر ہے کہ وہ ہر حالت میں پاتی ہیں لیکن مردوں سے نصف اور یہ کمی بیشی جن وجوہات پر مبنی ہے اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اب اس پر بھی بعض مسلمان باوجود دعویٰ مسلمانی کے ہندوؤں کے قانون کی پیروی کرتے ہیں۔ اپنی طمع سے اندھے۔ گونگے اور بہرے ہو رہے ہیں تو وہ "ختم اللہ علیٰ قلوبہم و علیٰ سمعہم و علیٰ ابصارہم غشاوہ" کے مصداق نہیں ہیں تو اور کیا ہیں۔

ہند کے مسلمان

ہند کے جاہل مسلمان توریث کے متعلق ہندوؤں کی پیروی کرتے ہیں۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ بعض لکھے پڑھے مسلمان بھی اس بارہ میں قرآن کو ناقص تصور کرتے ہیں برٹش گورنمنٹ کی عدالتوں کی وجہ سے شرع محمدیؐ کے احکام ان میں بہ جبر نافذ کئے جاتے ہیں ورنہ خود فراموش رعایا کا بس چلتا تو اب تک کبھی کے یہ معدوم ہو گئے ہوتے۔ جن مسلمان خاندانوں میں ہندوؤں کی پیروی اس بارہ میں اچھی سمجھی جاتی ہے انکی تمدنی حالت ہندوؤں سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ اشتراک خاندان اور حق نان ونفقہ یہ دو باتیں تو مسلمانوں میں پیدا ہوتی نہیں اور بلا ان کے متعلق کئے ہوئے ہندوؤں کا قانون وراثت جب مسلمانوں کے گھروں میں نافذ ہوتا ہے تو وہ آدھا تیتر آدھا بٹیر بہت ہی برا ہوتا ہے۔ ہندوؤں کے دیگر عادات اور مراسم کے اعتبار سے ان کے لئے ان کا قانون زائد تکلیف دہ نہیں ہے لیکن مسلمانوں کے لئے تو وہ نہایت ہی مخرب اخلاق ہے۔ مثلاً ایک ساتھ دو لڑکیاں رام کلی اور زبیدہ (ایک ہندو دوسری مسلمان) بیاہی گئیں۔ دونوں ساتھ بیوہ ہوئیں اور بیوہ ہونے کے بعد دونوں بارہ برس تک اپنے میکے میں رہ گئیں رام کلی تو ترکہ شوہری نہیں پاسکتی تھی۔ ہاں زبیدہ پاتی لیکن ہندوؤں کے میل جول سے متاثر ہو کر سسرال والوں نے اسے ترکہ شوہری میں اسے حصہ دینا پسند نہ کیا۔ اب بعد بارہ برس کے دونوں کے میکے والے مفلس ہو گئے اور وہ سسرال چلیں رام کلی ترکہ نہیں پاسکتی تھی لیکن نان ونفقہ پانے کا اس کا ایسا زبردست حق تھا کہ جب تک جیتی رہتی نافذ کرا سکتی تھی۔ انگریزی عدالت موجود ہے سسرال والوں کی کیا مجال کہ عذر کرتے۔ یہ گئی اور نہایت پیار سے اس کی آؤ بھگت ہوئی۔ زبیدہ جو پہنچی تو سسرال والوں نے ڈیوڑھی تک اترنے نہیں دی وہ جانتے تھے کہ شوہری ترکہ میں ایک ربع اس کا تھا جو تمادیٔ ایام کی نذر ہو گیا

اب اسے گھر میں ٹھہرا کر کون بکھیڑا پیدا کرے۔ کل کو ہمارے قبضہ کی نوعیت پر بحث ہوگی تو اس کا
ڈولی سے اترنا غضب ڈھائے گا۔ دس گواہ محلہ کے گزر جائیں گے کہ برابر آمدورفت لگی رہتی تھی
اور سسرال والوں کا قبضہ موافقانہ تھا۔ ہندؤں میں لڑکیاں ترکہ نہیں پاتیں لیکن ترکہ کے عوض میں
شادی سے قبل اور شادی کے بعد ان کو۔ انکے شوہروں کو اور انکی اولاد کو رسم ورواج کے پیرائے
میں مختلف مواقع پر بہت کچھ ملا کرتا ہے۔ مسلمانوں کی لڑکیاں ان چیزوں سے محروم رہتی ہیں۔ اپنے
دستور کے مطابق اور پھر آئندہ چل کر ترکہ پدری سے محروم رہتی ہیں۔ ہندوؤں کے دستور کے مطابق
اور اس طرح اپنی ہندو بہنوں سے زائد گھاٹے میں رہتی ہیں۔ ہندوؤں میں عورتوں کو ترکہ پدری کا خیال
بھی نہیں ہوتا اور اس لئے جو کچھ بطور خیرات اور حسنات کے پاتی ہیں بے انتہا شکر گزار رہتی ہیں اور خوش
رہتی ہیں اور اس طرح ان کی تمدنی حالت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ مسلمان لڑکیاں احکام شرع کے مطابق
امیدوار رہتی ہیں اور بھائیوں کے ساتھ خود کو برابر کا پٹی دار جانتی ہیں اور جب ملنے کے وقت ٹکا سا
جواب پاتی ہیں تو کدورت پیدا ہوتی ہے اور لطف صحبت میں فرق آتا ہے اور یوں بہت کچھ بے
لطفیوں کا سامان پیدا ہوتا ہے اس حالت تذبذب سے تو یہ بہتر ہے کہ مسلمان ایک دل ہو کر گورنمنٹ
سے قانون پاس کروالیں کہ شاستر کے مطابق انکے حقوق کا تصفیہ ہوا کرے۔ ذرا ہیٹی ہوگی مگر
ہمیشہ کے لئے یہ خلش تو رفع ہو جائے گی۔ ایسی ہی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے یہ ظاہر
ہوتا ہے کہ جن مسلمانوں کے گھروں میں دیکھا دیکھی دھرم شاستر کے توریثی مسائل جاری ہیں وہ
بہت ہی بدقسمت ہیں۔

غرض کہ مختلف قوم کے مختلف قوانین ہیں۔ ہر ایک بجائے خود اپنے قانون کو سب سے
اچھا سمجھتا ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ شرعی توریث کے قاعدے دنیا کے تمام گزشتہ اور موجودہ
قوانین سے اچھے ہیں۔ ممکن ہے کہ غیر مذہب والے بھی دلائل اور نتائج پر غور کر کے یہ کہیں
کہ مسلمانوں کا قانون وراثت بے شک افضل القوانین ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لئے ایسا عقیدہ
رکھنا تو گویا ان کے دین وایمان کا جزو ہے۔ بہت سے مسلمان ایسے ہیں کہ جب خود غرضی متعلق ہوئی
اور طمع سے آنکھوں پر اندھیری چھائی تو پھر ان کے نزدیک اچھے اور برے کا فرق نہیں رہتا طبیعتیں
الجھتی ہیں اور دل میں سوچتے ہیں کہ ہندوؤں کے قانون ہمارے قانون سے کہیں اچھے ہیں
اور یہ نہیں سمجھتے کہ اتنا خیال گزرتے ہی اسلام نے خیرباد کہہ دیا۔ جب شرعی احکام برے ٹھہرے تو اس کا
بنانے والا الحکیم مطلق نہ رہا۔ اب یا اللہ کے حکیم مطلق ہونے کا انکار کیا جائے یا قرآن کے کلام ربانی

ہونے سے انکار کیا جائے۔ یہی دو صورتیں ہیں اور دونوں صورتوں میں دائرہ اسلام سے آدمی خارج ہو جاتا ہے اس قسم کے وسوسے زیادہ تر اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب فریق مقابل کمزور ہو۔ مثلاً کوئی متمول شخص گیارہ لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑ کر فوت ہو جائے تو لڑکوں میں باہم کوئی مناقشہ نہ ہوگا۔ ایک دوسرے سے دبتا رہے گا۔ لیکن وہ بیچاری لڑکی سب کی آنکھوں میں کھٹکے گی اگر یہ اپنا حصہ چھوڑ بھی دے تو لڑکوں کے حصہ میں کوئی افزونی نہ ہوگی۔ محض جزو قلیل کل ترکہ کا تیئسواں حصہ اس بے چاری کو ملنے والا ہے۔ لڑکی ہے کہ بھائیوں پر فدا ہو رہی ہے جان نثار کئے دیتی ہے اور بھائی ہیں کہ اپنے متوفی والدین کو روز صبح اٹھ کر صلواتیں سناتے ہیں کہ پیدا ہوتے ہی کمبختوں نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہوتا تو آج اس بلا سے ہم کو چھٹکارا ہوتا فریق مقابل کی کمزوری بھی بسا اوقات جرائم کی جرأت کراتی ہے۔ بہنوں کا باشرم ہونا۔ پردہ نشین ہونا فطرتاً با انس اور کمزور ہونا بھائیوں کو بے رحم غاصب اور کمینہ خصلت بنا دیتا ہے۔ بھائی بھائی کا حق مارنے کی جرأت نہ کرے گا لیکن بہنوں کے مقابلہ میں نیک سے نیک بھائی بھی بعض اوقات بڑے سے بڑا دشمن ہو جاتا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ زیادہ تر یہ خرابیاں ان خاندانوں میں دیکھی جاتی ہیں جو شریف کہلاتے ہیں۔ امارت ریاست اور شرافت قدیم زمانے سے ان کے گھرانے میں چلی آتی ہے۔ بہنوں کے حق میں بے رحم زیادہ تر ایسے ہی خاندان میں ملیں گے۔ کوئی پندرہ برس کے قریب ہوئے کہ ایک بڑے ذی علم اور اعلیٰ خاندان کے ایک شخص پر بہن نے پدری حق کا دعویٰ رجوع کیا تھا مدعا علیہ نے مدعیہ کے بہن ہونے سے صاف انکار کر دیا گواہوں کی کیا کمی تھی۔ فریقین کی طرف سے گواہ پیش ہوئے۔ مدعیہ اور اس کے گواہوں کا یہ بیان تھا کہ فریقین ایک باپ کی اولاد ہیں اور ایک ہی ماں کے بطن سے پیدا ہوئے اور ایک ہی ماں کی گود میں پلے۔ مدعا علیہ اور اس کے گواہوں کا یہ اظہار تھا کہ مدعیہ کی ماں بھیک مانگتی ہوئی مدعی علیہ کے باپ کے گھر آکر نوکر ہوئی اور اس وقت یہ لڑکی گود میں تھی اس قدر تعلق بھی مدعا علیہ بیان نہ کرتا لیکن دقت یہ تھی کہ اکثر خطوط میں وہ مدعیہ کو بہن لکھ چکا تھا۔

مدعیہ کے وکیل نے مدعا علیہ کے اظہار کے وقت مدعی علیہ سے پوچھا کہ اگر مدعیہ کا شوہر مدعیہ کو طلاق دیدے تو تم اس سے عقد کر سکتے ہو؟ یہ سوال پوچھنا تھا کہ مدعا علیہ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ تمام جسم سے عرق جاری ہو گیا۔ عدالت نے یہ کہکر روک دیا کہ اس آبرو باختہ کی کہاں تک بے عزتی کرو گے۔ ہم مقدمہ سمجھ چکے ہیں۔ غرض کہ مرافعہ اولیٰ سے مدعیہ کا دعویٰ ڈگری ہوا اور جب تک اپیل سے فیصلہ صادر نہیں ہوا مدعا علیہ نے شرم سے اپنی صورت دوستوں

کو نہیں دکھائی۔عدالت رنگ ہا دارد۔ عدالت اپیل کے حاکم نے دعویٰ مدعیہ کا ڈس مس کر دیا۔ بظاہر محض اس خیال سے کہ اگر مدعیہ بہن ہوتی تو ہرگز انکار نہ کیا جاتا۔ حاکم عدالت نے شاید اپنی طبیعت پر قیاس کیا۔ زمانہ کے رنگ کا لحاظ نہیں کیا۔

ایسی صورتیں تو بہت پیدا ہوتی ہیں کہ بہن نے دعویٰ کیا اور بھائی نے بہن کے وجود سے انکار کر دیا۔ اب ہم ان جان خراش صورتوں کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کراتے ہیں جب یتیم لڑکیاں اپنے بھائیوں کے قبضہ میں آجاتی ہیں۔ بعض کمبخت بھائی ایسے ہیں جو جائداد نکل جانے کے خوف سے ان بے چاری بہنوں کا بیاہ نہیں کرتے اور کبھی ارادہ بھی کرتے ہیں تو اس شرط سے کہ نکاح سے قبل لڑکی کل جائداد کا ہبہ نامہ بھائی کے نام لکھدے۔ لڑکیاں پردہ نشین سہی لیکن کہاں تک نادان رہیں گی۔ آخر وہ بھائیوں کی خواہشوں سے واقف ہو کر اشارۃً کنایتہً اپنی رضامندی ظاہر کر ہی دیتی ہیں اور دل میں سمجھتی ہیں کہ اگر اس پدری دولت کی بدولت تمام عمر کنوارا بیٹھا رہنا ہے تو اس تمول سے افلاس اچھا ہے۔ کتنا پر درد یہ نظارہ ہے کہ ایک کنواری پردہ نشین لڑکی اپنی تمام پدری جائداد سے دست برداری کا وثیقہ لکھ کر اس کے بدلے میں اپنے نکاح کی نسبت بھائی کی رضامندی مول لیتی ہے۔ بعض بعض صورتیں ایسی بھی دیکھنے میں آئی ہیں کہ بہنوں کی شادی کم حیثیت لوگوں سے محض اس لئے کر دی گئی کہ بہن کو ناجنس کی صحبت کے غم سے اتنی فرصت نہ ملے کہ وہ اپنے حقوق طلب کرنے کی کوشش میں مصروف ہو یا یہ کہ بہن کے شوہر کو کبھی برابری کا دعویٰ نہ ہو سکے اور نہ بہن اس شرم سے کبھی سر اٹھا سکے۔ معاذ اللہ۔

اے بسا ابلیس کادم روئے ہست

غرض کہ وہ حالت ناگفتہ بہ ہوتی ہے جبکہ بے ماں باپ کی لڑکیاں کبھی کبھی اپنے بے حیا اور طماع بھائیوں کی ولایت میں آجاتی ہیں۔

ایک صورت بھائیوں کے اختیار میں یہ بھی ہے کہ والدین سے جیتے جی کوئی ایسی تحریر کرالیں جس سے آئندہ زمانے میں بہنوں کو نقصان پہنچے۔ مگر اس صورت میں اکثر ناکامی ہوتی ہے ایک تو شرعاً والدین کو یہ اختیار نہیں دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ترکے کی نسبت کوئی انتظام قرآن کے خلاف کریں اور دوسرے یہ کہ والدین سے یہ کب ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بچوں میں امتیاز کریں ان کے نزدیک دونوں آنکھیں برابر ہونی چاہئیں لیکن زمانہ انحطاط ہے جو کچھ ہو جائے تعجب نہیں ہے۔ بعض ایسے بودے دل کے بھی ہوتے ہیں جن کو اولاد ذکور کی گفتگو مرعوب کر لیتی ہے یا خود انکی تنگی خیال رہبر بن جاتی ہے اور وہ بے تکلف اپنی اولاد اناث

کی حق تلفی کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہیں اور یہ بھی تو اس قبیل سے ہیں جو ایام جاہلیت میں لڑکیوں کو قتل کر ڈالتے تھے یا تنگی کی حالت میں لڑکیوں کو ذبح کر ڈالتے تھے۔ ان لوگوں سے سوسائٹی کو احتراز لازم ہے اگر ان کا بس چلتا اور انگریزی گورنمنٹ کا خوف نہ ہوتا تو یہ کبھی اپنی لڑکی کا گلا پیدا ہوتے ہی گھونٹ دیتے۔ پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دینے اور اپنے ترکے سے آئندہ کے لئے محروم کرنے میں اخلاقاً کوئی بہت بڑا فرق نہیں ہے۔ صرف اتنا ہے کہ پہلی صورت میں یہیں سزا مل جائے گی اور دوسری صورت میں خدا کے یہاں باز پرس ہوگی۔ زائد توضیح کے لئے "ہبہ" کی فصل ۳۶ دیکھئے۔

بھائیو! اگر تم اپنے اور بھائیوں کا حق مارو تو تم صرف غاصب اور گنہگار ٹھہرو گے دائرہ اسلام سے خارج نہ ہو گے۔ لیکن جب تم بہنوں کے حق مارنے کی فکر کرتے ہو تو اللہ تمہارے قلوب کو دیکھتا ہے کہ تمہیں قرآن کے احکام سے نفرت ہے اس وقت تمہارے دل کی نوعیت ہی دوسری ہے جس قرآن کو تم چومتے چاٹتے ہو۔ طوطے کی طرح روز پڑھتے ہو۔ طاق پر اسے سب سے اوپر رکھتے ہو اور ادھر پشت تک نہیں کرتے اسی قرآن کو تم اس بارے میں بدترین کتاب سمجھتے ہو اور اسی کی بدولت تم خدا کو دل میں برا کہتے ہو۔ اب تم ہی بتاؤ تمہارے اسلام کی نوعیت کیا ہے؟

فصل نمبر ۳۴

وصیت

ایک مسلمان کے مرنے پر اس کی جائداد کس کے قبضہ میں جائے گی ؟ ہر وقت اس کا جواب معلوم ہو سکتا ہے۔ نہ خاندان کی تقسیم کچھ فرق ڈالتی ہے اور نہ وارثوں کا دور یا نزدیک رہنا کچھ فرق ڈالتا ہے قرآن میں ہر ایک کے حصے صاف طور پر معیّن ہیں۔

بعض صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ اپنی خدمت اطاعت اور احسانات سے اغیار اعزّہ سے بڑھ جاتے ہیں۔ اس لئے شرع نے یہ اجازت دی ہے اور یہ اجازت نہایت عدل والصاف پر مبنی ہے کہ مورث اپنی ایک ثلث جائداد کو اغیار کے حق میں وصیت کر سکتا ہے لیکن بقیہ دو ثلث جائداد کی نسبت اس کو کسی قسم کا حق نہیں دیا گیا ہے۔ نہ وہ کسی وارث کو محروم کر سکتا ہے اور نہ وارثوں کے حق میں خلاف شرع تقسیم کی ہدایت کر سکتا ہے۔ وہ مجاز نہیں ہے کہ ورثار کے حق میں کوئی وصیت کرے۔ جس خدا نے مرنے والوں کو متمول بنا رکھا تھا اسی خدا نے یہ بھی ٹھہرا رکھا ہے کہ مرنے کے بعد دولت کس کی طرف منتقل ہوگی۔

سب سے عمدہ وصیت نامہ قرآن ہے اور سب سے عمدہ تحریر قرآن کی آیتیں ہیں جو کوئی مسلمان ہو کر قرآن سے عمدہ وثیقہ اپنی اولاد کے حق میں لکھنا چاہے وہ گمراہ ہے۔ دنیا میں رسوائی اور خدا کے ہاں ذلت اور پھر یہ بھی نہیں کہ تمام دقتوں کے بعد کسی طرح کامیابی بھی حاصل ہو عدالتوں میں کسی طرح توریث اور وصیت کے متعلق کوئی امر خلاف شرع جائز نہیں رکھا جا سکتا ہے جو شخص اپنے ترکے کی نسبت یہ چاہے کہ قرآن کے خلاف اسکی تقسیم ہو اس کے لئے صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو وہ اپنا مذہب بدل ڈالے یا جائداد کو ایسی جگہ چھپا کر رکھدے کہ بجز معہود ذہنی اشخاص کے

دوسرے پتہ نہ پا سکیں۔ جو لوگ دوسروں کے حق تلف کرنے کے لئے جا بجا رائیں پوچھتے ہیں اور قرآن اور حدیث کے صریح احکام کے ہوتے ہوئے تاویلیں ڈھونڈھتے ہیں اور دوسروں کے حق مارنے کی تدبیریں سوچتے ہیں وہ گمراہ ہیں۔

ہدایہ کی عبارت ذیل میں درج کی جاتی ہے جس سے حدیث نبوی اور مسئلہ فقہ دونوں معلوم ہو جائیں گے۔

"ولا تجوز لوارثہ لقولہ علیہ السلام ان اللہ تعالےٰ اعطی کل ذی حق حقہ الالا وصیتہ للوارث ولانہ نیاذی البعض بایثار البعض ففی تجویزہ قطیعۃ الرحم ولانہ حیف بالحدیث الذی رونیا"

ترجمہ "اگر کوئی شخص وارثوں کے حق میں وصیت کرے تو جائز نہیں ہے کیونکہ پیغمبر خدا کا صریح قول ہے کہ خدا نے تمام وارثوں کے حصے معین کر دیئے ہیں۔ معلوم رہے کہ وارثوں کے حق میں وصیت درست نہیں ہے۔ ایک کو ترجیح دیجائے گی تو دوسرے کو خواہ مخواہ اذیت پہنچے گی اور ایسا کرنے سے قطع رحم لازم آتا ہے اور علاوہ بریں حدیث متذکرہ بالا کی رو سے ایسا کرنا ظلم ہے۔"

عام طور پر جہلا میں یہ مشہور ہے کہ مرنے والے کو وصیت کر کے مرنا چاہیئے اپنے بعد جھگڑا لگا رکھنا نہ چاہیئے یہ خیال جہاں تک ورثاء کے حق میں وصیت کرنے کی بابت ہے اور زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے۔ بالکل غلط اور سراسر گمراہی ہے۔ جب توریث کی آیتیں اتریں تو اب مسلمانوں کے لئے ان سے اچھی وصیتوں کا خیال کرنا ذلالت ہے ہاں دوسروں کا قرض باقی ہو تو اس کی ادائیگی کے بابت ضرور وصیت کر دینا چاہیئے۔ یا اگر غیروں کا بار احسان ہو ....

...... یا دوسروں سے کچھ وعدہ کیا ہو یا دوستوں کے حقوق خدمت ہوں تو احسان کا بدلہ احسان ہے۔ مرنے کے قبل ان کے لئے وصیت کرنا مناسب ہے لیکن وصیت ایک ثلث سے زیادہ نہ ہو۔ اگر زیادہ ہوگی تو احکام شرع اسے باطل کر دیں گے۔ قرآن میں سورہ بقر کے بائیسویں رکوع میں وصیت کا تذکرہ ہے لیکن تمام مفسرین اس آیت کی نسبت متفق البیان ہیں کہ یہ آیت آیات توریث کے قبل اتری تھی اور جب آیات توریث میں تمام ورثاء کے حصے بیان کر دیئے ہیں جیسا کہ کتاب ہذا کی فصل ۳۳ توریث میں مذکور ہے تو پھر اس آیت کے مطابق وصیت کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ وصیت کئے بغیر بھی وہ بات حاصل ہو جائے گی جسکی بابت وصیت کرنے

کا حکم کیا گیا تھا۔ عربوں کی حالت یہ تھی کہ مثل ہندوؤں کے اولاد ذکور تمام ترکہ پر قابض ہو جاتی تھی۔ متوفی کے والدین کو کچھ نہیں دیتے تھے اور نہ دیگر رشتہ داران قریبی کو کچھ دیتے تھے اسوقت یہ حکم ہوا۔

"مسلمانو! تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ تم میں سے کسی کے سامنے موت آموجود ہو اور وہ کچھ مال چھوڑنے والا ہو تو ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں کے حق میں واجبی طور پر وصیت کرے خدا سے ڈرنے والوں پر ان کے رشتہ داروں کا بھی حق ہے۔ پھر جو کوئی وصیت سن کر اسے بدل دے گا تو اس کا گناہ انھیں بدلنے والوں پر ہو گا بے شک اللہ سنتا اور جانتا ہے۔ سورۂ بقر رکوع ۲۲[1]۔

اس کے بعد جب ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں کے بھی حصے مقرر کر دیئے گئے تو اس آیت کے مطابق عملی طور پر وصیت کرنے کی ضرورت نہ رہی بلکہ محض اصول سمجھانے کے لئے یہ آیت قائم رہ گئی وہ یہ کہ علاوہ اولاد ذکور کے ماں باپ اور دیگر رشتہ داران کے حقوق کی حفاظت کی طرف شرع محمدی میں بہت کچھ خیال کیا گیا ہے۔

---

[1] کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین فمن بدلہ بعد ما سمعہ فانما اثمہ علی الذین یبدلونہ ان اللہ سمیع علیم۔

فصل نمبر ۳۵

بیع

ایک چیز کا دوسری کے بدلے میں دینا بیع کہلاتا ہے اور اگر کوئی بدلہ دوسرے کی جانب سے نہ ہو تو اس کو ہبہ کہتے ہیں۔ بیع کے مسائل شرع محمدی میں بہت طوالت سے بیان کئے گئے ہیں۔ بہت سی صورتیں ایسی ہیں کہ فریقین چاہیں کہ بیع عمل میں آئے لیکن شرع بیع کے جواز کو روکتی ہے شرع میں یہ محکوم ہے کہ گھر کے فروخت کرنے سے کیا کیا چیزیں فروخت ہو جاتی ہیں۔ جاگرڈ بیچنا کہاں تک جائز ہے بے دیکھے ہوئے چیزوں کی خرید و فروخت کن شرائط سے روا ہے۔ بیع میں عیب ظاہر ہونے کی صورت میں کیا کرنا چاہیئے۔ بیع ناجائز کے متعلق واپسی زر ثمن کے احکام۔ اقالہ بیع یعنی بیع کے واپس کرنے کا بیان۔ تولیہ کا بیان یعنی خریدنے کے ساتھ ہی دام کے دام بیچ ڈالنا۔ یا نفع پر بیچنا جسکو مرابحت کہتے ہیں۔ مال منقول و غیر منقول کی تفصیل۔ ربوا یعنی سود خواری کی ممانعت ان حقوق کا بیان جو داخل بیع ہوتے ہیں بیع اگر کسی غیر کی ظاہر ہو تو کیا ہو۔ سلم کا بیان یعنی پہلے قیمت کا دیدینا اور پھر کچھ دنوں کے بعد مال کا لینا وغیرہ وغیرہ بہت سی باتیں شرع محمدی میں بیع کے متعلق بیان کی گئی ہیں جن کے بالتفصیل بیان کرنے میں چنداں دلچسپی نہیں ہے اتنا جاننا کافی ہے کہ فقہی ضرورتوں سے احکام بیع بہت طوالت سے بیان کئے گئے ہیں اور مسلمان فقیہوں کی نہایت نکتہ چینی اور انصاف پسندی مسائل بیع پڑھنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے عالمگیر حکومت کے زمانے میں حقوق طے کرتے وقت کیسی باریک نظر سے معاملات دیکھے جاتے تھے ان تمام مسائل پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفصلہ ذیل امور پر لحاظ رکھا جاتا تھا۔

۱:- ایک انسان دوسرے انسان سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔

۲:- کوئی معاملہ قمار بازی کے طور پر نہ کیا جائے۔

۳:- مال عرب بیش عرب رہے۔

۴:- جہاں تک ممکن ہو معاملہ صاف رہے اور سادہ رہے۔ آئندہ کے لئے نزاعوں اور جھگڑوں کے دروازے نہ کھلیں اور نہ پیچدار معاملات کی بنیاد پڑے۔

آیات قرآنی

"مسلمانو! جب تم ایک میعاد مقرر تک ادھار کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو یا تمہارے درمیان میں کوئی دوسرا لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دیا کرے۔ لکھنے والے کو انکار نہ کرنا چاہیئے۔ جیسا اللہ نے سکھایا ہے لکھدیا کرے اور مقروض کو چاہیئے کہ لکھاتا جائے اور اللہ سے کہ وہی اس کا کارساز ہے ڈرتا رہے اور کچھ کمی بیشی نہ کرے۔ اگر مقروض کم عقل ہو۔ معذور ہو یا خود نہ لکھا سکتا ہو تو اس کا ولی انصاف سے لکھا دے۔ اپنے لوگوں میں سے اطمینان کے دو مرد گواہ کر لو اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد دو عورتیں۔ کیونکہ ایک بھول جائے گی تو دوسری یاد دلا دے گی۔ گواہ جب بلائے جائیں تو وہ انکار نہ کریں۔ میعادی معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کے لکھ لینے میں کاہلی نہ کرو۔ خدا کے نزدیک یہ بہت ہی منصفانہ کارروائی ہے اور گواہی کے لئے بھی یہی طریقہ بہت ٹھیک ہے اور زیادہ تر قرین قیاس ہے کہ تم اس طرح آئندہ شک و شبہ نہ کرو گے۔ ہاں سودا دم نقد ہو جسکو تم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے میں کچھ گناہ نہیں۔ خرید و فروخت کرو جب بھی گواہ کر لیا کرو۔ کاتب کو اور گواہ کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اگر ایسا ہوگا تو یہ تمہاری شرارت ہے۔ اللہ سے ڈرو اللہ تم کو معاملے کی صفائی سکھاتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ اگر تم سفر میں ہو اور تم کو کوئی لکھنے والا نہ ملے تو رہن بالقبض کر لو۔ جب تم سے ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہے تو جس کا اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہیئے کہ قرض دینے والے کی امانت ادا کرے اور خدا سے جو اس کا کارساز ہے ڈرے۔ شہادت کو نہ چھپاؤ جو چھپاتا ہے وہ دل کا کھوٹا ہے۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو سب معلوم ہے۔ سورہ بقر رکوع ۳۹[۱]۔

---

[۱] یاایہا الذین آمنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوہ ولیکتب بینکم کاتب بالعدل ولا یاب کاتب ان یکتب کما علمہ اللہ فلیکتب ولیملل الذی علیہ الحق ولیتق اللہ ربہ ولا یبخس منہ (باقی صفحہ ۳۶ پر)

لین دین خرید و فروخت تمام معاملات کی نسبت کتنے مختصر طور پر سب باتیں اصول کے طور پر بیان کردی گئی ہیں۔ یعنی جب ایک دوسرے سے لین دین کرے تو خود لکھ لے یا دوسرے سے ٹھیک ٹھیک لکھوا لے۔ لکھنے والے کو چاہیئے کہ جیسا اسے لکھنا آتا ہے حتی الوسع ٹھیک ٹھیک لکھ دے اور دوسرے سے لکھوانے کی حالت میں مقروض کو چاہیئے کہ وہ ٹھیک ٹھیک لکھوائے مقروض غیر مکلف ہو تو اس کے اولیا یہی کام کریں۔ . . . . . معاملات کے وقت دو گواہ ٹھہرا لینا بھی محکوم ہے عورتوں کا حافظہ کمزور ہے اس لئے اس بارہ میں وہ دو ایک مرد کے برابر ہیں میعادی معاملات جتنے ہوں اور اس لئے آئندہ انکی بحث پیدا ہونے والی ہو تو وہ چھوٹی ہو یا بڑی لکھنا ضروری ہے۔ خدا کے نزدیک یہی طریقہ یادداشت کا ٹھیک ہے اور گواہ مقرر کرنا بھی بہت مناسب ہے اور اس طرح امید ہے کہ آئندہ شک و شبہ پیدا نہ ہوگا۔ ہاں درم نقد سودا ہو ایک ہاتھ سے دینا اور دوسرے ہاتھ سے لینا ہو تو تحریر کی ضرورت نہیں ہے۔ خرید و فروخت کرتے وقت بھی گواہ کر لو۔ گواہ کو یا کاتب کو حیران نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ان کے ذریعہ سے مدد ملتی ہے۔ یہ سب طریقے جو بتائے گئے ہیں ان سے معاملہ میں صفائی پیدا ہوتی ہے۔ سفر میں اگر لکھنے والا نہ ملے تو جلدی میں قرض دینے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جسکو نقد دیا اس کی چیز رہن رکھ لی۔ لیکن رہن سے رہن سودی مراد نہیں ہے۔ جب اس طرح ایک دوسرے پر اعتبار کر کے قرض دیتا ہے تو چاہیئے کہ بدمعاملگی سے اس میں فرق نہ ڈالا جائے۔ خدا سے ڈرنا چاہیئے وہ کارساز ہے۔ نیت درست رہے گی تو وہ ادائے قرض کی صورت بھی نکال دے گا۔ تمام معاملات میں شہادت کی تاکید ہے تو شاہدوں کو بھی چاہیئے کہ وہ شہادت نہ چھپائیں۔ دل کے کھوٹے شہادت چھپاتے ہیں۔ اللہ سب کے دل سے آگاہ ہے۔ فقہا نے ان آیات سے بہت سے مسائل نکالے ہیں۔ جہاں جہاں شاہدوں کی تعداد قرآن میں مذکور نہیں وہاں کم سے کم دو شاہد شرعاً ضرور ہوتے ہیں۔

(پچھلے صفحہ کا باقی) شیئاً فان کان الذی علیہ الحق سفیہاً او ضعیفاً او لا یستطیع ان یمل ہو فلیملل ولیہ بالعدل واستشہدوا شہیدین من رجالکم فان لم یکونا رجلین فرجل وامراتن ممن ترضون من الشہداء ان تضل احدہما فتذکر احدہما الاخری ولا یاب الشہداء اذا ما دعوا ولا تسئموا ان تکتبوہ صغیراً او کبیراً الی اجلہ ذالکم اقسط عند اللہ واقوم للشہادۃ وادنی الا ترتابوا الا ان تکون تجارۃ حاضرۃ تدیرونہا بینکم فلیس علیکم جناح الا تکتبوہا واشہدوا اذا تبایعتم ولا یضار کاتب ولا شہید وان تفعلوا فانہ فسوق بکم واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ واللہ بکل شیء علیم وان کنتم علی سفر ولم تجدوا کاتباً فرہٰن مقبوضۃ فان امن بعضکم بعضاً فلیؤد الذی اؤتمن امانتہ ولیتق اللہ ربہ ولا تکتموا الشہادۃ ومن یکتمہا فانہ اثم قلبہ واللہ بما تعملون علیم۔

اب بھی انگریزی عدالتوں میں بہت سی دستاویزیں ہیں جو بغیر دو گواہوں کے کالعدم سمجھی جاتی ہیں۔ بہت سے معاملات ایسے ہیں کہ وہ اگر تحریر نہ کئے جائیں اور گواہوں کی گواہی نہ ہو تو آجکل کی انگریزی عدالتیں انھیں کالعدم سمجھتی ہیں۔ قرآن میں گواہ لینا اور لکھ لینا نہایت افضل سمجھا گیا ہے اور قرآن میں اس کی بابت سخت تاکید ہے۔ جیسا کہ مفصلہ بالا آیتوں سے ثابت ہے۔ لیکن فقہا نے ان آیات کو محض ترغیب دلانے والی سمجھا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر قاضی کے سامنے معاہدہ کرنے والا یہ بیان کرے کہ میں نے معاہدہ کیا اور معاہدہ سے فائدہ بھی اٹھایا لیکن معاہدہ تحریری نہیں ہوا اور دو گواہوں کی گواہیاں نہیں ہوئیں اس لئے وہ مجھ پر واجب التعمیل نہیں ہے تو اس پر سے معاہدہ کی تعمیل اٹھا دی جائے۔

خرید و فروخت میں عربوں کی تہذیب

اگر قومی تمدن کسی مضبوط اور پکے اصول پر مبنی نہیں ہے تو دولت کے ساتھ اسراف لازم ہے جب دولت بڑھتی ہے تو ساتھ ہی اسراف بھی بڑھتا ہے۔ معلمان اخلاق نے اسراف سے بہت کچھ ڈرایا ہے۔ لوگ دھیان نہیں کرتے اور نہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسراف دولت کی بنیاد کا گرانے والا ہے جس طرح دولت حاصل ہونے کے بعد دولت کی حرارت یعنی نخوت کا پیدا ہونا لازم ہے ویسے ہی یہ بھی لازمی ہے کہ کچھ دنوں کے بعد دولت کی قدر دلوں سے جاتی رہتی ہے اور اسی کا دوسرا نام اسراف ہے دولت کی قدر نہ کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ نخوت پیدا نہ ہو لیکن اس طرح کی ناقدری الشاذ کالمعدوم کے حکم میں ہے۔

آجکل انگلستان میں دولت کی کثرت ہے اور اس لئے وہاں کے باشندے اسراف کی بلا میں گرفتار ہیں۔ وہاں اسراف کی صورتیں مختلف ہیں۔ ہم صرف اس صورت سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو خرید و فروخت سے متعلق ہے۔ وہاں کے اہل دول جب کسی دکان میں چیزیں خریدنے جاتے ہیں تو نقد قیمت ادا کرنا شان کے خلاف جانتے ہیں۔ اور لیڈیاں تو قیمت بھی دریافت نہیں کرتیں۔ گئیں اور پسند کی چیزیں اٹھا لائیں دوکاندار نے جو چاہی قیمت لکھ لی بے ایمان تاجروں کا تو ذکر نہیں دیانتدار تاجر بھی ایسے سودے میں سود۔ ہرجہ۔ حیرانی اور محنت بھی کچھ دل میں جوڑ کر ڈیوڑھا دونا دام رکھ لیتے ہیں۔ امراء کی دیکھا دیکھی غرباء بھی وہی چال چلے۔ نقد قیمت دے کر سودا لینا گویا مسافر مجہول الاسم ہونے کی دلیل ہے۔ یہی طریقہ ہندوستان میں بھی جاری ہو لیا ہے

جو ہندوستانی دوکانیں انگریزی دکانوں کے طریقہ پر کھلی ہوئی ہیں ان میں بھی یہی راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں جن میں بمشکل دس بیس روپیہ کھا پی کر بچتا ہے ان میں بھی ضرور ہے کہ دس پندرہ روپے ماہوار کا محرر بل بنانے کے لئے مقرر رہے پانچ پانچ روپے کے دو زائد پیادے تقاضے کے لئے متعور ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ طریقہ نہایت ہی ناپسندیدہ ہے۔ روپیہ کا مال خواہ مخواہ ڈیڑھ دو روپے کو اس طرح لینا پڑتا ہے۔ علاوہ گرانی کے خریدار کے لئے ایک یہ دقت ہے کہ اکھٹا دینا اس کو اکھرتا ہے اور لمبا اوقات وہ بآسانی نہیں دے سکتا اور بہ آسانی نہ وصول ہونے کی دقتیں وہ خوب سمجھ سکتے ہیں جو صابن کی بٹی۔ لیمپ۔ نب بٹن۔ برش وغیرہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی بدولت نوکری پیشہ انگریزوں کا اثاثہ روز کچہریوں میں نیلام ہوتے دیکھتے ہیں اس طور سے صرف خریداروں ہی کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ دوکانداروں کا بھی ہوتا ہے۔ گو وہ غیر ممکن الوصول رقموں کا پرتہ دوسرے خریداروں پر بچا لیتے ہوں گے لیکن جب شروع سے نادہندہی نادہندہیں تو ان بیچاروں کا بھی ناک میں دم ہو جاتا ہے۔ یوں ظاہری بھڑک دیکھ لیجئے لیکن حساب دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ درخت کا اندرونی حصہ بالکل سڑ کر کھوکھل ہو گیا ہے۔ ذرا تیز ہوا چلی اور گرا۔ بڑے بڑے شہروں میں انسالونسی کورٹ میں جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکانداروں پر کیا گزرتی ہے۔ زمانے کے دستور نے ہند کی تجارت کا لطف کم کر دیا ہے اور یہ ناپسندیدہ طریقہ جانبین کے لئے مضر ہے۔ اگر نقد قیمت دے کر خریداری کی جائے تو مال سستا ملے اور آئندہ دقتیں نہ ہوں۔ دکاندار خریداروں کو دعائیں دیں اور خریداروں کو کبھی دقتوں کا سامنا نہ ہو۔ عرب اپنے زمانہ عروج میں ملک التجار تھے۔ نہ قرض لیتے تھے اور نہ قرض پر معاملہ کرتے تھے۔ "مال عرب پیش عرب" مثل مشہور ہے اب بھی بعض بلاد اسلام میں پرانے طریقے پر مسلمان تجارت کرتے ہیں اور نہایت آزادی اور بے فکری سے مال بیچتے ہیں۔ خود بھی خوش رہتے ہیں اور خریداروں کو بھی خوش رکھتے ہیں۔

فصل نمبر ۳۶

ہبہ

صدقہ اور ہدیہ کا بیان اور ان دونوں کا فرق کتاب ہذا میں مفصل بیان ہو چکا ہے۔ یہاں ان دونوں کے متعلق احکام فقہ بیان کئے جاتے ہیں۔ صدقہ اور ہدیہ کے لئے فقہ میں ایک ہی لفظ "ہبہ" استعمال کیا گیا ہے۔

ہبہ ہمیشہ بغیر عوض کے ہوتا ہے اور جو بعوض ہوتا ہے وہ بیع کے حکم میں ہے ہبہ نہیں ہے۔ ہبہ مثل اور معاملات کے کبھی دھوکے سے بھی ہو جاتا ہے۔ بہلا کر۔ دباؤ ڈال کر بیجا خوشامد کر کے اور کبھی فریب دے کر لوگ اپنا کام نکال لیتے ہیں۔ اگر ان صورتوں میں ہبہ کرنے والے کو ہبہ کے واپس لینے کا اختیار نہ دیا جائے تو نہایت بے انصافی ہوگی۔ ہر ملک کے قوانین میں یہ امر مذکور ہے کہ فریب۔ دغا۔ غلط بیانی۔ دباؤ۔ داب ناجائز سے یا بدحواسی سے کوئی معاملہ کیا جائے تو کالعدم ہے اور اس لئے ہبہ بھی ان صورتوں میں خواہ مخواہ کالعدم ہو جاتا ہے۔

شرع محمدی نے اور معاملات کے ساتھ ہبہ کے احکام اس بارہ میں شامل نہیں کئے ہیں۔ بلکہ اس کے لئے جدا احکام ہی مبنی بر عدل و انصاف بنا دیئے ہیں۔ یعنی یہ محکوم کر دیا ہے کہ ہبہ مکمل نہیں ہوتا جب تک واہب اپنا قبضہ اٹھا نہ لے اور موہوب لہ ہبہ کو قبول کر کے شے موہوبہ پر اپنا قبضہ نہ کر لے۔ اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے تو صرف وہ صورت جبکہ زوجہ یا اولاد نابالغ کے حق میں ہبہ کیا جائے۔ ہبہ کے قابل شرع محمدی میں وہی چیز سمجھی گئی ہے جس پر قبضہ ہو سکتا ہو اور واہب اس پر وقت ہبہ کے قابض ہو۔ واہب کے حق میں اس قدر سہولتیں اور رعایتیں

محکوم ہوئیں۔ پھر بھی حنفیوں نے (جنکا قانون اکثر بلاد اسلام میں نافذ ہے) خیال کیا کہ ممکن ہے کہ واہبوں کے حق میں اس طرح پورا انصاف نہ ہو اور اس لئے حکم صریح نافذ کیا کہ ہبہ کے ہر طور پر نافذ ہو جانے کے بعد واہب کو اختیار ہے کہ شے موہوبہ واپس کرے۔

۱:۔ بشرطیکہ شے موہوبہ ضائع نہ ہوئی ہو۔

۲:۔ موہوب لہ کی ملکیت سے خارج نہ ہوئی ہو۔

۳:۔ واہب مر نہ گیا ہو۔

۴:۔ شے موہوبہ میں ترقی نہ ہوئی ہو۔

۵:۔ شے موہوبہ میں تبدیلی واقع نہ ہوئی ہو۔

۶:۔ واہب اور موہوب لہ میں رشتہ زناشوئی نہ ہو۔

۷:۔ واہب اور موہوب لہ میں رشتہ داری بدرجہ محرمات نہ ہو۔

۸:۔ ہبہ کے عوض میں کچھ نہ لیا گیا ہو۔

غرض کہ جب ایک شے مفت دیجاتی ہے تو لینے والے پر فرض ہے کہ وہ دینے والے کا ہمیشہ شکر گزار رہے اور اسکی نیت بدلنے نہ دے اور خوب سمجھ بوجھ کر اطمینان کی حالت میں لے تاکہ معاملہ کی صفائی میں ذرا بھی شبہ نہ رہے۔ شرع محمدی کا یہ مسئلہ بھی قابل قدر ہے کہ مرض الموت میں اگر کوئی شے ہبہ کی جائے تو صرف ایک تہائی اس کی موہوب لہ کو پہنچتی ہے ایسا ہبہ وصیت ہو جاتا ہے۔

اب دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ورثا کے حق میں ہبہ درست ہے یا نہیں۔ اگر ہبہ سے اولاد کے سوا دوسرے ورثا کو محروم کرنا ہے تو ہبہ کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن اگر ہبہ سے مقصود ہو ایک اولاد کو دینا یا زیادہ دینا اور دوسری اولاد کو کم دینا یا نہ دینا تو ایسی ہبہ کے جواز میں اختلاف ہے فقہا جواز کا فتویٰ دیتے ہیں لیکن اخلاقاً بہت برا بتاتے ہیں اور لبعض محدثین ایسی ہبہ کو شروع سے کالعدم قرار دیتے ہیں۔

اس اختلاف کی وجہ قول رسولؐ کے معنی سمجھنے پر مبنی ہے جسکا بہ تصریح بیان کرنا ہم مسلمانوں کی ہدایت کے لئے مناسب سمجھتے ہیں۔

نعمان اجلہ انصار رسول اللہؐ سے تھے ان کے باپ بشیر نے ان کو ایک غلام دینا چاہا۔ چونکہ پیغمبر خدا نے اصول اسلام اپنی صحبت سے سب کے دلوں میں جما دیا تھا اس لئے اس ہبہ کے

جواز میں ان سب کو شبہ ہوا اور انھوں نے چاہا کہ پیغمبرؐ کے پاس چل کر ان کو گواہ کریں اور اس طرح دریافت کر لیں کہ اس ہبہ میں کوئی نقصان تو نہیں ہے۔ پیغمبرؐ نے سنکر ہبہ کو ناجائز بتایا اور نعمان کو جو غلام بشیر سے ملا تھا وہ پھر بشیر کے پاس واپس آ گیا۔

"نعمان کے باپ نے رسول اللہ صلعم کے پاس آکر کہا کہ میں نے اپنا ایک غلام نعمان کو دیا ہے۔ رسول اللہ صلعم نے کہا کیا اپنے تمام لڑکوں کو تم نے ایسا ہی غلام دیا ہے نعمان کے باپ نے جواب دیا کہ نہیں۔ پیغمبرؐ خدا نے کہا کہ واپس لے لو اور ایک روایت میں کہا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد میں عدل کرو۔" (صحیح البخاری المجلد الثالث کتاب الہبہ[1])

حدیثیں بالالفاظ اور بہ معنی دونوں طرح منقول ہوئی ہیں۔ راویوں کا حافظہ اکثر لفظوں کو بھول کر معنی کا خیال رکھتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اصل راوی نے کبھی بالفاظ روایت کی اور کبھی بہ معنی۔ مختلف وقتوں میں مختلف سننے والوں کے ذریعے سے اختلاف شروع ہوا۔ جب حدیثوں کی تدوین کا وقت آیا تو جمیع اقوال نظر بہ احتیاط قلمبند کر لئے گئے۔ غرض کہ پیغمبرؐ خدا کے منہ سے جو الفاظ نکلے ان کو مختلف کتب احادیث میں یوں لکھا ہے۔

"رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد میں عدل کرو۔" (تمام کتب احادیث میں[2])

"رسول اللہ صلعم نے کہا ہبہ واپس لے لو۔" (صحیح بخاری اور صحیح مسلم[3])

"رسول اللہ صلعم نے کہا مجھے گواہ نہ کرو میں جور و ستم کا گواہ نہ بنوں گا۔" (مسلم[4])

"اس امر میں میرے سوا کسی دوسرے کو گواہ کرو۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ میں حق ہی پر گواہ ہو سکتا ہوں۔ (جامع صحیح مسلم[5] و سنن نسائی)

---

[1] ان اباہ اتی بہ الی رسول اللہ صلعم فقال انی نحلت ابنی ہذا غلاما کان لی فقال رسول اللہ اکل ولدک نحلتہ مثل ہذا فقال لا قال فارجعہ و فی روایۃ قال رسول اللہ صلعم اتقوا اللہ اعدلوا فی اولادکم۔

[2] فقال رسول اللہ صلعم اتقوا اللہ لو فی اولادکم۔

[3] فاردوہ یا فارجعہ۔

[4] فلا تشہدنی فانی لا اشہد علی جور

[5] فاشہد علی ہذا غیری۔ لیس یصلح ہذا فانی لا اشہد الا علی حق۔

"ہبہ میں تم اپنی اولاد کو برابر سمجھو جیسا کہ تم چاہتے ہو کہ وہ سب تمہاری اطاعت برابر کریں" (صحیح مسلم[1])

"تمہاری اولاد کا یہ حق ہے کہ تم ان کے ساتھ عدل کرو۔ مجھ کو تم ظلم پر گواہ نہ کرو۔ تم چاہتے ہو کہ وہ تمہاری اطاعت برابر کریں؟ بشیر نے کہا ہاں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم عدل نہ کروگے تو وہ اطاعت نہ کریں گے" (احمد[2])

"میرے سوا کسی اور کو گواہ کر لو" (سنن نسائی[3])

"اپنا گواہ ہونا آنحضرتؐ مکروہ سمجھے" (سنن نسائی[4])

"کیا اپنی اولاد میں تم نے برابری کا خیال نہ رکھا" (سنن نسائی[5])

"اولاد میں مساوات کا خیال رکھو" (ابن حبان[6])

"واپس لے لے" (موطا امام مالک[7])

"میں گواہی نہیں دیتا لیکن حق پر" عبدالرزاق[8])

"لڑکوں کا یہ حق ہے کہ تم ان کے ساتھ عدل کرو جیسا کہ تم کو یہ حق ہے کہ وہ تمہاری اطاعت کریں" (سنن ابی داؤد[9])

ان تمام اقوال مختلفہ پر لحاظ کر کے جو نتیجہ علمائے متقدمین نے نکالا ہے وہ یہ ہے۔

---

[1] اعدلوا بین اولادکم فی النحل کما تحبون ان یعدلوا بینکم فی البر۔

[2] ان لبنیک علیک من الحق ان تعدل بینہم فلا تشہدنی علی جور اتحب ان یکونوا الیک فی البر سواء قال بلی قال فلا اذ۔

[3] فاشہد علی ہذا غیری۔

[4] فکرہ ان یشہد۔

[5] الا سویت بینہم۔

[6] سوّ بینہم۔

[7] فارتجعہ

[8] لا اشہد الا علی حق۔

[9] ان لہم علیک من الحق ان تعدل بینہم کما ان لک من الحق ان یبروک۔

سب کا ایک ہی مفہوم ہے۔ لیعنی مساوات کا حکم اور اس کے خلاف کرنے کی ممانعت اور تصریح اس امر کی کہ ہبہ میں مساوات نہ ہو تو وہ جائز نہیں ہے اور ظلم ہے۔ اور اور اس کے بطلان کا حکم فحوائے عبارت سے عیاں ہے" (حافظ ابن حجر[1])

"اگر ان دلیلوں سے منع نہیں سمجھا گیا تو پھر معلوم نہیں کونسی دلیل سے منع سمجھا جائے گا" شوکانی رح[2])

"اس سے مساوات اور عدل کا وجوب نکلتا ہے۔ کیونکہ یہ امر کی جگہ پر آیا ہے اور امر مقتضی ہے وجوب کا" (امیر حسین در شفاء الادام[3])

"ان سب سے یہی نکلتا ہے کہ اولاد میں سوائے تسویتہ کے یعنی انکے حقوق ساوی رکھنے کے سوا اور کچھ جائز نہیں ہے" (امام احمد بن سلیمان در اصول الاحکام[4])

امام احمد بن سلیمان نے ایک قول ابن عباس کا نقل کیا ہے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ "دینے میں اپنی اولاد کے ساتھ مساوات کا خیال رکھو۔ اگر ایک کو ترجیح دینے کا اختیار ہوتا تو میں لڑکیوں کو ترجیح دیتا"[5]

یہیں یہ لکھنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جتنی باتیں اوپر بیان کی گئیں وہ سب فقہا کے نزدیک مسلم ہیں۔ جو کچھ ان میں اختلاف ہے نتیجہ نکالنے میں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ تسویہ (یعنی سب اولاد کو برابر دینا) مناسب ہے اور اس کا ترک کرنے والا گنہگار ہے۔ اور بعض کا قول ہے۔ کہ تارک گنہگار تو ہے ہی نفس ہبہ بھی کالعدم ہے۔ تسویہ مطابق حصص شرعی کے ہونا چاہیئے۔ یا باعتبار تعداد موہوب لہ کے ہونا چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں مساوات برحسب مواریث ہونا چاہیئے یا بحسب روس۔

---

[1] کل ترجع الی معنی واحد قد اشتمل علی الامر بالتسویۃ والنہی عن المخالفۃ والتصریح لعدم صحۃ الھبۃ التی لا تسویۃ فیہا وانما من الجور والتنبیہ علی البطلان بالفحوی۔

[2] اذا لم تفد ہذہ الادلۃ المنع فلا ندری ای دلیل یفیدہ۔

[3] دل ذلک علی وجوب المساوات والعدل لانہ ورد مورد الامر والامر یقتضی الوجوب۔

[4] دل علی انہ لا یجوز الا التسویۃ بین الاولاد۔

[5] سووا بین اولادکم فی العطیۃ فلو کنت مفضلا فضلت النبات۔

امام احمد سے کہتے ہیں۔

"مساوات کی ضرورت میں علماء کا اختلاف نہیں ہے۔ جو کچھ اختلاف ہے کیفیت مساوات میں ہے۔ ابو یوسفؒ کا مذہب ہے کہ باپ بخشش میں پسر اور دختر کو برابر رکھے۔ اور محمدؒ نے کہا۔ نہیں۔ واجب ہے کہ علی حسب المواریث ان میں مساوات کی جائے۔ یعنی پسر کو دو حصے دیئے جائیں اور دختر کو ایک حصہ اور وجہ اس کی یہ بیان کی کہ اگر باپ مر جائے اور کچھ نہ دے جائے تو اس کے ورثا اسی طریقہ سے ترکہ پائیں گے"[1]

ان تمام اقوال پر نظر کر کے محدثین کی رائے یہ ہے کہ ہبہ میں مساوات واجب ہے۔ اور جس ہبہ میں بغیر کسی وجہ شرعی کے مساوات بین الاولاد نہ ہو وہ باطل اور کالعدم ہے ایسا ہبہ کرنے والا گنہگار اور سخت گنہگار تو تمام علمائے اسلام کے نزدیک ہے۔ لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ وہ باطل ہے یا نہیں۔ بعض علماء کے نزدیک وہ ضرور باطل ہے اور قاضی کے حکم سے کالعدم ہو سکتا ہے۔

جن وجوہ سے یہ رائے قائم کی گئی ہے انکی تصریح ذیل میں ہے۔

جب آنحضرتؐ نے فرمایا "یہ صحیح نہیں ہے" (لیس تصح ہذا) تو پھر عدم جواز ہبہ غیر مساوی میں کیا شبہ رہ گیا۔

"میں سوائے حق کے دوسرے کسی امر کا گواہ نہیں ہو سکتا" (لا اشہد الا علی الحق) جس کا مطلب صریح یہ ہوا کہ یہ حق نہیں ہے۔ حق ہوتا تو میں گواہ ہوتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو حق نہیں ہے باطل ہے۔

"جور پر مجھ کو گواہ نہ کرو" (لاتشہدنی علی جور) جور کے باطل ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہے۔

"لڑکوں کا تجھ پر یہ حق ہے کہ تو ان میں عدل کرے" (ان لبنیک علیک من الحق ان تعدل بینہم) جب عدل لڑکوں کا حق ہوا تو باپ پر واجب ہوا۔ اور باپ کا جو فعل حق اور وجوب کے

---

[1] ولا خلاف فی ہذا بین العلماء وانما اختلفوا فی کیفیۃ التسویۃ فذہب ابو یوسف الا انہ لیساری بین الانثی والذکر فی العطیۃ وقال محمد یجب ان یسوی بینہم علی حسب المواریث للذکر مثل حظ الانثیین ووجہ انہ لومات ولم یعطلا ستحقوا المال علی ہذا السبیل

خلاف ہو گا وہ باطل ہو گا۔

"واپس لے لو" (فارجعہ) اگر ہبہ غلام کا بحرومی دوسرے لڑکوں کے جائز ہوتا تو آنحضرتؐ ہبہ کے واپس لینے کا حکم نہ دیتے۔ ہبہ شرعاً باطل تھا۔ جب ہی اس کی واپسی کا حکم دیا۔

"اللہ سے ڈرو اور اپنے لڑکوں میں عدل کرو" (اتقوا اللہ واعدلوا بین اولادکم) اتقا کے ساتھ یہاں عدل کو عطف کیا ہے۔ یعنی اللہ سے ڈرنا جس طرح واجب ہے اسی طرح لڑکوں میں عدل کرنا واجب ہے۔ احکام شرعیہ سے فقہی مسائل اخذ کرنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اس قول میں کتنا زور ہے۔

حدیث میں نعمان کا بیان بھی منقول ہے۔ اس نے کہا "پھر میرے باپ نے وہ وہ صدقہ واپس لے لیا" (فرجع ابی فی تلک الصدقۃ) اصطلاح شرع میں ہبہ۔ نحل اور عطیہ اور کبھی کبھی صدقہ ایک ہی شے ہے۔ بشیر انصار سے تھے۔ عربی زبان خوب سمجھتے تھے۔ انھوں نے ہبہ کو ناجائز سمجھ کر غلام واپس لے لیا۔

سالف سے ایک قول منقول ہے کہ آنحضرتؐ نے دو مرتبہ کہا کہ "اپنی اولاد میں عدل کرو" (اعدلوا فی اولادکم) اصول میں یہ بات مان لی گئی ہے کہ "کسی شے کا حکم دینا اسکی کی ضد کا منع کرنا ہے اور کسی شے کی ممانعت ہو نہیں سکتی جب تک وہ فاسد نہ ہو" (الامر بالشئی نہی عن ضدہ والنہی عن الشئی لیستلزم الفساد المرادف للبطلان)۔ فاسد اور باطل ایک ہی معنی میں ہیں۔

"اس پر میرے سوا دوسرے کو گواہ کرو" (اشہد علیہ غیری) بس یہی قول ہے جسکی بنا پر یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ ہبہ باطل کالعدم ہوتا تو آنحضرتؐ یہ نہ کہتے کہ دوسرے کو گواہ کرو۔ اول تو یہ کہ قول ضعیف ہے۔ یہی قول کیوں مرجح سمجھا جائے اور اگر بالفرض آنحضرتؐ نے ایسا کہا تو اس سے جواز ہبہ تو پیدا نہیں ہوتا۔ ممانعت، تخویف۔ تحذیر اور تہدید کا مضمون البتہ پیدا ہوتا ہے۔

محمد ابن منصور جامع میں کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے جو کہا کہ "میرے سوا کسی دوسرے کو گواہ کرو۔ اس سے دوسرے کو گواہ کرنے کا حکم نہیں نکلتا۔ بلکہ اس سے محض تہدید علی سبیل الانکار مقصود ہے" جس طرح اللہ تعالےٰ قرآن میں کہتا ہے۔ جو چاہو تم کہو۔ سچ ہے خدا کفار سے کہتا ہے کہ تم جو چاہو کرو اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ خدا نے کفر کو جائز رکھا ہے۔

اور اس کے کرنے کا حکم دیا ہے۔

"اپنی اولاد میں مساوات رکھو" (ساووا بین اولادکم فی العطیہ) اس سے حکم پیدا ہے۔
"ایسی ہبہ میں صلاحیت شرعیہ نہیں ہے" (فان ہذا لایصلح) جس میں شرعی صلاحیت نہیں وہ باطل ہے۔

"تجھکو تو بھلا معلوم ہوگا کہ اولاد تیری اطاعت میں مساوی ہوں" (الیسرک ان یکونوا فی البر سواءً) اس سے مقصود آنحضرتؐ کا یہ تھا کہ اولاد میں تفضیل کرنا سبب انکے عقوق یعنی نافرمانی کا ہوگا۔ عقوق اکبر کبائر ہے اور اکبر کبائر کا جو باعث ہو وہ ضرور ابطل باطلات اور احرم محرمات ہوگا۔

"میں فضیلت دیتا تو لڑکیوں کو فضیلت دیتا" (لو کنت مفضلا لفضلت البنات) اور عربی قاعدے سے اس کا مفہوم یہ ہوا۔

میں کسی کو ترجیح نہیں دیتا اس لئے لڑکیوں کو ترجیح نہیں دے سکتا" (لکنی لا افضل احداً فلا افضل البنات) اس سے تفضیل کی نفی اور بطلان کی دلیل صریح واضح ہے۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ جو رائے میں نے ظاہر کی ہے وہ میری رائے ہے۔ نعمان بن بشیر کی حدیث سے اور شرع محمدی کے اعتدال اور اصول پر نظر کر کے بہت سے اکابر نے یہی رائے ظاہر کی ہے کہ اولاد میں ہبہ کے وقت مساوات کا خیال رکھنا واجب ہے اور جس ہبہ میں مساوات بین الاولاد نہ ہو وہ کالعدم اور باطل ہے۔

میں یہاں پر علامہ محمد ابن اسمٰعیل امیر یمانی کی کتاب سبل السلام فی شرح بلوغ المرام مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی ۱۳۰۷ھ کا صفحہ ۸۴ کا ترجمہ نقل کرتا ہوں۔

"باب ہبہ[1]۔ حدیث اول نعمان بن بشیر سے روایت ہے۔ اس کا باپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں نے اپنے اس بیٹے (نعمان) کو اپنا یہ غلام دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ اپنی تمام اولاد کو تم نے یوں ہی دیا ہے بشیر نے کہا نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔ ہبہ واپس لے لو۔ اور ایک روایت میں نعمان کا بیان ہے کہ میرا باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا کہ آنحضرتؐ کو اس ہبہ پر گواہ کرے۔ آنحضرتؐ نے پوچھا ایسا ہی ہبہ

---

[1] باب الہبۃ۔ الحدیث الاول۔ عن النعمٰن ابن بشیر ان اباہ اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال انی نحلت (باقی ۴۷ پر)

تمام اولاد کے حق میں کیا ہے - میرے باپ نے کہا نہیں - آنحضرتؐ نے فرمایا - اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے حق میں عدل کرو - پھر میرا باپ واپس آیا اور وہ ہبہ پھیر لیا۔"

اس پر سب کا اتفاق ہے اور مسلم کی ایک روایت ہے کہ :-

آنحضرتؐ نے فرمایا "میرے سوا کسی اور کو گواہ کرو اور پھر فرمایا تمکو اچھا معلوم ہوگا کہ سب اولاد بدرجہ مساوی اطاعت کرے - بشیر نے کہا - ہاں - آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم عدل نہ کروگے تو وہ اطاعت بھی نہ کرے گی "

یہ اصل حدیث کی عبارت ہوئی - اس پر علامہ یمانی رحمۃ اللہ تعالیٰ شرح لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہبہ کرنے میں تمام اولاد کو مساوی درجہ میں رکھنا واجب ہے اور بخاری نے بھی ایسی ہی صراحت کی ہے - احمد اور اسحاق وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے اور یہ بھی پیدا ہے کہ جس ہبہ میں مساوات بین الاولاد نہ ہو وہ باطل ہے - الفاظ حدیث دیکھو - آنحضرتؐ کا حکم دینا کہ ہبہ واپس لے لو اور پھر فرمانا کہ اللہ سے ڈرو - اولاد کے درمیان عدل

انی ہذا غلاماً کان لی فقال رسول اللہ صلی علیہ وسلم اکل ولدک نحلتہ مثل ہذا فقال لا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فارجعہ وفی لفظ فانطلق ابی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لیشہدہ علی صدقتی فقال افعلت ہذا بولدک کلہم قال لا قال فاتقوا اللہ واعدلوا بین اولادکم فرجع ابی فرد تلک الصدقۃ متفق علیہ وفی روایۃ المسلم قال فاشہد علی ہذا غیری ثم قال الیرک ان یکونوا لک فی البر سوار قال بلی قال فلا اذن الحدیث دلیل علی وجوب المساواۃ بین الاولاد فی الہبۃ وقد صرح بہ البخاری وہو قول احمد واسحٰق و آخرین وانہا باطلۃ مع عدم المساواۃ وہو الذی یفیدہ الفاظ الحدیث من امرہ صلی اللہ علیہ وسلم بارجاعہ فیلہ اتقوا اللہ وقولہ اعدلوا بین اولادکم وقولہ فلا اذن وقولہ لااشہد علی جور واختلف فی کیفیۃ التسویۃ فقبل بان تکون عطیۃ الذکر والانثیٰ سوار وہو ظاہر قولہ فی بعض الفاظ عند النسائی الا سویت بینہم وعند ابن حبان سودا بینہم والحدیث ابن عباس سودا بین اولادکم فی العطیۃ فلو کنت مفضلا احد الفضلت النسا اخرجہ سعید بن منصور والبیہقی باسناد حسن وقبل التسویۃ ان یجعل للذکر مثل حظ الانثیین علی حسب التوریث وذہب الجمہور الی انہا لایجب التسویۃ بل تندب واطالوا فی الاعتذار من الحدیث وذکر فی الشرح عشرۃ اعذار کلہا غیر ناہضۃ وقد کتبنا فی ذلک رسالۃ جواب سوال واضحنا فیہا قوۃ القول بوجوب التسویۃ وان الہبۃ مع عدمہا باطلۃ

کرو۔ آپ کا فرمانا۔ تو وہ اطاعت بھی نہ کریں گے۔ آپ کا ارشاد کہ میں ظلم پر گواہ نہیں ہوتا ان سب سے یہی پیدا ہے۔ ہاں مساوات کی صورت میں البتہ اختلاف ہے۔ بعضوں نے کہا کہ مرد اور عورت کو برابر دینا چاہیئے۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ صریح یہی معنی رکھتے ہیں۔ مثلاً نسائی کے نزدیک عبارت یہ ہے "کیا تو نے اولاد میں مساوات نہیں رکھی" ابن حبان کے نزدیک آنحضرتؐ کا قول یہ ہے "اولاد میں مساوات رکھو" ابن عباس کی حدیث یوں مشہور ہے کہ "اپنی اولاد میں تسویہ (برابری) رکھو۔ اگر کسی کو میں فضیلت دیتا تو عورتوں کو فضیلت دیتا" سعید بن منصور اور بیہقی نے باسناد حسن یہ نقل کیا ہے۔ اور بعضوں کی رائے ہے کہ تسویہ یوں ہونا چاہیئے کہ مردوں کو حالت ہبہ میں دو عورتوں کے برابر دیا جائے جیساکہ توریث کی حالت میں حصہ ملتا ہے اور بہت سے لوگوں کی یہ رائے بھی ہے کہ تسویہ واجب نہیں ہے بہتر ہے حدیث میں انھوں نے تاویلیں کی ہیں اور دس حجتیں لکھی ہیں۔ جن میں ایک بھی معقول نہیں ہے۔ میں نے اس باب میں ایک رسالہ بطور سوال وجواب کے لکھا ہے اور خوب توضیح سے ثابت کیا ہے کہ وجوب تسویہ کی رائے قوی تر ہے اور جس ہبہ میں تسویہ نہ ہو وہ باطل ہے"

یہ بھی واضح رہے کہ دیگر بلاد اسلام میں ہبہ بین الاولاد میں غیر مساوات محبت کے کم وبیش ہونے کی وجہ سے ہوگی اور علماء نے اسی خیال سے اس کو غیر ممدوح یا باطل ٹھہرایا ہوگا۔ ہندوستانی مسلمان جو اپنی لڑکیوں سے محبت رکھتے ہیں لڑکوں سے ناخوش رہتے ہیں اور پھر یہ چاہتے ہیں کہ لڑکے ان کا ترکہ پائیں اور لڑکیاں نہ پائیں۔ وہ عورتوں کے حقوق کو جو قرآن میں مقرر ہیں خلاف عقل سمجھتے ہیں اور اس طرح خدا کے کلام کو خلاف حکمت جانتے ہیں اور خدا کو حکیم مطلق نہیں سمجھتے اور اس طرح ان کو ضد ہے کہ ان کے خاندان میں وراثت قرآن مجید کے مطابق جاری نہ ہو۔ اگر یہ صورت ان علما کے سامنے پیش ہوتی تو وہ ہبہ کے باطل ٹھہرانے پر اکتفا نہ کرتے بلکہ واہب کے مرتد (دین اسلام سے پھرنے والا) ہو جانے کا بھی فتویٰ سناتے۔

شرع محمدی جس اصول پر مبنی ہے اس کا مقتضا بھی یہی ہے کہ ایسی ہبہ میں مساوات واجب ہو جن گھروں میں باپ اپنی اولاد کے ساتھ مساوات کا خیال نہیں رکھتا وہاں اولاد بھی باپ کی اطاعت دل سے نہیں کرتی۔ علماء نے لکھا ہے کہ "پھر یہ ترتیب منزل کی خرابی کا باعث ہوگا" میں کہتا ہوں کہ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بھائیوں میں اور بھائی بہنوں میں اور انکی اولادیں

ہمیشہ کے لئے باہم ایک دوسرے سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ اس سے قومی نفاق کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور پھر نہایت خراب اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کی حالت بلکہ اچھی ہے جہاں لڑکیاں جانتی ہیں کہ وہ شاستر اً محروم ہیں۔ لیکن مسلمانوں میں جب یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ باپ کے مرنے پر لڑکیاں ضرور ترکہ پائیں گی۔ باپ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وصیت کے ذریعہ سے ان کو محروم کرے تو لڑکیاں ایک حق اپنا پیدا سمجھتی ہیں۔ اب اگر باپ کو اجازت دی جائے کہ وہ دوسرے ورثا کے حق میں ہبہ کر کے اپنی لڑکی کو محروم کرے تو اس سے خواہ مخواہ لڑکی کو شکوہ کا موقع ہوگا۔ امید ہی پیدا ہو جانے سے تو شکوہ کا موقع ہوتا ہے۔ شکوہ اکثر نفرت اور عداوت کا باعث ہوتا ہے۔ باپ کو وصیت سے روک کر یوں ہبہ کی اجازت دینا گویا اس کو جھوٹی کارروائی کرنے کی اجازت دینا ہے۔ اور یہ اور بھی برا ہے۔ غیر مساوی ہبہ کے عدم جواز کا حکم نہ ہوتا جب بھی یہ قیاس ہونا چاہیئے تھا کہ ہبہ غیر مساوی مصالح شرعی کے خلاف ہونے کی وجہ سے باطل ہے۔ لیکن یہاں تو صریح حدیث نبویؐ موجود ہے نہ اس میں تاویل کی گنجائش ہے اور نہ کچھ بھی پس و پیش کا موقع ہے۔

ہندوؤں کا یہ قانون ہے کہ باپ اپنے بیٹوں کی مرضی کے بغیر کسی کو خاندانی جائداد نہیں دے سکتا اگر دے تو ایسا دینا کالعدم ہے۔ یہ مسئلہ شاستر کا انگریزی عدالتوں میں بہت زیادہ بارونق کر دیا گیا ہے۔ اب عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ باپ کے حقوق محدود ہیں۔ اس درجہ باپ کو محدود حالت میں رکھنا مسلمانوں کے اصول شرعی میں کسی طرح مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا لیکن ایک اولاد کو بہ محرومی دوسری اولاد کے کچھ دینا بہت ہی برا ہے جیسا اوپر بیان کیا گیا۔ اور عقل بھی کہتی ہے کہ یہ ممانعت نہایت ہی عدل اور انصاف پر مبنی ہے۔ ہم اپنی اس تحریر میں قوم کے دو مجتہد مسٹر جسٹس امیر علی اور مسٹر جسٹس بدالدین طیّب جی قاضیان وقت کو توجہ دلاتے ہیں کہ اگر ان کے نزدیک محدثین کی رائیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں صحیح ہیں تو وہ کیوں اس امر کی کوشش نہ کریں کہ اس مسئلہ شرع کا نفاذ ہو اور باپ کے اختیارات اس بارہ میں محدود کئے جائیں بالخصوص ایسی حالت میں کہ عورتوں کے حقوق کی طرف سے مسلمان چشم پوشی کرتے جاتے ہیں اور ایسا ہبہ جس کا مقصد اولاد اناث کی محرومی ہے زیادہ تر رواج پکڑتا جا رہا ہے مصلحان قوم کو قوم کی حالت درست کرنا چاہیئے اور قرآن اور حدیث کے مطابق اصلاح کی صورت سوچنا چاہیئے قرآن و حدیث میں صرف اصول بیان کئے گئے ہیں ان سے ضرورت کے وقت مسائل اخذ کرنے کا کام مجتہدوں اور قاضیوں کا ہے۔ ججوں کو بھی قانون بنانے کا اختیار دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں جہاں تمام عدالتیں محض عدالت انصاف ہیں ججوں کے اختیارات اور بھی وسیع رکھے گئے ہیں۔ جس زمانے میں صرف اولاد

گی نافرمانی محرومی ارث کا سبب ہو سکتی ہے۔ باپ کے حقوق میں لغمان ابن بشیر کی حدیث کی وجہ سے دست اندازی کرنا فقہا ضروری نہیں سمجھے لیکن اب کہ حقوق نساء پر حملے ہوتے ہیں اور شرع محمدی کے مسائل سے غلط طور پر ورثائے جائز کو نقصان پہنچانے کے خیالات پیدا ہوتے ہیں فقہا کو وہ حدیث نظرانداز نہ کرنا چاہیئے۔ جس طرح گورنمنٹ دخترکشی بند کرنے کی نسبت اور رسم ستی مٹانے کی بابت احکام جاری کرنا اپنا فرض سمجھی اسی طرح قاضیان ومفتیان وقت لغمان ابن بشیر کی حدیث کے مطابق اس وقت فتویٰ دینا ناگزیر سمجھیں تو کہیں سے شرعی قباحت نظر نہیں آتی۔

فصل نمبر ۳۷

وقف بکار خیر

وقف کو زیادہ تر ملکی اور اخلاقی معاملات سے تعلق ہے اور اس کا تذکرہ باب اوّل میں ہو سکتا تھا۔ لیکن وقف کبھی وصیت کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی ہبہ کی صورت میں اس لئے وصیت اور ہبہ کے بعد اس کا بیان کرنا مناسب سمجھا گیا۔ صدقہ اور زکوٰۃ کے متعلق فصل ہفتم میں کہا گیا ہے کہ مفت دینا ہو تو اقربا اور پڑوسیوں کو دینا چاہیئے۔ یہاں تک کہ ابو طلحہؓ نے ایک باغ اہل صدقہ کو خرچ کے لئے دینا چاہا تو آنحضرتؐ نے کہا کہ اپنے اقربا کو دو کہ زیادہ تر مستحق وہ ہیں۔ پھر دوسری جگہ پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ تبوک میں سامان فوج درست کرنے کے لئے جب چندہ کیا گیا تو حضرت عثمانؓ نے وہ سب کا سب مال دیدیا جسکو وہ تجارت کے لئے شام کی طرف بھیجنے والے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے وہ تمام مال دیدیا جو اس وقت ان کے گھر میں تھا اور کہا کہ بال بچے خدا کے سپرد کر دیئے اور حضرت عمرؓ نے اپنی آدھی دولت حوالے کر دی یہ چندہ نہایت خوشی سے آنحضرتؐ نے قبول فرمایا۔ ان امور سے صاف اور صریح طور پر عیاں ہے کہ موقع اور محل کو ہر وقت دیکھنا چاہیئے اور نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ قومی کام مسلمانوں میں بہت زیادہ با وقعت نظر آتا ہے۔ "شرکت کاروبار" (فصل ۳۲) میں ظاہر کیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں شخصی معاملات اور قومی معاملات دو مختلف اصولوں پر مبنی تھے اور اس سے ان کو ترقی کے میدان میں بہت کچھ مدد ملتی تھی۔ وہیں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں قومی خیالات بہت زیادہ تھے اور بغیر اس کے وہ اس درجہ پر نہیں پہنچ سکتے تھے جس پر پہنچے تھے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ بادشاہوں کی سطوت اور سیاست اراکین دولت کو مطیع رکھتی تھی اور اس لئے حکومت کا ڈھچر ڈھیلا نہیں ہونے پاتا تھا یہ خیال بالکل

غلط ہے۔ اراکین دولت اور دور دور کے گورنروں اور صوبیداروں اور دیگر حکام ماتحت کو قومی خیال اتنا تھا کہ کہیں سے سرکشی کا وہم بھی دلوں میں نہیں آتا تھا۔ یہ امر قابل حیرت ہے کہ تین چار سو برس تک پورب سے پچھم تک تمام اچھے حصے دنیا کے عربوں کے قبضے میں تھے اور ان عربوں نے ہمیشہ ایک بادشاہ کے زیر فرمان رہنا پسند کیا۔ اس حیرت افزا مثال سے زیادہ اور کیا ثبوت عربوں کے قومی خیالات کا ہو سکتا ہے۔ جس طرح عربوں نے ملکی معاملات میں اپنی قومی حالت دکھائی ہے اسی طرح انھوں نے اخلاقی حالت میں بھی بے مثل نمونہ دکھایا ہے۔ ان کے زمانہ عروج میں بڑے بڑے حسنات اور خیرات کے کام ان کے ذریعہ سے قائم تھے اور گویا کار خیر کو وسیع پیمانے پر وقف کے ذریعہ سے قائم کرنا مسلمانوں کے زمانے میں مکمل ہوا اور نہ اس سے قبل بجز عبادت گاہوں کے کوئی چیز دنیا میں کسی قوم اور کسی ملت کے نزدیک موقوفہ نہیں سمجھی جاتی تھی اور نہ عبادت گاہوں کے قائم رہنے کے لئے ان میں کوئی قانون یا کوئی آئین تھا۔ عبادت گاہوں پر لوگ مال اسباب اور جائداد چڑھاتے تھے۔ اور کوئی شخص مذہبی خیال سے اس میں دست اندازی پسند نہیں کرتا تھا۔ بس جو کچھ تھا اتنا ہی تھا۔ ہنری ہفتم شاہ انگلستان نے جب انگلستان کی خانقاہیں اور ان کے ساتھ کی جائدادوں کو ضبط کرنا چاہا تو کوئی قانون اس کا مانع نہ تھا صرف عوام کی بددلی اسے کچھ روز تک ڈراتی رہی اور پھر اس کی حکمت عملیوں اور دراز دستیوں نے اس کا بھی خیال نہیں کیا۔

اس مقام پر تاریخی حالات لکھنے نہیں ہیں احکام وقف بیان کرنے ہیں جو باعتبار اصول کے بہت مختصر ہیں۔ صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ جس طرح ہر ایک مسلمان اپنی تمام جائداد کا ہبہ دوسروں کے حق میں کر سکتا ہے ہندوؤں کی طرح اس کی خود مختاری لڑکوں یا دوسرے اہالی خاندان کی مرضی پر موقوف نہیں ہے اسی طرح وہ اپنی کل جائداد کو عوام یا پبلک کے حق میں بھی وقف کر سکتا ہے لیکن اگر وقف کرنے کا یہ منشاء ہے کہ وقف کرنے والا جیتے جی مختار کل بنا رہے اور اس کے بعد عوام کو مداخلت کا حق ہو تو ایسے وقف سے وصیت کے احکام متعلق ہوں گے۔ اور صرف ایک ثلث تک وقف نافذ ہو گا۔ یہ مسئلہ عام اصول انصاف پر مبنی ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنے ورثائے شرعی کو ایک ثلث ترکہ سے زیادہ کی نسبت محروم کرے۔ ہندوستان میں جہاں تمام باتیں نام کے لئے ہیں وہاں وقف کا مسئلہ بھی برائے نام جاری ہے۔ زیادہ تر تو یہ ہوتا ہے کہ جب مرنے کے دن قریب ہوئے۔ تو مالک جائداد کو یہ خیال گزرا کہ جائداد خاندان سے باہر نہ جائے اور نہ وارثوں کی بدچلنیوں سے مہاجنوں کے پاس جائے اس لئے اس نے اپنی جائداد کا وقف نامہ تحریر کیا اور وقف نامہ میں یہ

لکھا کہ جبتے جی واقف مختار کل ہے اور اس کے بعد اولاد ذکور میں سے سب سے بڑا لڑکا مہتمم ہوگا اور آمدنی اولاد ذکور میں بحصہ مساوی تقسیم ہوگی۔ اولاد اناث کو کچھ نہ ملے گا اور اگر یہ خیال آیا کہ کار خیر بھی کچھ لکھ دینا چاہیئے تو یہ لکھ دیا کہ مہتمم کو چاہیئے کہ دروازے پر جو مسجد ہے اس میں ایک پیسہ روز کا تیل روشنی کیلئے ضرور دیا کرے ایسا وقف شرعاً کالعدم ہوتا ہے۔ برٹش گورنمنٹ کی حکومت میں خدا دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے کہ اسکی بدولت ایسے اوقاف پریوی کونسل تک کالعدم قرار پائے اور شرع محمدی کی شرم رہ گئی۔ ناعقبت اندیش خود غرضوں کی بدولت اس کی توہین نہیں ہونے پائی۔

فصل نمبر ۳۸

نکاح

اسلام میں نکاح نہ تو ہندوؤں کی طرح کوئی مذہبی رسم ہے اور نہ دیگر قوموں کی طرح گلے کی پھانسی ہے۔ بے توالد اور تناسل کے انتظام عالم قائم نہیں رہ سکتا اس لئے فطرت نے مردوں کو عورتوں کا اور عورتوں کو مردوں کا خلقتاً شیدا بنایا ہے۔ مردوں کو عورتوں کی طرف اور عورتوں کو مردوں کی طرف مائل کرنے میں جو جنون، فریفتگی، بدحواسی یا سراسیمگی پیدا ہوتی ہے اس سے بہت بڑا سبق خالق عالم کی صناعیوں کا حاصل ہوتا ہے۔ یہاں قانون قدرت کی تشریح کرنا نہیں ہے بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ اگر خلقت میں کوئی نقص ہے نہیں ہے تو مرد عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا اور نہ عورت بے مرد کے چین سے رہ سکتی ہے اور دونوں کی یکجائی ناگزیر ٹھہرتی ہے اس یکجائی کی نوعیت دو ہی قسم کی ہو سکتی ہے۔ عورتیں مرد کی ہو کر رہیں یا حیوانات کے سے تعلق رکھیں کہ غرض حاصل ہوئی کہ جدائی ہو گئی۔ پچھلی صورت زنا ہے۔ دوسری صورت نکاح ہے۔ زنا فی الواقع ایک نہایت برا فعل ہے جسکی پوری توضیح "زنا" (فصل ۲۲) میں کی گئی ہے۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس مضمون کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے اسے ضرور دیکھ لینا چاہیئے۔ اب یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ زنا سے بچنا اور پھر فطرت کے اقتضا کو بھی پامال نہ ہونے دینا بس اسی کا نام نکاح ہے۔ نکاح کی صورتیں مذہب، ملت، ملکی رواج اور قومی خصائل کے اعتبار سے مختلف ہیں۔

ہندوؤں میں مذہبی رسم ہونے کی وجہ سے بچوں کا بیاہ گڈا گڈی کے بیاہ سے زیادہ ہرگز نہیں ہے۔ یورپ میں عمر کا بہترین حصہ گزر جانے پر نکاح ہوتا ہے۔ خیر یہ چنداں معیوب نہیں ہے جتنا یہ امر ناپسندیدہ ہے کہ وہاں دیکھ بھال میں ضرورت سے زائد آزادی برتی جاتی ہے۔ ہند کے مسلمانوں

کی تو کوئی سند نہیں لیکن انکی مذہبی کتاب اور علمائے مذہب کے طرز عمل سے یہ بات پائی جاتی ہے کہ گو باپ صغر سنی میں بھی اپنے بچوں کو بیاہ سکتا ہے لیکن سن شعور کو پہنچنے کے بعد بیاہ کا ہونا زیادہ تر پسندیدہ ہے اور ایسا ہی ہوتا بھی ہے۔ باہمی پسند کے لئے شرع میں دور سے دیکھ بھال لینے کی بھی اجازت ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اعتدال شرع محمدی کا ضرور قابل پسند ہے۔

صغر سنی کی شادی کا عام طور پر رواج دینا یا ایسے نکاحوں کو چاہے وہ کیسے ہی مصلحت پر مبنی ہوں بالکل ہی ناجائز قرار دینا۔ عمر کا اتنا بڑھا دینا کہ اخلاق مذمومہ اپنا گھر کرلیں۔ پسند کے متعلق فریقین کی مطلق عنانی کی کوئی حد نہ ہو یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ انکی برائیاں بیان کی جائیں جب ہی سمجھ میں آئیں ہاں ایک بات ضرور قابل لحاظ ہے کہ زن و شو کی ناموافقت تمام برائیوں پر بالا ہے انتظام عالم میں جس قدر اس سے فتور پڑتا ہے کسی چیز سے نہیں پڑتا۔ مسلمانوں میں نکاح کی غرض سے باہم ایک دوسرے کا دیکھنا گو درست ہے۔ مگر اتنا نہیں کہ ایک دوسرے کے حسن و قبح سے بخوبی واقف ہو جائے۔ اور آئندہ کے لئے تمدنی خرابیوں کی روک تھام ہو ان خرابیوں کے رفع کرنے کے لئے مسلمانوں نے طلاق اور خلع کی آزادی عطا کی اور یورپین قوموں نے اپنی تہذیب کے زمانے میں کورٹ شپ کی آزادی روا رکھی لیکن یہ دونوں طریقے نامحمود ہیں۔ لیکن مجبوری ہے کہ بغیر ان کے چارہ نہیں ہے طلاق اور خلع کی آزادی سے کورٹ شپ کی آزادی ضرور بُری ہے لیکن ہندوستان میں جو یہ طریقہ جاری ہے کہ ایک طرف طلاق اور خلع کی ممانعت ہے دوسری طرف سغر سنی کی شادی کا رواج ہے۔ کبر سنی میں بھی بیاہ ہو تو ایک کو نہ دوسرے کے دیکھنے کی اجازت ہوتی اور نہ اپنی آزادانہ رائے ظاہر کرنے کا حکم ہوتا۔ اس برے طریقہ مناکحت سے کورٹ شپ کا طریقہ بہرحال اچھا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں شادی بیاہ

مسلمانوں میں نہ تو عیسائیوں کی طرح چرچ۔ پادری۔ رجسٹری اور سرٹیفکٹ کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہندوؤں کی طرح بینڈ کھٹراگ کا نام بیاہ ہے۔ دو گواہوں کے سامنے فریقین یا وکلائے فریقین نے ایجاب و قبول کیا اور نکاح ہو گیا۔ مہر لازمی ہے لیکن منہ سے اس کا اقرار بھی ضروری نہیں ہے وہ از خود واجب ہو جاتا ہے۔ لیکن صریح قرارداد ہو جائے تو اچھا ہے۔ پیغمبر خدا نے حضرت علیؓ کے نکاح میں خدا کی تحمید کی تھی۔ نکاح کی ضرورت اور متعددات باری تعالیٰ کی توضیح کی تھی وہ وقت اور تھا۔ ضرورت اور تھی۔ لیکن سنت نبویؐ کے لحاظ سے وہ خطبہ ہر نکاح میں پڑھ لیا

جائے تو اچھا ہے۔

آجکل ہندوستان کے مسلمانوں میں جو طریقہ نکاح کا رائج ہے اس میں حشو و زوائد کو بہت دخل ہے شرعی نکاح یا مسنون نکاح میں بہت سادگی ہونا چاہیئے۔ ذرا بھی لغویات کو دخل ہوگا تو مسنون طریقہ جاتا رہے گا۔ ناچ اور گانا نکاح سے ایک جدا شئے ہے۔ بیاہ کو اس کے ہونے نہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا وجود لہو و لعب میں داخل کیا جائے گا اور یہ نہ ہوگا تو کہا جائے گا کہ لہو و لعب کو دخل نہ تھا۔ لیکن نکاح کو مسنون طریقہ سے انجام دینے کے لئے تمام باتوں میں سنت نبویؐ کی تقلید ضروری ہے۔ رسولؐ اور صحابہؓ رسولؐ کے زمانے میں جس طرح عقد نکاح ہوتا تھا وہ سیر کی کتابوں سے ظاہر ہے اگر اس سے کچھ زیادہ اہتمام کیا جائے گا تو رسولؐ اللہ کی پیروی باقی نہیں رہے گی۔

بیاہ میں کھانا کھلانے کا بھی دستور شرع سے ہے۔ لیکن وہ اس طرح سے ہے کہ دولہا اپنے احباب کی ضیافت کرتا ہے اس کھانے کو اصطلاح شرع میں طعام ولیمہ کہتے ہیں۔ پانچ سو یا ہزار دو ہزار چار ہزار آدمی دلہن کے گھر براتی بن کر کھانا کھانے کے لئے جائیں اور بغیر اس جماعت کے بیاہ ہو ہی نہ سکے اس کا وجود کہیں بھی مسلمانوں کی قدیم تاریخ میں نہیں پایا جاتا اور نہ اب بھی دیگر بلاد اسلام میں کہیں اس کا چرچا پایا جاتا ہے۔

راجپوت کبھی بہ جبر بیاہ کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ عورتیں لڑ کر چھین لاتے تھے۔ اجنبی خاندانوں میں ہنود عموماً بیاہ کرتے ہیں اور اس لئے بہت سے نزاعی امور طے کرنے کے لئے دولہا کے ساتھ ایک جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اجنبی خاندانوں میں دور دور شادیاں ہونے سے سفر دراز کرنا ہوتا ہے اور راہ کے مخدوش ہونے کی حالت میں براتی بن کر ساتھ جانا گویا ایک قسم کی قومی مدد ہے اب اس زمانے میں ہندوؤں کے لئے بھی برات کے جانا فضول سا ہو گیا ہے اور مسلمانوں کے لئے انکی تقلید کسی زمانہ میں مناسب حال نہ تھی اور اب تو شرعی برائیوں کے علاوہ جہالت کی بو آتی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ایک مسلمان سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کی جماعت کے ساتھ اول اول سسرال میں قدم رکھنے کا کیا مطلب سمجھ سکتا ہے اس بری رسم نے مسلمانوں کے گھروں میں ایسی مضبوط جڑ پکڑی ہے کہ بآسانی جاتی ہوئی نظر نہیں آتی اس جہالت کی بھی کوئی انتہا ہے کہ دو حقیقی بھائی باہم سمدھی ہونا چاہیں تو یہ لازم ہوگا کہ بیٹے والا ہزاروں آدمی راہ چلتے جن سے کبھی کی رسم نہیں اس لئے جمع کرے کہ وہ دوسرے بھائی کے گھر پر دھاوا کریں اور پھر یہ غیر ممکن ہے کہ ان ناخواندہ مہمانوں کے کھلانے پلانے میں دونوں حقیقی بھائی آپس میں لڑ نہ جائیں۔ تجربہ سے دیکھا گیا ہے کہ کوئی برات ایسی نہیں ہوئی کہ سمدھیوں میں شکررنجی نہ ہوتی ہو۔ رسم و رواج کی پابندیوں

میں یہی تو برائی ہے کہ آزادی جاتی رہتی ہے۔ سچی خوشی مفقود ہوتی ہے اور دلوں میں کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں افسوس کہ بیاہ شادی میں برات لے جانے کی رسم بند نہیں ہوتی۔ قوم نے سمجھ لیا ہے کہ بیٹی پیدا کرنے کے جرم میں اس کے بیاہ کے دن سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کو ضرور کھلانا پڑے گا اور کھانے والوں کی تعداد کھلانے والوں کی مرضی پر منحصر نہ ہوگی بلکہ ایک غیر شخص کا یہ کام ہوگا کہ جتنے آدمیوں کو چاہے مدعو کرے۔ یہ نئی قسم کا کفارہ گناہ ہے جس کا ذکر کہیں فقہ کی کتابوں میں نہیں ہے اور ایک نئی قسم کی دعوت ہے جس کا تذکرہ کسی اخلاقی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔

گو شرع کے مطابق مراتب ایجاب و قبول اب بھی نہایت سیدھے سادھے طور پر ادا ہوتے ہیں لیکن زن و شو کی مقاربت سے پہلے عورتیں وہ تمام رسمیں پوری کر لیتی ہیں جو ہندوؤں کے فیض صحبت سے ان میں پیدا ہوئی ہیں۔ اس غلط فہمی میں اکثر اصحاب گرفتار دیکھے گئے کہ باہر ناچ گانا نہ ہوا اور اندر سب کچھ ہوا تو وہ سمجھے کہ شرعی نکاح ہوا۔ اندرون خانہ جو رسمیں ادا ہوتی ہیں ان کو بالتفصیل دیکھنا ہو تو جو کتاب مولوی علی امام بیرسٹر پٹنہ کی بہن کی تصنیف شائع ہوئی ہے اسے پڑھنا چاہیئے اور اس کے پڑھنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے گھر کیا ہوتا ہے۔ مرد عورتوں کے مقابلہ میں خود کو کیوں مجبور محض سمجھتے ہیں؟ بعض جگہ تو عورتیں ناحق بدنام کی جاتی ہیں۔ عورتوں سے زیادہ مرد رسم و رواج کے بندے ہوتے ہیں۔

اگر سیدھے سادے طور پر نکاح کیا جائے تو تین فائدے صریح پیدا ہوں گے۔ اول مذہبی خیال سے خدا خوش ہوگا۔ دوم زحمتوں سے نجات ہوگی۔ سوم زیر باری سے چھٹکارا ہوگا۔ خدا کی خوشی کی نسبت کچھ لکھنا فضول ہے منہ سے تو خدا کی خوشی سب ہی چاہتے ہیں۔ لیکن ایسے بہت کم دیکھے گئے ہیں جو خدا کا خوش کرنا دل سے چاہتے ہوں۔ اور جو حضرات ایسے ہیں (کیونکہ زمانہ اچھوں سے خالی نہیں ہے) ان کو اس تحریر سے بے نیازی ہے۔ ان کو کسی کے کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہر وقت خیال کرتے رہتے ہیں کہ ان کے افعال اور اعمال سنت نبویؐ سے نہ زیادہ ہوں اور نہ کم ہوں۔

شادی بیاہ کی زحمتوں کی نسبت ایک حکیم صاحب کے مقولات سننے کے قابل ہیں۔

"بھتیجی لڑکا بالغ ہوا اور نسبت بھی پکی ہو گئی۔ لیکن شادی بیاہ کے کھڑاگ سے میرا جی گھبراتا ہے ہزار پانچ سو روپیہ کوئی مجھ سے لے کر پانی میں پھینک دے تو مجھے منظور ہے لیکن یہ منظور نہیں ہے کہ چار مہینے کے لئے اپنے ضروری کام چھوڑ کر گھر پر بیٹھوں اور سامان کرنا شروع کروں۔ جن صاحبوں نے یہ درد سر خریدا ہے ان کی صورت میرے سامنے ہے۔ ایک آدمی لکڑی کٹوانے کو تعینات ہے۔ سوکھی لکڑی ملتی

نہیں گیلا درخت کے ٹ تو جلد سوکھ نہیں سکتا۔ اچھا گھی بازار میں نہیں ملتا۔ دیہات سے منگوانے کا بندوبست نہیں ہوسکتا۔ بازار کا میدہ اچھا نہیں ہوتا اور گیہوں لسوانے کی زحمت سے جی الجھتا ہے گوشت مصالحہ تو مول مل سکتا ہے۔ دیگ مانگے کی ہوں تو کام چلے۔ صرف ایک دیگ نہیں۔ دری، جاجم، قلعبلہ سوز لیمپ، چارپائیاں۔ تحت ایک لمسریٹ کا پورا سامان کس سے اور کہاں سے مانگا جائے۔ یہ تو باہری سامان ہیں۔ جنکا انصرام مردوں کے لئے چنداں مشکل نہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ سنار بلوا کر گہنا بنوانے کا بار کون اٹھائے۔ کپڑا۔ زیور۔ مختلف چیزیں دو چار ہوں تو تفصیل لکھی جائے۔ سیکڑوں چیزیں کہاں تک بیان کی جائیں۔ خزانہ قارون عمر نوح۔ صحت آدم میسر آئے جب بھی وقت پر ایک نہ ایک چیز ضرور گھٹے گی۔ اور کوشش ناکافی ثابت ہوگی۔

مجھ سے تو یہ گھڑاگ نہ ہوسکے گا۔ یا دوسرے لفظوں میں میں تو اتنا جاہل نہیں ہوں کہ خوشی سے اس کو منظور کر لوں۔ جب تک میرے سر میں دماغ دماغ میں عقل اور عقل میں نیک و بد کی تمیز ہے تو یہ غلطی مجھ سے کبھی نہ ہوگی۔ میں صاف لفظوں میں دلہن کے باپ کو لکھوں گا کہ میں شرعی خیال کا آدمی ہوں اور اپنے لڑکے کو بھی میں نے شرعی تعلیم دی ہے۔ خلاف شرع میں بال برابر بھی کوئی کام نہیں کرسکتا۔ لڑکا حاضر ہے جب چاہے بلوایئے اور نکاح پڑھوا دیجئے۔ میری شرکت بھی غیر ضروری ہے نکاح جسکا ہوگا وہ جائے گا۔ مجھے خدمت گاروں کی طرح ساتھ جانا کیا ضروری ہے۔ اگر سنت نبوی کی تقلید منظور رہے تو بسم اللہ اور نہیں تو آپ کوئی دوسری نسبت ڈھونڈیئے آپ سنت نبوی کی پیروی میں توہین سمجھتے ہیں تو میں آپ سے ناتہ رشتہ قائم کرنے میں اپنی توہین تصور کرتا ہوں۔"

مالی زیر باری کی نسبت زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہزاروں لاکھوں گھر برباد ہوگئے۔ رسم ورواج کی پابندیوں نے بڑے بڑے ہوشیار والدین سے اتنا خرچ کرا دیا کہ جب دلہن گھر میں بیاہ کر آئی تو دلہن کے گہنے بیچ کر دونوں وقت کی روٹیاں بہم پہنچانے کے سوا اور کوئی سہارا نہ رہا۔ کوئی متمول شخص یہ کہے کہ میرے گھر وافر مال ہے۔ خرچ کرتا ہوں تو کیا برا کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اگر خدا نے دولت دی ہے تو خوشی سے خرچ کیجئے فقیروں کو دیجئے اعزہ کو دیجئے۔ لڑکی کے لئے زیور بنوایئے۔ کپڑے تقسیم کیجئے۔ کھانے پکوایئے لیکن بیہودہ رسموں کے ساتھ اتراکر خرچ نہ کیجئے کہ خدا کو برا لگے اور آپکی دیکھا دیکھی کتنے غریب بھائی برباد ہوں۔

دقت تو یہ ہوتی ہے کہ ایک گھر بیاہ ہوتا ہے تو کنبے ناتے کے تمام گھروں میں تردد پیدا ہوتا ہے۔ غربا جن کے پاس کھانے کو بھی نہیں ہے اپنا اسباب بیچتے ہیں اور یہ نہیں گوارا کرسکتے کہ برادری

میں ناموسی ہو اور جہاں دس بھائی موقع موقع سے تمام رسومات میں خرچ کرنے میں تیار ہوں وہاں وہ کچھ بھی نہ کریں۔ایک گھر میں شادی اور دس گھروں کی بربادی۔جہاں ایک کے گھر کسی قسم کی تقریب پیش ہوتی ہے تمام نادار بھائیوں کو فکر دامن گیر ہوتی ہے۔جب مسلمانوں میں تموّل تھا تو خیر کسی طرح نبھی جاتی تھی اب اس تنگ زمانے میں فضول رسموں کی پابندیوں سے جن مالی زحمتوں میں مسلمان گرفتار ہیں وہ ناگفتہ بہ ہیں۔

یہ سب باتیں کچھ نئی نہیں ہیں سبھی جانتے ہیں اور ہر ایک اس سے بھی زیادہ سوچتا۔سمجھتا اور بیان کر سکتا ہے۔لیکن سچی جرأت دمارل کریج کے نہ ہونے سے سوچتے سب کچھ ہیں لیکن کر کے کچھ دکھا نہیں سکتے۔ہندوستانی تعلیم تو بری تھی ہی پرانی لکیر کے فقیر کس مد میں تھے۔نئی تعلیم والے روشن خیال رکھنے والے مارل کریج سے معرّی نظر آتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے۔نئی تعلیم والوں نے رسم ورواج کے مٹانے کی طرف توجہ نہیں کی تو سوا اس کے اور کیا سمجھا جائے کہ ان میں کافی جرأت نہیں ہے۔نہیں! نہیں!! ہم نے غلطی کی۔انگریزوں کی مُسرفانہ طرز زندگی جنکی نظروں میں خوش آیند ہے وہ پرانی رسموں کو جو زیادہ تر اسراف پر مبنی ہیں دل سے ناپسند نہیں کرتے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جہلا کے منہ سے یہ سننا مقصود ہو کہ فلاں صاحب نے تمام عمر انگریزوں سے برابر صحبت رکھی۔لیکن پختہ خیال اور وضعدار ہیں کہ ملک کی قدیم رسموں کی وقعت اب تک تسلیم کرتے ہیں۔

قوم کے اخلاق یا انکی طرز زندگی میں جتنی بڑائیاں ہیں جہالت کی وجہ سے ہیں۔قوم کے علما(روشن خیال حضرات) پر بہت بڑا الزام ہے کہ وہ قوم کی حالت درست کرنے میں کوشش نہیں کرتے اور نہ اپنی روشن خیالی سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔

ازدواج میں بے احتیاطی

ازدواج ایسے اہم کام کے متعلق جو بے احتیاطیاں ہندوستان میں روا رکھی جاتی ہیں وہ شمار سے باہر ہیں اصول رضامندی کے متعلق جو بے احتیاطیاں ہوتی ہیں وہی ہم اس وقت دکھانا چاہتے ہیں۔

دنیا کے کسی معاملے میں غالباً اتنی بے پرواہی نہ کی جاتی ہوگی جتنا کہ انتخاب زوج یا زوجہ میں روا رکھی جاتی ہے۔بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمام عمر کے لئے ایک جھگڑا خریدا جائے لیکن انجام پر مطلق نگاہ نہ ہو۔والدین کے حوصلے زوج کی ناتجربہ کاری۔فرط شوق۔ملکی مراسم یہ سب امور اکٹھا ہو کر اس طرح نوجوانوں کو بے بس کر دیتے ہیں کہ ان سے کچھ بن نہیں پڑتی اور آئیندہ زندگی پر غور

غور کرنے کی انھیں ذرا بھی مہلت نہیں ملتی۔ وہ ہرگز یہ نہیں سوچتے کہ اس وقت کا چوکنا عمر بھر رُلائے گا
والدین کو کیا انھیں تو بہو کے دیکھنے کا شوق یا خانہ آبادی سے مطلب ہوتا ہے۔ آفت تو اس پر آتی
ہے جس کو تمام عمر نکاح کرنا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے سعادت مند بننے کی خوشی میں ہمیشہ کے لئے بلائے
جان خریدنا ہے۔ والدین کو بیاہنے سے جس قدر سرو کار رہتا ہے اس کا اندازہ ان لوگوں کے مذاق سے
بخوبی ہو سکتا ہے جو لاولدی کی وجہ سے گڈّی گڈّے یا باغ اور کنوئیں کے بیاہ سے اپنے دل کے
حوصلے نکال لیتے ہیں۔

بیاہ کے بعد انسان کو نئی دنیا میں قدم رکھنا ہوتا ہے اور اپنے طرز زندگی میں ایک بڑا عظیم الشان
انقلاب ہمیشہ کے لئے پیدا کرنا ہوتا ہے۔ نہایت افسوس ہے کہ اس انقلاب کے پیدا ہونے کے قبل
نشیب و فراز پر پورے طور سے نظر نہ ڈال لی جائے۔

زن و شو میں اگر انس نہیں اخلاق نہیں تو انکی زندگی خود دوبھر ہو جاتی ہے۔ بیاہ کے بعد خود ہی انس
پیدا ہو رہے یہ خیال صریح ناعاقبت اندیشی ہے۔ انسانی طبیعت کا یہ بھی ایک خاصہ ہے کہ اپنی پسند کی
عیب پوشی اور دوسرے کی پسند کی عیب جوئی کی طرف اس کا فطرتی میلان رہتا ہے۔ اب آپ یہ خیال کر
سکتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں مسئلہ ازدواج کے متعلق کیسے کچھ زہریلے اثر یا نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

جس کسی کو اپنی اہلیہ سے انس نہیں ہوتا ہم سمجھتے ہیں کہ سچی خوشی اسے کبھی نصیب نہیں ہوتی اور اس
لطف سے ہمیشہ محروم رہتا ہے جو زن و شو کی یکدلی میں نیچر نے پیدا کر رکھا ہے۔ مردوں پر جو دنیاوی
ترددات کے بار پڑتے ہیں اگر کوئی شے انکی بنیاد مٹانے والی ہے یا جو مردوں کے غم غلط کرنے میں ید
طولیٰ رکھنے کا دعویٰ کر سکتی ہے وہ صرف ان فرماں بردار بیویوں کی ذات ہے جن کے ساتھ ان کے
شوہروں کو انس ہے۔ فطرت اس امر کو چاہتی ہے کہ مردوں کو سب سے زیادہ پیاری انکی عورتیں ہوں
لیکن ہندوستان میں قضیۂ منعکسہ ہے۔ یہاں کے طرز معاشرت پر نظر ڈال کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں سوؔ میں
دس بھی ایسے نہ نکلیں گے جن کو اپنی بیویوں سے عشق ہو۔ ہمارے ملک میں بیویوں کے ہوتے ہوئے
دوسری غیر عورتوں سے تعلق اتنا معیوب نہیں سمجھا جاتا جتنا اور ملکوں میں ہے اس کی وجہ ایک یہ بھی ہو
سکتی ہے کہ جس امر کی طرف کل سوسائٹی کا رجحان ہو وہ معیوب کس طرح سمجھا جائے۔ حالت تو یہ ہو رہی
ہے کہ جو بیاہ ماں باپ کے ذریعہ سے ہوتا ہے وہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر کی حفاظت کے لئے والدین نے
ایک لونڈی خرید کر دی ہے۔ باقی رہا بیوی بننے کا حق یہ اس کو حاصل ہو گا جو اپنی پسند سے مستقل یا
غیر مستقل طور پر آگے چل کر منتخب کی جائے گی۔ یہ کیسی شرمناک بات ہے۔ لیکن لڑکے بھی ایک اعتبار

سے مجبور رہیں ۔ ماں باپ کے انتخاب پر کھانے پینے کا مدار تو نہیں ہو سکتا۔ ازدواج کا سا نازک معاملہ بھلا ماں باپ کی پسند سے کیوں مان لیا جائے ایجاب و قبول کا کہنا تو لفظی اطاعت تھی لیکن دل کس طرح ایک نامعقول حکم کی تعمیل کے لئے ہمیشہ حاضر رہے ۔ والدین جو اپنے لڑکوں کے بیاہ کے بارے میں دخل دیتے ہیں یا لڑکوں کے استمزاج کو مقدم نہیں سمجھتے وہ سخت غلطی کرتے ہیں ۔

ہم اس امر کے قائل نہیں ہیں کہ باپ کو خون کے تعلق سے محبت ہوتی ہے ۔ ماؤں کی محبت البتہ فطری ہے اور باپ کے دل میں اسی کے واسطے سے محبت پیدا ہوتی ہے ۔ لطف انگیز ملاقاتوں کے پے در پے واقع ہونے سے محبت کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور محبوب کا محبوب بھی پیارا معلوم ہوتا ہے ۔ باپ کی محبت لڑکوں سے اسی مسئلہ پر متفرع ہے ۔ باپ کا اگر محض یہ خیال ہے کہ اس کے لڑکے بڑے ہو کر ضعیفی میں اس کے کام آئیں گے تو یہ محبت نہیں خود غرضی ہے ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ لڑکوں سے غیر مانوس رہنا بیوی سے انس نہ ہونے کا لازمی نتیجہ ہے ۔ چھوٹے چھوٹے بچے کو در ہے ہیں میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں ۔ ماؤں کا دل پھولا نہیں سماتا ۔ پیاری پیاری آواز پیاری پیاری ادا اگر باپ بھی اس میں شریک ہو جائے تو کیسی سچی خوشی حاصل ہو اور فطرت گویا تکمیل کو پہنچے ۔ لیکن کیسا کمبخت وہ باپ ہے جس کو لڑکوں کا کودنا ناگوار گزرتا ہے اور اس کے دل کڑھنے کا سبب ہوتا ہے ۔ یہ کیوں ؟ سبب ظاہر ہے بیوی سے انس نہ تھا تو لڑکوں سے کیا انس ہوتا والدین کے دلوں میں بے لطفیوں کے تخم تھے ان لڑکوں کے پیدا ہونے سے وہ جم گئے اور لڑکوں کے ساتھ وہ بھی بڑھتے گئے اور اس طرح نئی زحمتیں بڑھتی گئیں اور مرتے دم تک یہ رنج ساتھ رہا ۔

جب نئی بہو بیاہ کر گھر میں آتی ہے اور اول اول ساس کی نظر اس پر پڑتی ہے ۔ وہ حالت ایسی نہیں ہوتی کہ تحریر میں آسکے پیٹ میں لڑکوں کا رہنا ان کے پیدا ہونے کی دقتیں انکی پرورش کے جھگڑے ان کی مختلف حالتوں کے انقلابات یہ سب باتیں ان ماؤں کو یاد آجاتی ہیں اور وہ سمجھتی ہیں کہ آج ان ساری زحمتوں کا نتیجہ نکلا لیکن تلخیاں جو آئندہ ان کے پیارے لڑکوں کے نصیب میں ہیں ان کا ایک پتلہ بنا کر اسی وقت اس بہو کے برابر رکھ دیا جائے تو شاید ان ماؤں کی روح بدن سے نکل جائے لیکن افسوس اس وقت امتیاز نہیں ہوتا ۔ دو چار مہینہ کے بعد آہستہ آہستہ رنجشیں شروع ہوتی ہیں ۔ ساس الگ خفا نندیں الگ رنجیدہ ۔ میاں ہیں کہ کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے ۔ بیٹے کو پھرا ہوا دیکھ کر ماں بھی پھر گئی بھائی کی نظر کو نندوں نے بھی تاڑ لیا اب دلہن ہے کہ لونڈیوں سے بھی بدتر اس کی زندگی ہے ۔ لڑکے ہوئے تو چندے اس کا دل بہل گیا لیکن وہ بھی اس وقت تک کہ لڑکے ہوشیار نہیں ہوئے ۔ سمجھ آنے پر وہ بھی ایسی

ماں کو بے وقعت سمجھنے پر مجبور ہوں گے جس کو سارے کنبے کی نظروں میں وہ ذلیل پاتے ہیں اب غور کیجئے تو ان تمام خرابیوں کا باعث یہ ہے کہ بیاہ کرنا انکی پسند پر نہیں چھوڑا گیا تھا جن کو فی الواقع اس کی احتیاج تھی یا دوسرے لفظوں میں جن کو پسند کرنے کا حق تھا۔

محرمات نکاح

جن عورتوں سے نکاح درست نہیں ہے انکی تصریح قرآن میں کر دی گئی ہے۔ سورۂ نساء رکوع ۴ میں مذکور ہے۔

"اپنے باپ کی منکوحات سے نکاح نہ کرنا۔ خیر جو ہو چکا وہ ہو چکا بڑی بے حیائی غضب کی بات اور بہت ہی برا دستور تھا۔ مسلمانو! تمہاری مائیں۔ بیٹیاں۔ بہنیں۔ پھوپیاں۔ خالائیں۔ بھتیجیاں۔ بھانجیاں دودھ پلائی دائیاں۔ دودھ شریک بہنیں بیبیوں کی مائیں اور جن بیویوں کے ساتھ تم ہم بستر ہو چکے ہو انکی مادر جلو لڑکیاں جو غالباً تمہاری گودوں میں پرورش پاتی ہیں۔ یہ سب تم پر حرام ہیں۔ لیکن اگر بیویوں کے ساتھ تم نے ہم بستری نہیں کی تو مادر جلو لڑکیوں کے ساتھ نکاح کرنا گناہ نہیں ہے اور تمہاری بہوویں بھی تم پر حرام ہیں اور دو بہنوں کا بھی ایک ساتھ نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ مگر جو پہلے ہو چکا اس کا معاف کرنے والا اللہ ہے وہ بڑا مہربان ہے" سورہ نساء رکوع ۴۔

حدیثوں سے ثابت ہے کہ خالہ۔ بھانجی اور پھوپی بھتیجی کا نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے۔

ابتدائے خلقت میں نکاح کے متعلق کسی قسم کی قید ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن دنیا کی آبادی بڑھنے اور عقل و شعور حاصل ہونے پر یہ سمجھا گیا کہ قریب کی رشتہ داریوں میں شادی بیاہ کا ہونا نسل کی کمزوری کا سبب ہوتا ہے۔ نباتات میں بھی یہی کیفیت ہے۔ قلم لگانے سے پھل بڑے اور میٹھے ہوتے ہیں پودے ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگائے جاتے ہیں تو پھل زیادہ آتے ہیں اور اچھے ہوتے ہیں۔ انھیں خیالات سے ہندوؤں کے نزدیک جہاں تک دو خاندانوں کا ایک مورث کی نسل سے ہونا سمجھا جائے گا ان میں شادی بیاہ قطعاً ممنوع ہوگا اسی کے قریب قریب لیکن کسی قدر سہولت کے ساتھ یورپ کا بھی دستور ہے۔ ایران کے قدیم باشندوں میں قربت کا پرہیز نہ تھا۔ یہاں تک کہ بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ بھی وہ بیاہ کر سکتے تھے۔ شرع محمدی نے اعتدال ملحوظ رکھ کر صرف قریبی رشتہ داریوں میں باہمی ازدواج ناپسند ٹھہرایا۔

کفار عرب میں یہ دستور تھا کہ کم سن عورتیں اگر باپ کے نکاح میں ہوتی تھیں تو کبھی کبھی بیٹے

باپ کے مرنے پر انھیں اپنے نکاح میں داخل کر لیتے تھے۔اس رسم قبیح کو شرع محمدی نے بالکل مٹادیا اسی کی نسبت قرآن میں اشارہ ہے کہ خیر جو ہو چکا سو ہو چکا آئندہ ایسی بے حیائی نہ ہونے پائے۔

شرع محمدی نے قریبی رشتہ داریوں میں نکاح کو اس درجہ مذموم ٹھہرایا کہ رضاعت (دودھ پلانے) سے جو رشتہ داریاں پیدا ہوتی ہیں ان میں باہمی نکاح جائز نہیں رکھا۔اس مسئلہ سے شرع محمدی کی وسعت نظر کا ثبوت ملتا ہے۔ ولادت اور رضاعت کے تعلقات بہت قریبی ہیں ان دونوں میں حرمت نکاح کا لحاظ اور خیال رکھنا اسی لئے ہے کہ مسلمانوں کی نسل میں کمزوری آنے نہ پائے۔یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بڑا احسان انسان پر بعد ماں کے رضاعی کا ہے۔رشتہ دارانِ رضاعی میں باہمی نکاح کو حرام کر کے رضاعت کا احترام مسلمانوں میں اصول فیاضی اور اصول اظہار احسان مندی پر جو قومی ترقیوں کی جان ہے قائم کیا گیا ہے اور یہ وہ بات ہے کہ دنیا کی کسی قوم میں بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔

قریبی رشتہ داریوں میں نکاح کا جائز ہونا یہ مطلب نہیں رکھتا کہ خاندان کی لڑکیاں خواہ مخواہ خاندان ہی میں رہیں یہ جواز محض اس لئے ہے کہ اگر کسی وجہ سے ایسا ناگزیر ہو تو شرعی تحریم مانع نہ ہو یہ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز جائز ہو اس پر خواہ مخواہ عمل کیا جائے۔پیغمبرؐ خدا کے وقت میں نیز اس کے بعد بھی غیر خاندان میں شادی کرنا پسند کیا جاتا تھا۔شادی بیاہ میں ایک کفو ہونا بے شک مناسب تصور کیا گیا ہے کفو کا مطلب ہے شرافت اور حیثیت میں مساوی ہونا۔کفو کا لحاظ رکھنے سے یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک دادا کی اولاد آپس میں خواہ مخواہ شادی بیاہ کرے اس طرح ضرور نسل خراب ہو جاتی ہے۔

کفو کا یہ مطلب ہے کہ دبّاغ کی لڑکی حتی الوسع دبّاغ کے گھر بیاہ کر جائے گی تو زن وشو کے لئے راحت کا سامان ہوگا۔عطار کی لڑکی جو ہمیشہ عطر میں بسی رہی اور پھولوں سے کھیلتی رہی اگر بیاہ کر دبّاغ کے گھر جائے گی تو چمڑے کی بو اس کے دماغ کو ایسا پریشان رکھے گی کہ اسے چین نہ آئے گا پیغمبرؐ خدا نے اپنے بہت سے عقد کئے لیکن خاندان میں صرف ایک عقد کیا اور وہ بھی نہایت مجبوری سے۔حضرت زینبؓ پھوپی زاد بہن کو آپ نے زید سے بیاہا۔زید نے حضرت زینبؓ کو طلاق دی تو حضرت زینبؓ ملول ہوئیں۔حضرت زینبؓ کو پہلے بھی اس نکاح میں تامل تھا کہ حضرت زید جاہلیت کے خیالات کے باعث ذات میں کم تر سمجھے جاتے تھے۔آنحضرتؐ نے اخوت اسلامی کی مساوات اپنے ہی گھر سے قائم کرنا چاہی اور اس لئے حضرت زینب نے آنحضرت کی خاطر سے زید کے ساتھ بیاہا جانا پسند کیا۔حضرت زیدؓ کے طلاق دینے پر آنحضرتؐ کو حضرت زینبؓ کی دلجوئی کے لئے انکو اپنے نکاح میں لینا انسب معلوم ہوا۔

دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا صریح قرآن میں منع ہے۔ آنحضرتؐ نے اسی اصول پر بیوی کی حیات میں اسکی بھتیجی یا بھانجی سے بھی عقد کرنا منع کر دیا ہے آنحضرتؐ کا اس اصول پر بیوی کی حیات میں عقد کے لئے منع کرنا اس مصلحت پر مبنی ہے کہ اتنی قریب کی رشتہ داریوں میں اس قسم کا برتاؤ مستحسن نہیں معلوم ہوتا۔ بیوی کا احترام اس امر کا مقتضی ہے کہ اس کے جیتے جی اس کے قریب کے رشتہ داروں سے نکاح نہ کیا جائے لیکن بیویوں کے مرنے کے بعد یہ حرمت شرعی قائم نہیں رہتی اس بارہ میں بھی مسئلہ شرعی نہایت معتدل حالت رکھتا ہے ورنہ یورپ میں بیوی کے مرنے کے بعد بھی سالیوں کے ساتھ نکاح درست نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن بیوی کے مرنے کے بعد سالی سے بیاہ کرنا تمدنی حالت کے اعتبار سے کبھی کبھی نہایت مناسب تصور کیا جاتا ہے چنانچہ پارلیمنٹ میں اسے جائز کر دینے کی بابت کئی مرتبہ بل پیش ہوئے اور بڑے بڑے مباحثہ ہوئے۔ ابھی قانون پاس نہیں ہوا لیکن عام خلقت کا رجحان ہے کہ ایسا ضرور ہونا چاہیئے۔

فصل نمبر ۳۹

مہر

مسلمانوں میں طلاق کا دے دینا بہت آسان امر ہے۔ کثرت ازدواج کا بھی ان میں دستور ہے۔ یہ دونوں بجائے خود دو سخت بلائیں ہیں۔ لیکن یہ دونوں بلائیں اسلام نے اپنے گھر میں اسی طرح پال رکھی ہیں جس طرح لوگ چوہوں کے مارنے کے لئے بلیاں پالتے ہیں۔ ان دونوں بلاؤں سے سخت تر بلا زناکاری ہے۔ زناکاری کی روک تھام کسی طرح نہیں ہو سکتی اگر ہو سکتی تھی تو صرف انھیں دو چیزوں کے قائم رکھنے سے ان دو چیزوں کا قائم رہنا عورتوں کے حقوق اور انکی آزادیوں کو بالکل ہی نیست و نابود کر دیتا تھا۔ اس لئے عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے مہر قائم کیا گیا دنیا میں جتنی تکالیف ہیں ان میں سے اکثر کا معاوضہ روپے ہو سکتا ہے۔ زنا کو سخت ترین جرائم قرار دے کر مردوں کو شریعت نے نکاح کی طرف مائل کیا۔ عورتیں نکاح کے ساتھ کثرت ازدواج اور سہولت کے مسائل سن کر گھبرائیں تو شریعت نے عورتوں کے کان میں چپکے سے کہدیا کہ لو مردوں کو تمہارے اختیار میں ہم کئے دیتے ہیں جتنا چاہو مہر بندھوالو۔ گھبرانا کس بات کا ہے۔ یہ مہر عورتوں کے اولیاء کا حق نہیں ہوتا۔ خود عورتیں اس کو پاتی ہیں۔ چاہے شروع ہی سے لے لیں یا ادائیگی شوہروں کی گردن پر قائم رکھیں۔ یا کچھ لے لیں اور کچھ باقی نگار کھیں۔ کتنا صاف مسئلہ ہے۔ لیکن اس کے سمجھنے میں عملدرآمد میں اس کے اعراض اور اسکی پالیسی کے جانچنے میں جو غلط فہمیاں قوم سے اور قوم بھی ایسی ویسی نہیں اچھے اچھے سمجھ داروں سے۔ عدالتوں سے اور قانون کے پیشواؤں سے ظہور میں آتی ہیں وہ بہت زیادہ کثیر الوقوع ہیں۔ اور بہت کچھ فرائض انسانی کے خلاف ہوتی ہیں۔ جب خود مسلمان بہت

کم ایسے ہیں جو اس مسئلہ کو بخوبی سمجھ سکیں تو دوسری قوم کے لوگ جو مسلمانوں سے معاملہ کرتے ہیں اور اس طرح مسئلہ دَین مہر کے متعلق معاملات پیش آنے پر ان کے نفع اور نقصان کو بھی اسی مسئلہ سے عارضی طور پر وابستگی پیدا ہو جاتی ہے بھلا کیا سمجھیں گے۔ سبب یہ ہے کہ لوگوں کو اس بحث کے متعلق ایسی مکمل واقفیت حاصل نہیں ہے جو ہونا چاہیئے اور اس لئے شاید کوئی دوسرا شرعی مسئلہ اس بارہ میں دَین مہر کا سا کم نصیب اور بدبخت نہ ہوگا۔

سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ فطرت نے مرد کو کمانے کے لئے پیدا کیا ہے اور عورتوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ مردوں کی کمائی میں حصہ لیں اور ان کے بخت کی شریک بنیں مردوں کے آرام و آسائش کے لئے عورتوں سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہ پیدا ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ مشہور ہے کہ "ہر کہ زن ندارد۔ آسائش تن ندارد" باعتبار قومی حالت کے ان عورتوں کا مردوں کے قبضہ میں آنا مختلف پیرائے میں ہوتا ہے۔ ہم یہاں سمجھنے کے لئے ہندو۔ عیسائی اور مسلمان۔ تین قوموں سے بحث کرتے ہیں۔

ہندوؤں کے نزدیک نکاح ایک مذہبی رسم ہے۔ نجات آخرت کے لئے نکاح ضروری ہے (کیونکہ لڑکا نہ ہوا تو پنڈا دینے کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا) اور نکاح کا ہونا ایسا مضبوط عقد ہے جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا۔ طلاق کا کہیں دھرم شاستر میں ذکر نہیں۔ بیاہ کے بعد عورت اور مرد اس طرح ایک دوسرے کے بخت کے شریک ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح علیحدگی ممکن نہیں ہوتی۔ یوں عورت خود مرد کو چھوڑ بیٹھے اور مرد چپکا ہو رہے تو وہ بات ہی جدا ہے۔ لیکن پھر دونوں ملنا چاہیں تو کوئی امر مانع نہیں ہے۔ ہندوؤں اور انگریزوں کے دستور اس بارہ میں قریب قریب یکساں ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ زناکاری کی حالت میں طلاق دینے کا قاعدہ انگریزوں کے یہاں مریحاً مسلّح قانون ہے۔ اور ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری بیوی کے لانے کے قاعدے کو انگریزوں نے اپنے نزدیک بہ اقتضائے تہذیب ناجائز بلکہ حرام قرار دے رکھا ہے ان دونوں قوموں میں عورتوں کا مہر کچھ نہیں ہوتا لیکن اس مہر نہ ہونے کی کمی یوں پوری کی جاتی ہے کہ مرد عورت کو طلاق نہیں دے سکتا اور اولاد ذکور نہ ہونے کی صورت میں بیوائیں اپنے شوہروں کا کل ترکہ پاتی ہیں۔ جیتے جی اگر نان نفقہ میں مرد کمی کرے تو عدالت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ عدالت بھی ایسی ویسی نہیں۔ فوجداری۔ فوراً آٹھ آنے کی درخواست پر پچاس روپے ماہوار تک (حسب حیثیت) نان و نفقہ مقرر ہو جاتا ہے اور اجرائے ڈگری میں یہ آسانی ہے کہ ہر مہینہ پولیس نے پکڑ کر میاں سے بیوی کا وظیفہ دلوا دیا میاں نے ذرا پہلوتہی کی

کہ جیل کی صورت دیکھنا نصیب ہوئی - مہاجنوں کا روپیہ ہو تو دیوالیہ ہونے کی درخواست بھی ہو سکتی ہے اس میں وہ بھی نہیں جب تک زندگی ہے اسکی ادائیگی سے چھٹکارا نہیں ہے ۔ بیوی کی جوتیوں پر ناک رگڑکراس کو راضی کیا جائے ۔ یا قتل انسان کے جرم میں سزا ہوتی ہے یعنی جلاوطنی ، خود خوشی سے قبول کرلی جائے ۔ غیر ملک میں پناہ لی جائے ورنہ ہندوستان میں تو پولیس کے وارنٹ سے کہیں چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ بتایئے ہندوؤں اور عیسائیوں کی عورتوں کو جو حقوق وصول نفقہ کے حاصل ہیں کیسے مستحکم ہیں جس آسانی سے ڈگری ہوتی ہے اور جس طریقہ سے اجرائے ڈگری عمل میں آتی ہے وہ ان لوگوں کو بھی نصیب نہیں جو مدیوں کو فاقہ کش دیکھ کر روپیہ دیتے ہیں اور اسٹامپ اور رجسٹری سے پوری چوکسی کر لیتے ہیں ۔

اب ذرا مسلمانوں کے قانون ملاحظہ فرمایئے کہ مرد ہر وقت بلا قصور عورت کو طلاق دے سکتا ہے اور ضابطہ فوجداری کے احکام سے گویا مسلمانوں کی قوم مستثنیٰ ہے ۔ بیوی نے نان نفقہ کا سمن جاری کرایا اور میاں نے ایام عدت کا خرچہ عدالت کی میز پر رکھ کر اور باعلان تین مرتبہ عورت کو طلاق دے کر سیدھا گھر کا راستہ لیا اور اس طرح تین لفظوں میں سارا مرحلہ طے ہو گیا مسلمانوں میں عموماً نان و نفقہ کا دعویٰ وہی عورتیں کرتی ہیں جو اس طرح طلاق پانے کو اپنا چارہ کار سمجھتی ہیں ۔

مسلمانوں میں عورتوں کو کل ترکہ شوہری کسی حالت میں نہیں ملتا زیادہ سے زیادہ ربع ورنہ معمولی طور پر ایک ثمن (آٹھواں) ملتا ہے دیکھئے طلاق کے مسئلہ میں اور کل ترکہ کے نہ پانے میں مسلمان عورتوں کی حالت کس درجہ ہندو اور عیسائی عورتوں سے گھٹی ہوئی ہے ۔

یہاں یہ بات اور یاد رکھنے کے لائق ہے کہ مطلقہ عورتوں کو پھر دوسرے سے نکاح کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں تو شامت اعمال سے یہ قریب قریب حرام سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن جہاں اس کا رواج ہے وہاں بھی زن بیوہ یا مطلقہ سے لوگ بمجبوری عقد کرتے ہیں ورنہ عام طور پر ہر ایک ایسی ہی عورت کا متلاشی رہتا ہے جو کسی شوہر کا منہ نہ دیکھ چکی ہو ۔ عورتوں میں سب سے زیادہ قابل قدر اور قیمتی چیز بادی النظر میں ماء الشباب ہے جسکو دوسرے لفظوں میں نیچر (فطرت) کے پھندے یا قدرت کے جال سے تشبیہ دے سکتے ہیں ۔ ماء الشباب چلے جانے کے بعد نہ عورتوں میں اپنی طرف دلوں کو کھینچنے کی طاقت باقی رہتی ہے اور نہ مردوں کی زبان پر یہ مصرعہ رہتا ہے ۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ایک بات اور بھی قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان کی مسلمان عورتیں نکاح کے بعد ہر وقت طلاق

کے ڈر سے لرزاں رہتی ہیں اپنے حقوق کے طلب کرنے میں کبھی دلیری سے کام نہیں لے سکتیں اور ساری عمر گویا لونڈیوں کی طرح سے بسر کرتی ہیں۔

مفصلۂ بالا تقریر سننے کے بعد ناظرین سمجھے ہوں گے کہ مسلمان عورتوں کا سا بدبخت دنیا میں کوئی دوسری مخلوق نہیں ہے حالانکہ یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ عورتوں کے جتنے حقوق شرع میں ہیں ان میں دست اندازی نہ کی جائے تو وہ بھی مردوں کی طرح آزاد اور خوش رہ سکتی ہیں کیونکہ آئندہ تمام مصیبتوں سے مقابلہ کرنے کے لئے مسلمان عورتوں اور ان کے ولیوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ نکاح سے قبل جو زیادہ سے زیادہ مہر مردوں سے چاہیں ٹھہرالیں کہ یہ نقدی یا رہمیشہ مردوں کے مقابلہ میں انکے حقوق کا محافظ رہے اور وصول ہو جانے کی حالت میں نہایت عمدہ طور پر دیگر نقائص کی تلافی کر سکے۔ لیکن افسوس ہے کہ قوم کے طرز عمل نے ان بے چاری پردہ نشین اور بے زبان عورتوں کو اس زبردست آلۂ حفاظت خود اختیاری سے محروم کرنے کی دھمکی دے رکھی ہے۔

ان عورتوں کی حق تلفی کے تین ذریعے ہیں۔ ایک خود قوم کی غفلت۔ دوسرے قانون پیشوں کی (جسمیں عدالت بھی شامل ہے) غلط فہمیاں۔ تیسرے ان لوگوں کی ناواقفیت جن کو مسلمانوں کے خاندان سے معاملے کرنے پڑتے ہیں۔ ہم ہر ایک شق کو علیحدہ طور پر الگ الگ بیان کرتے ہیں۔

عورتوں کی غرض مشترکہ پر لحاظ نہ کیا جائے تو ما‌ءالشباب سے زیادہ قیمتی چیز دنیا میں کوئی دوسری نہیں ہوسکتی اور اس لئے اس کے عوض میں جس قدر روپیہ دیا جائے کم ہے۔ مہر کی تعداد شرع میں معین نہیں ہے۔ جسقدر فریقین میں طے پا جائے وہی مہر ہے ہاں دس درم شرعی سے کسی طرح کم نہ ہو۔ ابتدائے اسلام میں جو کیفیت مسلمانوں کے افلاس کی تھی وہ ظاہر ہے اور حالت کے اعتبار سے تعداد مہر بھی بہت کم ہوتی تھی۔ پیغمبر خدا اور ان کے خاندان کے مہر بہت کم تھے اور اس لئے اب بھی مسلمانوں کے بعض خاندانوں میں انھیں تعدادوں کی پیروی مناسب سمجھی جاتی ہے لیکن ہمارے نزدیک شرع ایسی پیروی کو مستحسن نہیں سمجھتی۔ بلکہ بعض اوقات لڑکیوں کے والدین پر ایک اخلاقی الزام یہ عائد ہو جاتا ہے کہ انھوں نے زمانہ موجودہ کی حالت سے غافل رہ کر نامناسب طور پر شرعی غلط فہمی پر عمل کرنے سے اپنی بے زبان لڑکیوں کو تعداد مہر کم منظور کر کے نقصان پہنچایا۔

بعض خاندان ایسے بھی ہیں کہ وہ مہر کے اغراض تک نہیں سمجھتے۔ جیسے مسلمانوں کا جھوٹا پانی پینا علامت اسلام سمجھتے ہیں ویسے ہی نکاح کے وقت دس درم کا لفظ درمیان میں آجانا شعار اسلام جانتے ہیں۔ زیادہ تر شرفا کے خاندان ایسے ہیں جو اپنی لڑکیوں کے مہر زیادہ مقرر کراتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں

کہ مہر کا زیادہ ہونا لڑکیوں کے آرام و آسائش کا سبب ہوتا ہے لیکن بعض اوقات گزشتہ زمانے کی ثروت کے لحاظ سے مہر کی تعداد میں اظہار عظمت خاندان کی اتنی زیادہ ہو جاتی ہے جو کسی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ گویہ حالت پسندیدہ نہیں ہوتی۔ لیکن مجبوری ہے۔ عدالتوں کو اس بڑی سے بڑی تعداد کے بھی صحیح مان لینے میں اس لئے کچھ تامل نہ ہونا چاہیئے کہ تعداد مہر خود فریقین کے سمجھنے کی بات تھی نہ کہ عدالت کے سمجھنے کی۔

ہند کی اعلیٰ عدالتوں میں جو فیصلے مہر کے مقدمات میں ہوئے ہیں وہ بہت زیادہ تشفی بخش ہیں متوفی کا دین مہر جب تک ادا نہ ہو تقسیم ترکہ عمل میں نہ آئے۔ متوفی کے مرنے پر اگر اس کی بیوہ کا قبضہ اسکی کل جائداد پر ہو جائے تو اس کا قبضہ بعوض دین مہر کے مرتہنانہ سمجھا جاتا ہے اور جب تک مہر ادا نہ کیا جائے گا دیگر ورثاء کو ترکہ کی نالش کا حق نہیں ہوتا۔ لیکن نوعیت قبضہ اور طریقہ وصول دین مہر کی بحث تو دین مہر کے طے ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے اور تعداد مہر معین کرنے کا کام ایسے لوگوں سے تعلق رکھتا ہے جو مفصلۂ بالا اصول سے ناواقف رہنے کی وجہ سے عورتوں کے خلاف رائے قائم کرنا محفوظ طریقہ خیال کرتے ہیں اور بعض وقت تو وہ ایسی بے پروائی سے قائم کی جاتی ہے گویا دین مہر حق العباد ہے ہی نہیں۔ محض ایک رکن مذہب ہے اور اس میں تو کلام ہی نہیں کہ دعویٰ مہر رجوع ہونے یا مسئلہ مہر زیر بحث ہونے کے ساتھ ہی یہ رائے قائم ہو جاتی ہے کہ شوہر یا ورثائے شوہر کی سازش سے کسی غریب کی حق تلفی کے لئے ایسا کیا جاتا ہے۔ مجوزہ کے دل میں ایسا شک پیدا ہونا ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ کس درجہ خطرناک ہے اور یہ بھی جان سکتے ہیں کہ نظر بہ حالات سابق شک کہاں تک انصاف سے دور ہے۔ بعض حالتیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ دعویٰ سازشی ہے پھر بھی سازش سے انصاف میں کوئی فرق نہیں آتا مثلاً کسی مالدار کی لڑکی کسی مالدار کے ساتھ بیس ہزار مہر پر بیاہی گئی۔ جائداد شوہری ایک لاکھ روپے کی ہے۔ عورت دین مہر کے باعث سے اپنے کو جائداد کے ایک خمس کی مالک سمجھی بیٹھی ہے۔ اتفاقاً زمانہ کوئی نہیں جانتا۔ کسی طرح ایک لاکھ روپیہ ہرجہ کی ڈگری شوہر پر کسی غیر نے حاصل کر لی اور جائداد عنقریب نیلام ہوا چاہتی ہے اب عورت اسی اثنا میں دعویٰ اپنے مہر کا کر دے اور غرض یہ ہو کہ اگر ڈگری ہو گئی تو زر نیلام میں عورت بھی حصہ رسدی پا جائے گی اور اس طرح بیس ہزار کے قریب ضرور مل جائیں گے۔ یوں خاموش رہنے سے کل جلتے رہتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسے دعوے کے رجوع کرنے میں شوہر ضرور خوش ہوگا وہ سمجھے گا کہ غیر کی ڈگری میں کل جائداد نیلام ہو جانے سے بہتر ہے کہ ایک جزو میری بیوی کے پاس

آجائے لیکن کیا محض اس لئے کہ زوجہ کی ڈگری سے شوہر کا بھی ضمنی فائدہ ہوگا۔ زوجہ کے دعوے کا ڈگری کرنا کسی طرح اعلیٰ درجہ کے عدل اور انصاف سے ذرا بھی گرا ہوا ہوگا؟ ہرگز نہیں۔

ہماری اس تحریر سے ان لوگوں کو بھی نفع ہوگا جو مسلمانوں کے قاعدہ دَین مہر سے بالکل ناواقف ہیں۔ اور مسلمانوں کے خاندان کو ہندوؤں اور عیسائیوں کے خاندان پر قیاس کرکے معاملہ کر بیٹھتے ہیں اور پھر پیچھے سے ..... واقعات کے چھپانے سچی بات کے بدلنے اور غلط مقدمات کی ترتیب دینے سے اپنی غلطیوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جو شخص معاملہ کرنے سے پہلے احتیاط سے کام نہیں کرتا وہ گویا خود اپنی مدد نہیں کرتا اور ظاہر ہے جس نے خود اپنی مدد نہ کی عدالت سے مدد چاہنے کا اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

ممالک مغربی وشمالی کے لفٹنٹ گورنر نے عدالتوں کو دین مہر کی تعداد گھٹانے کا اختیار دینا چاہا تھا وائسرائے نے یہ تحریک پسند نہ کی اس اثناء میں بہت سے لوگوں سے رائیں طلب ہوئی تھیں۔ مولف نے بھی ایک رائے دی تھی جسکا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"آجکل ممالک مغربی وشمالی کے واضعان قانون یہ غور کر رہے ہیں کہ تعداد مہر کا عدالت کو گھٹانا مناسب ہے کہ نہیں۔ اودھ میں عدالتوں کو اختیار ہے کہ اگر نامناسب طور پر مہر میں زیادتی کی گئی ہو تو اسکی تعداد گھٹا دی جائے۔ ممالک مغربی وشمالی میں ایک مقدمہ ہائیکورٹ تک پہنچا جس میں یہ بحث تھی کہ اگر تعداد مہر گھٹائی نہیں جاتی تو تمام جائداد مہر ہی کی نذر ہو جاتی ہے دوسرے وارثوں کے لئے کچھ نہیں بچتا۔ ججوں نے تجویز کی کہ اودھ کی طرح اس ملک کی عدالتیں دست اندازی کی مجاز نہیں ہیں اس لئے مجبوری ہے۔ گورنمنٹ تک اسکی خبر پہنچی اور اب یہ غور کیا جا رہا ہے کہ ممالک مغربی وشمالی میں بھی اودھ کا سا قانون نافذ کیا جائے تو کیسا ہے؟"

"میرے نزدیک موجودہ حالت میں تغیر مناسب نہیں ہے اور وجوہ اسکے یہ ہیں۔

"انگریزوں اور ہندوؤں کی طرح مسلمانوں کے قانون میں طلاق مشروط بشرائط یا غیر محکوم نہیں ہے۔ ہر شخص بغیر کسی وجہ کے اپنی زن منکوحہ کو چھوڑ سکتا ہے اور قانون انگریزی نے کوئی مداخلت اس بارہ میں بلالحاظ اس کے کہ یہ مداخلت مناسب ہوگی یا نامناسب اب تک نہیں کی ہے۔ مسلمانوں کی عورتیں اعادہ حق زناشوئی کا دعوےٰ دیوانی میں اور نان نفقہ کا دعویٰ عدالت فوجداری میں عملی طور پر نہیں کر سکتیں کیونکہ جواب میں ایام عدت کا نفقہ رکھ کر عدالت کے سامنے مدعا علیہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے اپنی عورت کو

طلاق دیدی۔ ہندوستان میں باستثنائے خاص خاص شریف خاندانوں کے طلاق کی رسم برابر جاری ہے اور جن گھروں میں طلاق کی رسم نہیں ہے وہاں طلاق سے بھی بدتر طریقہ جاری ہے یعنی عورتوں کو لوگ معلقات کے طور پر چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی وہ حق زناشوئی ادا نہیں کرتے اور نہ طلاق ہی دیتے ہیں کہ وہ انکی قید سے آزاد ہو جائیں۔ بہرحال ہندوستان کی بے زبان عورتیں بے لکھی پڑھی اپنے شوہروں کے قبضہ میں بے بسی کی حالت میں رہتی ہیں اور جن گھروں میں رسم پردہ جاری ہے وہاں عورتیں اور بھی مجبوری کی حالت میں رہتی ہیں۔ پردہ کی سختی شرعی حدود سے متجاوز ہے اور اس لئے بہت سخت ہے ان سب زحمتوں کی تلافی اگر کچھ ہے تو وہ مہر سے ہے اس مہر کے ذریعے سے ایک گونہ شوہروں پر عورتوں کا دباؤ رہتا ہے۔ گو اپنے حقوق سے ناواقف رہنے کی وجہ سے ان عورتوں کو اس دباؤ کے نافذ کرنے کا اتنا موقع نہیں ملتا جتنا کہ ہونا چاہیئے۔ لیکن پھر بھی تعداد مہر میں عدالت کی دست اندازی کا روا رکھنا عورتوں کی حالت زار سے صریح بے پروائی کرنا ہے اور مردوں کی زیادتیوں کو اور ترغیب دینا ہے۔

"جس وقت اسلام عرب میں پھیلا تھا عورتوں کو بہائم کے طور پر لوگ استعمال کرتے تھے۔ طلاق میں آزادی عورتوں کی ہمدردی سے قائم کی گئی۔ یعنی جاہل عرب جب اپنی بیویوں کو ناپسند کرتے تھے تو وہ طلاق نہیں دیتے تھے بلکہ ان کو چھوڑ دیتے تھے اور گھروں میں لونڈیوں کی طرح رکھتے تھے اور یہ اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ دوسروں کے ساتھ بیویوں کی طرح رہ سکیں شارع نے اس رسم کے مٹانے کے لئے طلاق کے قواعد منضبط کئے اور اس خیال سے کہ طلاق جو ایک بلا دفع کرنے کے لئے قائم کی گئی تھی خود اس سے بڑی بلا نہ ہو جائے عورتوں کو تعداد مہر بڑھانے کی عام اجازت دی گئی۔ شروع شروع اپنے شوق میں عربوں نے تعداد مہر کی زیادتی پر اپنی رضامندی ظاہر کردی اور عورتیں جو قومی ترقی کے اثر سے آزاد ہو چلی تھیں زیادہ مہر پر اصرار کرنے لگیں۔ کچھ دنوں کے بعد مردوں نے اسے ناپسند کیا اور خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے ایک روز یہ تقریر کی کہ لوگ زیادہ مہر نہ باندھیں۔ ایک بڑھیا جو مجمع میں موجود تھی۔ وہ بولی کہ قرآن شریف نے جس چیز کو جائز رکھا ہے خلیفہ وقت کو اسے مٹانا نہ چاہیئے۔ حضرت عمرؓ کو اس بڑھیا سے سبق حاصل ہوا اور انھوں نے اپنی غلطی مان لی اور اس

بڑھیا کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد سے بلاد اسلام میں کبھی تعداد مہر گھٹانے کی طرف بادشاہ وقت یا قاضیوں کو توجہ نہ ہوئی۔

"میری رائے میں جب عورت مدعی ہو کر مہر کا دعویٰ شوہر پر پیش کرے اس حالت میں عدالت کو تعداد مہر میں دست اندازی کرنا کسی طرح قرین مصلحت نہیں ہے۔ اب رہا یہ امر کہ شوہر کے مرنے کے بعد ورثاء کے مقابلہ میں تعداد مہر کی بحث پیش ہو تو کیا کیا جائے؟ اس کا جواب بھی مشکل نہیں ہے۔ بعض اوقات ضرور ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کو عوام پسند نہیں کرتے جیسا کہ مقدمہ کلکٹر مراد آباد بنام ہربنس سنگھ کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس میں شرع محمدی کا کچھ نقص نہیں ہے بلکہ خود اپنی سمجھ کا پھیر ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی کل جائداد کسی کو دے ڈالے تو اس میں کسی کا اجارہ نہیں ہے اور اگر کوئی شخص کسی عورت کے حق میں اپنی کل جائداد کا ہبہ کر دے اور پھر اس سے نکاح کرے تو عقلاً یا انصافاً، کوئی قباحت نہیں ہے اسی طرح اس نے اگر بقدر مالیت جائداد کے مہر کا تعین کر دیا تو یہ بھی ایک طور پر اپنی کل جائداد کا ہبہ کرنا ہے اور یہ ہبہ بے وجہ نہیں ہے عورت اپنی آزادی مرد کے حوالے کرتی ہے تب کہیں یہ جائداد پاتی ہے اگر اس طرح دیگر ورثاء محروم ہو جاتے ہیں تو کوئی بے انصافی لازم نہیں آتی۔ دوسری قوموں کے قوانین دیکھئے یورپ میں ورثاء قریب کا حرمان مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے۔ مثلاً خلف اکبر کے مقابلہ میں چھوٹے لڑکے زمین نہیں پاتے۔ اگر وصیت نہ ہوئی تو اور تمام لڑکے محروم رہتے ہیں۔ اس لئے وہاں پہلے سے مورث کو اختیار ہوتا ہے کہ اپنے ورثاء میں جس طرح چاہے وصیت کرے اسلام نے نہ تو بڑے بیٹے کو کسی حالت میں کوئی ترجیح دی ہے اور نہ متوفی کی وصیت جہاں تک ورثاء کے محروم کرنے یا ایک وارث کو دوسرے وارث پر ترجیح دینے کے متعلق جائز رکھی ہے۔

"شارع اسلام نے گو ورثاء کے حقوق کی بہت زیادہ حفاظت کی ہے۔ لیکن پھر بھی تعداد مہر ادا ہونے تک تقسیم ترکہ اس نے روا نہیں رکھا اور نہ تعداد مہر کے گھٹانے کی طرف کبھی توجہ کی شرع میں تعداد مہر ایک نہایت مہتم بالشان امر اب تک مسلمانوں میں سمجھا گیا ہے۔

"ہر قوم کا قانون ایک حد تک اس قوم کے لئے آرام دہ ہے۔ اگر کوئی جزو اس کا ناقص سمجھ کر اس کی اصلاح میں کوشش کی جائے تو بجائے نفع کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ

ہے۔ اگر تبدیلی روا رکھی جائے تو کل قانون میں ایک ساتھ تبدیلی ہونی چاہیئے مثلاً اگر تعداد مہر کے گھٹانے کا اختیار عدالت کو دیا جائے تو یہ بھی اختیار عدالت کو دیا جائے کہ بغیر اجازت عدالت کے شوہر طلاق نہ دے اور بغیر اجازت عدالت کے کوئی ایک سے زیادہ نکاح نہ کر سکے۔ طلاق اور کثرت ازدواج میں مرد آزاد رہے اور تعداد مہر بڑھانے اور گھٹانے میں عورتیں آزاد رہیں تو مصلحت عام کے خلاف ہوگا اور بعض صورتوں میں جو اتفاقی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں ان سے کہیں زیادہ برائیاں موجودہ قاعدہ کے بدلنے میں پیدا ہو جائیں گی۔

فصل نمبر ۴۰

طلاق

شوہر اپنی بیوی کو چھوڑ دے تو اسے طلاق کہتے ہیں اور جب طلاق کے لئے بیوی کی طرف سے ترغیب دی گئی ہو تو اسے خلع کہتے ہیں۔

طلاق دینا بے شک ایک قسم کی بے وفائی ہے۔ شرع نے اس کو عمدہ سمجھ کر جائز نہیں رکھا بلکہ شرع نے صرف یہ بتایا ہے کہ اگر زن وشو میں مناسبت طبعی نہ ہو اور اس بے وفائی کے سوا دوسری کوئی صورت نظر نہ آئے تو یوں بے وفائی کرو۔ طلاق فی الواقع علاج ہے بہت سے امراض مہلکہ کا اور جہاں امراض پیدا ہونے پر اس کے علاج کی طرف رجوع نہیں کیا جاتا وہاں ایسے ایسے مہلک نتائج پیدا ہوتے ہیں کہ العظمۃ للّٰہ۔

خلع میں تو بے شک فریقین کی مرضی سے طلاق ہوتی ہے لیکن جب کبھی عورت کی مرضی کے خلاف مرد طلاق دیتا ہے تو بظاہر ایک بدنما صورت پیدا ہوتی ہے اور اسی بدنمائی کے روکنے کے لئے پہلے سے عورتوں کو دَین مہر کا حق دیا گیا ہے کہ وہ جتنا چاہیں مردوں پر بار عائد کرلیں کہ مردوں کو طلاق کی جرأت نہ ہو اور اگر خود عورتیں طلاق چاہیں تو مہر کا معاف کرنا نفاذ حق خلع میں بھی ان کو آسانی بہم پہنچائے۔

طلاق صرف مسلمانوں میں نہیں ہے۔ تمام دنیا میں طلاق جاری ہے جب سے دنیا میں شادی بیاہ قائم ہے طلاق بھی قائم ہے اور جب تک دنیا میں انسان رہیں گے اور ان میں بیاہ کا دستور قائم رہے گا تب تک طلاق کا وجود بھی قائم رہے گا۔ ہندوستان میں تو سب سے زائد طلاق کا رواج ہے۔ بیچارے غرباء کا تو ذکر نہیں لیکن امراء میں یہ بلا گھر گھر ہے۔ صغر سنی میں شادی ہوئی ہوش سنبھالنے

پر بیوی سے نفرت پیدا ہوئی اور پھر تمام عمر شاہدان بازاری سے یا اس سے بھی بری حالت میں دوسری قسم کی عورتوں سے تعلقات بے جا رہے اور بیوی سے کبھی دید و شنید بھی نہیں ہوئی گھر کی حفاظت کرنے اور کھانا پکانے کے لئے لونڈی نہ رہی ایک بیوی پڑی رہی اب ان بیویوں میں اور مطلقہ عورتوں میں کیا فرق ہے دوسرے ملکوں میں بھی کم وبیش یہ قاعدہ جاری ہے زن و شوہر میں سے ہر ایک سے دل بہلاؤ کی چھپی ہوئی صورت پیدا کرنی ایک کو دوسرے سے بالکل تعلق زناشوئی نہیں ہوتا لیکن برائے نام دوسروں کے دکھانے کو یہ تعلق تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ تو مہذب ملکوں کا دستور ہے غیر مہذب ملکوں میں جہاں عورتیں مردوں کے اختیار میں رہتی ہیں اور طلاق کا دستور نہیں ہوتا وہاں بجنسہٖ ہندوستان کی سی تہذیب کی پیروی کی جاتی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کا بھی یہی دستور تھا جب وہ ایک بیوی کو ناپسند کرتے تھے تو اسے چھوڑ کر دوسری لاتے تھے لیکن جسکو چھوڑتے اس کو گھر سے باہر نہیں جانے دیتے تھے۔ بلکہ ماماؤں کی طرح کام لینے کے لئے اس کو گھر میں رکھتے تھے۔ جو بیوی کل پلنگ سے نیچے نہیں اترتی تھی وہ آج نئی دلہن کے سامنے محض جھاڑو دینے اور کھانے کے برتن صاف کرنے سے تعلق رکھتی ہے کتنا برا نظارہ ہے۔ طلاق کے احکام مہذب کر کے اسلام نے بہت بڑا احسان عورتوں پر کیا کہ ان کو شوہروں کی قید ہی سے آزاد کرا دیا۔ احکام شرع جاری ہونے پر ہر عورت جس کو مرد چھوڑ دے قاضی کے سامنے درخواست دے سکتی ہے کہ اس کو شوہر کے گھر سے علیحدہ کر دیا جائے کہ کسی دوسرے سے وہ عقد کرے۔ مسئلہ طلاق ان احسانات میں شمار کیا جاتا ہے جو اسلام نے عورتوں کے ساتھ کئے ہیں۔

طلاق کا یہ قاعدہ ہے کہ جب تین طلاقیں ہو جائیں تو پھر عورتوں سے کسی قسم کا تعلق مرد نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ قومی تہذیب اور قومی زور کا اثر تھا۔ یہ نہیں کہ آج طلاق دی اور کل عورت نے دوسرا خاوند ٹھہرایا تو کہنے لگے کہ نہیں نہیں میں طلاق واپس لیتا ہوں مسلمانوں میں مطلقہ عورتوں سے پھر شوہروں کو کوئی تعلق نہیں رہتا۔ ہاں زن مطلقہ دوسرے کے نکاح میں رہے اور وہ بھی طلاق دے تو سابق شوہر دوبارہ نکاح اس سے کر سکتا ہے۔

طلاق واقع ہونے کے لئے تین مرتبہ طلاق دینا لازم ہے ایک ساتھ یا باری باری سے لیکن عمدہ صورت یہ ہے کہ ایک مرتبہ تین طلاقیں نہ دی جائیں۔ بلکہ ایک ایک مہینہ کے بعد ایک ایک طلاق دی جائے اور جب تین پوری ہو جائیں تو عورت مطلقہ سمجھی جائے تین طلاقیں ایک ساتھ اس لئے ناپسندیدہ ہیں کہ اس میں غور کرنے کا موقع کم ملتا ہے۔ غصہ کی حالت میں ممکن ہے

کہ طلاق ہو جائے اور پھر پچھتانا پڑے اس لئے شرع نے حکم دیا ہے کہ حتی الوسع سوچ سمجھ کر یہ کام کرو تو اچھا ہے کہ پھر افسوس نہ ہو۔

فریقین میں نااتفاقی ہو اور کسی طرح ایک دوسرے کو پسند نہ کرے تو علیحدگی سے اچھی کوئی صورت نہیں ہے۔ یہی ایک حکمت ہے اور یہی عین تہذیب ہے کہ آہستہ سے علیحدگی ہو جائے اور ہر ایک اپنا دوسرا بندوبست دنیاداری کا جھگڑا ایسا نہیں ہے کہ فریقین کی رضامندی کے بغیر بھی وہ امن وامان سے چلا چلے۔

ہندوستان میں طلاق دینے کا دستور نہیں ہے اگر ہے تو بس اس قدر ہے کہ عورت کو مرد نے چھوڑ دیا اور عورت لونڈی کی طرح گھر میں کام کر رہی ہے اور اس سے اچھی صورت ہو بھی نہیں سکتی جب تک عورتوں کا دوسرا بیاہ ناجائز ہے۔ لیکن یورپ میں طلاق ہے اور بعد طلاق کے فریقین کی دوسری شادیاں ہوتی ہیں اور پھر قسمت نے یاوری کی تو چین سے بسر بھی ہوتی ہے لیکن وہاں طلاق کا قانون ایسا خراب ہے کہ بڑی مشکل سے طلاق واقع ہوتی ہے۔

۱:- انگلستان میں زنا کوئی تعزیری جرم نہیں ہے۔

۲:- بیاہ کے بعد فریقین کی مرضی سے طلاق نہیں ہو سکتی بلکہ عدالت کی مرضی پر فریقین کا تفرقہ منحصر ہوتا ہے۔

۳:- بارہا ایسا ہوا ہے کہ فریقین نے طلاق حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن عدالت سے منظوری حاصل نہیں ہوئی۔

۴:- اکثر طلاق کی ڈگری عدالت سے اس حالت میں حاصل ہوتی ہے جبکہ فریقین کا یا ان میں سے ایک زناکاری کی حالت میں رہنا عدالت کے نزدیک ثابت ہو۔

۵:- طلاق حاصل کرنے کے لئے عدالت ہائے انگلستان میں ایک فریق دوسرے فریق کی زناکاری ثابت کرنے پر مائل ہوتا ہے اور کوشش ہوتی ہے کہ فریق ثانی کی بے عصمتی یا خود سائلہ کی بے عصمتی عدالت کے نزدیک عدم ثابت نہ رہے۔

بنگال کے ایک سابق لفٹنٹ گورنر کی صاحبزادی ایک پادری کے ساتھ انگلستان میں بیاہی گئیں نکاح کے واقعات معلوم نہیں ہوئے صرف اتنا معلوم ہوا کہ نکاح کے بعد ایک نے دوسرے کو ناپسند کیا۔ اگر دونوں مسلمان ہوتے تو کچھ بھی دقت نہ ہوتی۔ ناپسندیدگی پادری صاحب کی طرف سے ہوتی تو وہ طلاق دے سکتے تھے اور اگر بیوی صاحبہ کی طرف سے ناپسندیدگی تھی تو وہ امیر کبیر کی لڑکی تھیں دولت کے زور سے شوہر کو طلاق دینے پر راضی کر لیتیں اور اسی کا نام خلع ہے۔ لیکن

قانون انگلستان اسلامی قانون سے مختلف ہے یعنی اس اصول پر مبنی ہے جسکا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس میم صاحبہ کو طلاق حاصل کرنے کے لئے اپنی بدچلنی کا ثبوت عدالت کے اطمینان کے مطابق دینا لازم ہوا اور پادری صاحب کو بھی یہی راستہ اختیار کرنا ناگزیر ہوا۔ کسقدر مصیبت میں دونوں مبتلا ہوئے۔ سیدھی بات کو قانون نے خواہ مخواہ ٹیڑھا کر دیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یورپ کے قانون میں بڑی آزادی ہے لیکن اگر اسی کا نام آزادی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یورپ میں کچھ بھی آزادی نہیں ہے۔ مناکحت کا معاملہ اور اس میں اس درجہ خلاف عقل باتوں کو دخل ہو اور وہ بھی یورپ ایسے مہذب ملک میں تو ہم کو سخت حیرت۔ میم صاحبہ بدچلن ہوں یا نہ ہوں لیکن ملک کے قانون نے ان کو مجبور کیا کہ وہ ایسے شخص کی صحبت سے جس سے بُرا ان کے نزدیک کوئی دنیا میں نہ تھا چھٹکارا پانے کے لئے اپنی عصمت کو پبلک اور عدالت کے سامنے گئی گزری ثابت کریں۔ چند سال کا ذکر ہے کہ اخباروں میں طلاق کی کیفیت یوں شائع ہوئی کہ میم صاحبہ نے ایک چٹھی اپنے شوہر کے پاس لکھی کہ سچی اور سیدھی بات یہ ہے کہ میں ایک ایسے شخص پر فریفتہ ہوں جو میرے لئے سب کچھ ہے۔ اگر آپ اس پر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو فلاں شخص سے میرے مزید حالات دریافت کر لیجئے۔ اس چٹھی کے معنی یہ ہوئے کہ میں ناپاک حالت میں ہوں اور میری ناپاک حالت کو عدالت پر ظاہر کر کے آپ مجھ سے گلوخلاصی چاہتے ہوں تو میں آپکی مدد کے لئے یعنی اپنی برائیاں ظاہر کرنے کے لئے تیار رہوں۔

وہ چٹھی بامحض عورت کا اقبال کافی نہ تھا بلکہ جابجا سے اور بھی رسوائی کا ثبوت درکار تھا۔ غرض کہ چند تائیدی ثبوت اور بھی بہم پہنچائے گئے۔ جن ہوٹلوں میں میم صاحبہ رہ چکی تھیں وہاں کے رجسٹر دیکھے گئے۔ منیجر کے اظہار ہوئے اور یہ دکھایا گیا کہ اپنے نئے چاہنے والے کے ساتھ میم صاحبہ برابر زن وشو کی طرح رہتی ہیں۔ عدالت کو جب ثابت ہو گیا کہ فی الواقع میم صاحبہ زناکاری کی حالت میں رہ چکی ہیں۔ تب پادری صاحب کی گلوخلاصی کا حکم دیا گیا میم صاحبہ کا کھٹکا مٹا اور نئے چاہنے والے سے کل کارروائی کا خرچہ دلا یا گیا۔

اب آزادی کا زمانہ ہے۔ ہر جگہ عقل سے کام لیا جاتا ہے۔ مفصلۂ بالا حالات ظاہر کرنے کے بعد اس میں ذرا شبہ نہیں رہتا کہ اس بارے میں مسلمانوں کا قانون یورپ کی دیگر سلطنتوں کے قانون سے اچھا ہے۔

کیا ہم اس وقت اس کہنے سے باز نہیں نہیں رہ سکتے کہ، اے اونٹ پر چڑھنے والے اور ریگستان میں گھومنے والے امّی محض تجھ پر یقین کرنے والے تو تجھ کو خاص فیضان الٰہی کا ایک

ذریعہ سمجھتے رہیں گے۔ لیکن جو تجھ کو نہیں مانتے وہ بھی جب عقل سے کام لیتے ہیں تو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ تیری ذات بابرکات خلاصۂ موجودات کے ذریعہ سے جو شریعت قائم ہوئی اس کے احکام اس وقت تمام قوانین سے افضل ہیں۔

فصل نمبر ۲۱

کثرت ازدواج

آج کل یورپ میں کثرت ازدواج انتہائی بداخلاقی ہے اور بلاد اسلام میں بغیر اس کے اخلاقی خوبیاں قائم نہیں رہ سکتیں۔ یورپ میں ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری عورت سے ناجائز تعلق رکھنا کوئی جرم نہیں ہے محض بداخلاقی ہے۔ لیکن دوسرا بیاہ کر لینا جس کو وہاں کی اصطلاح میں پولی گیمی (POLYGAMY) کہتے ہیں ایک سنگین جرم ہے۔ یہ مسئلہ بہت زمانہ یورپ اور افریقہ کے ان سواحل میں زیر بحث رہتا ہے جہاں جانب مقابل میں یورپین آبادیاں واقع ہیں۔ یہ بحث وہاں خاص خاص لوگوں میں محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ طبقۂ عوام میں بھی اس قسم کے مباحثے ہوتے ہوتے ہیں۔ ایک فرانسیسی سیاح شام اور مصر کے شہروں میں سڑکوں پر رات کو روشنی کا انتظام نہ دیکھ کر حیرت سے پوچھتا ہے یہ کیسے شہر ہیں کہ ان میں رات کو روشنی نہیں ہوتی؟ ہوٹل کا مصری خانساماں جواب دیتا ہے "یہاں کے لوگ اپنے گھر میں ایسے خوش رہتے ہیں کہ ان کو رات کے وقت اپنے گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں رہتی اس لئے سڑکوں پر روشنی کا انتظام بھی کم کیا جاتا ہے یورپ میں لوگوں کے گھروں پر عیش و نشاط کے سامان مہیا نہیں رہتے اس لئے وہاں کے باشندے تھیٹر، سرکس، ناچ، میخانہ، قمار خانے کی سیر کے لئے رات بھر مارے مارے پھرتے ہیں اور ان کے لئے راستوں پر روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگ اپنی بیویوں میں ایسی خوشی سے بسر کرتے ہیں کہ ان کو ناحق کے چکر لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"
اس جواب میں وہ خانساماں اپنے طور پر جو کثرت ازدواج کی خوبیاں کہہ گیا خاص اسی کا حصہ تھا

بیان سادہ ہے لیکن مطلب سب ادا ہوگیا۔

اس مسئلہ پر اگر عالمانہ بحث کی جائے تو سب سے پہلے ان امور پر غور کر لینا چاہیئے۔

۱:۔گرم ملکوں میں فطرتاً کثرت ازدواج کی طرف توجہ زیادہ ہوتی ہے اور سرد ملکوں میں عموماً اس سے نفرت کی جاتی ہے۔قمریاں ہمیشہ اپنا جوڑا ساتھ رکھتی ہیں اور خروس کا طرز عمل اس بارہ میں بالکل جدا ہوتا ہے۔اسی طرح ملکی آب وہوا کے اثر سے انسانی طبیعت کے جذبات میں بھی زمین وآسمان کا فرق ہوجاتا ہے جن اقوام میں بغیر خورد ونوش کے افطار صوم ہوتا ہے انکی تمدنی حالت ان برفستان کے باشندوں پر قیاس نہیں کی جاسکتی جہاں ایام سرما میں نباتات کی قوت نمو بھی انسان کی قوت حاسہ کے ساتھ منسوب ہوجاتی ہے۔

۲:۔دنیا کے تمام حصوں میں عورتوں کی معمولی بیماریاں اور ان کے ایام حمل ورضاعت عورتوں کو مردوں سے اکثر جدا رکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔

۳:۔عورتوں کی قوت تناسل عموماً مردوں سے بہت پہلے ختم ہوجاتی ہے۔

۴:۔تمام ملکوں کی مردم شماری سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کی تعداد مردوں سے زائد ہے۔

ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد ذرا شبہ بھی نہیں رہتا کہ مثل قمریوں کے اپنی زندگی انسان بسر نہیں کرسکتا۔بہت سی صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک مرد کو چند عورتوں سے تعلق رکھے بغیر چارہ نہیں اس کے لئے دلیل وبرہان کی ضرورت نہیں ہے ہر ایک کو خود اس کا وجدان سمجھا سکتا ہے دنیا میں ایسی عورتیں بہت کم ہیں جن کو متعدد مردوں سے تعلق رہا ہو لیکن ایسے مرد بہت نکلیں گے جنکو متعدد عورتوں سے تعلق رہا ہو۔بلاد اسلام میں یہ تعلقات کثرت ازدواج کے جواز کی وجہ سے دوسری صورتیں رکھتی ہیں اور دیگر ممالک میں زناکاری کا پیرایہ اختیار کرکے دوسری حالتوں میں نمودار ہوتے ہیں۔لیکن نفس تعدد دونوں جگہ موجود ہے اور اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک مرد کو کئی عورتوں سے تعلق رکھنا انسانی فطرت میں داخل ہوگیا ہے۔قانون کا کام یہ نہیں ہے کہ جذبات انسانی مٹا دے بلکہ قانون کا صرف یہ کام ہے کہ جذبات انسانی کو جہاں تک ممکن ہو مہذب کرے۔اب اسلام نے ان جذبات کو یوں مہذب کیا کہ تعداد ازدواج کو روا رکھا لیکن چار منکوحہ بیویوں تک اسے محدود کردیا اور اس قانون کے توڑنے والوں کے لئے ابتدائی سزا تازیانہ اور انتہائی سزا قتل تجویز کی یورپ کی جدید تہذیب نے اسے یوں مہذب کیا۔کہ ابتدائی حالت میں یہ تعدد نامتناہی تعداد تک معاف رکھا اور آخری حالت میں صرف ایک

بیوی سے تعلق رکھنا محکوم ہے اور اس کی خلاف ورزی میں صرف زن و شو کا افتراق ممکن ٹھہرا دیا۔
لیکن ایک سے زائد بیویوں کو رکھنا کسی حالت میں جائز نہیں رکھا بلکہ اس کو جرم قابل سزا قرار دیا اب ناظرین
فیصلہ کریں کہ جذبات انسانی کو مہذب کرنے میں کس قانون نے زیادہ تر فطرت انسانی کا خیال رکھا ہے۔

اسلام کوئی قانون مختص الامر یا مختص المقام نہیں ہے۔ کئی مرتبہ کہا گیا اور اب بھی کہا جاتا ہے کہ یہ
تمام دنیا کے لئے بنایا گیا ہے اس میں زیادہ تر اصول سے بحث کی گئی ہے اور ہر موقع پر اور ہر مقام کے
متعلق اس میں سہولتیں رکھی گئی ہیں۔ اس میں ازدواج کے متعلق جو مسائل ہیں وہ کسی خاص قوم یا خاص ملک
کے لئے نہیں ہیں۔ عرب اور افریقہ کے ریگستان اور قطب شمالی کے برفستان ان دونوں کے لئے ایک ہی
قانون ہے۔ جو مسئلہ اس قوم کے لئے ہے جہاں پولی گیمی یعنی کثرت ازدواج کا رواج ہے وہی ان اقوام
کے لئے بھی ہے جہاں اس کے برعکس پولی انڈری یعنی کئی مردوں میں ایک عورت کے رہنے کا دستور
تھا اور شاید اب بھی کہیں کہیں پہاڑی ملکوں میں ایسا ہوتا ہے۔ نوجوانوں اور بوڑھوں۔ ضعیفوں اور
تندرستوں۔ مفلسوں اور مالداروں، مزدوروں اور بادشاہوں سب کے لئے ایک ہی قانون ہے دنیا
میں سب کی حیثیتیں یکساں نہیں ہیں بعض تو ایسے ہیں کہ ان کے لئے ایک بیوی سے بیاہ کرنا بھی داخل
معصیت ہے اور کتنے ایسے ہیں کہ چار بیویاں ہوں تو وہ چاروں کے ساتھ عدل کر سکتے ہیں اور ان
چاروں کو خوش رکھ سکتے ہیں ان تمام امور کے لحاظ سے قرآن کی سورۂ نساء رکوع اول میں محکوم ہے۔

' اپنی مرضی کے مطابق دو تین چار عورتوں سے نکاح کر لو لیکن اگر تم کو اس بات کا اندیشہ
ہو کہ کئی بیویوں میں برابری کا برتاؤ نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی کر دیا جو لونڈی تمہارے قبضہ میں
ہے اسی پر قناعت کرو۔ بے انصافی سے بچنے کے لئے یہی تدبیر قرین مصلحت ہے [1]

اس آیت میں عورتوں کے حقوق کا زیادہ تر لحاظ رکھا گیا ہے اور انہیں کے فائدے کیلئے
یہ منصوص ہوا ہے۔ مردوں کے حقوق کا بڑھانا اور عورتوں کے حقوق کا گھٹانا ہرگز اس سے مقصود نہیں ہے۔

اس آیت سے صریح ظاہر ہے کہ ایک بیوی سے زائد کی اجازت کن شرطوں اور قیدوں سے گھری
ہوئی ہے بے شک مستحسن ہے ایک بیوی کا کرنا لیکن ان عدل کرنے والوں کے لئے یہ استحسان نہیں ہے
جن کو بغیر چند بیویوں کے اطمینان قلب جس پر دونوں جہاں کی کامیابیوں کا مدار ہو سکتا ہے بیویوں
میں عدل قائم رکھنے کا مفہوم آئندہ ازواج مطہرات نبیؐ کے بیان میں درج کیا جائے گا۔

---

[1] فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلٰث وربٰع فان خفتم الا تعدلوا فواحدة او ما ملکت ایمانکم ذٰلک ادنیٰ الا تعولوا.

ان تمام امور کے ساتھ ہم یہ بھی کہیں گے کہ بعض اقوام کا تمدن کثرت ازدواج کے لئے مناسب نہیں ہے مثلاً ہندوؤں میں کثرت ازدواج جائز ہے لیکن بہ لحاظ ان کے طریقہ تمدن کے جائز نہیں ہونا چاہئے ان کے یہاں جو حالت زناشوئی ہے یا انکی عورتیں جس طور سے رہتی ہیں اس پر کثرت ازدواج کا مستزاد کرنا بیچاری عورتوں کی حالت زار سے بالکل فراموشی کرنا ہے۔ انکو کچھ مہر نہیں ملتا۔ میکہ کے تعلقات بالکل قطع ہو جاتے ہیں۔ مردوں پر ان کا کچھ دباؤ نہیں ہوتا۔ طلاق لے کر وہ عقد ثانی نہیں کرسکتیں یہاں تک کہ شوہر کے مرنے پر بھی وہ دوسرا بیاہ نہیں کرسکتیں۔ ان تمام مجبوریوں کے ساتھ اتنا اور مستزاد ہوا کہ شوہر دوسری بیویاں لائے اور اب سابق بیویوں کو بجز لونڈیوں کی طرح جھاڑ دینے کے اور برتن مانجھنے کے اور کوئی تعلق نہ رہا یا شوہر نے کچھ انسانیت کو راہ دی تو اناج کی کوٹھریوں کی کنجیاں ان کے پاس رہنے دیں تو اس طرح لونڈیوں سے بڑھ کر ماماؤں کی سی حیثیت قائم رہی۔ بہر حال ہندوؤں کا تمدن کثرت ازدواج کے لئے بالکل نامناسب ہے اور اسی طرح جن مسلمان گھروں میں تمام امور متعلقہ ازدواج میں رسم ہنود کی پیروی ہے وہاں بھی کثرت ازدواج ضرور ایک اخلاقی جرم ہے۔ جن لوگوں نے مسلمان ہو کر کثرت ازدواج کے خلاف رسالے لکھے ہیں اگر وہ اپنے رسالے میں اتنا اور بڑھا دیتے کہ مسلمانان ہند کی تمدنی حالت کے اعتبار سے کثرت ازدواج درست نہیں ہے تو ٹھیک ہوتا۔ کوئی قانون اچھے سے اچھا ہو جب تک اس کے تمام اجزا پر عمل نہ کیا جائے وہ مفید ثابت نہیں ہو سکتا لیکن جن لوگوں نے اس نازک فرق کو سمجھے بغیر نفس کثرت ازدواج کو برا بتایا ہے اور حدیث اور قرآن کے معنوں میں تاویلیں کر کے اسلام کا رکھ رکھاؤ کیا ہے سخت غلطی کی ہے۔ میں نہایت ادب سے ان کی تحریروں کی نسبت یہ لکھوں گا کہ تمدن اسلام کی صورت ان کے ذہن میں نہ تھی اور جو چیز کہ انھوں نے بری بتائی ہے فی الواقع وہ نہایت اچھی ہے۔ انھیں تحریروں کا نتیجہ ہے وہ کتاب جو لاہور میں کثرت ازدواج کے متعلق عیسائیوں کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور جس میں خود ہماری قوم کے پیشواؤں کی تحریریں ہمارے لئے مضر ثابت ہوئی ہیں۔ ہم ایک طرف کثرت ازدواج کو برا سمجھ کر اس کی برائیاں دکھاتے ہیں اور اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کثرت ازدواج مسلمانوں میں جائز ہے مگر بدترین عمل سمجھا گیا ہے اور دوسری طرف وہ کتاب والا دکھاتا ہے کہ پیغمبر خدا نے وفات کے وقت گیارہ ازواج مطہرات چھوڑیں اور تمام صحابہؓ کبار کے پاس بھی قریب قریب بلا استثناء کے متعدد بیویاں تھیں تو گویا خود ہمارے قول سے پیغمبرؐ خدا اور صحابہؓ پیغمبر بدترین اعمال کے مرتکب ہوئے یہ سب خرابیاں صرف اس لئے پیدا

ہوئیں کہ تمدن عرب یا زنا، نکاح، طلاق، خلع کے اصول سے ہم ناواقف ہیں جس زمانہ میں امہات المومنین شائع ہوئی دو کاپیاں بے طلب میرے پاس آئیں اور میں نے انھیں الماری میں بند کر دیا کسی مسلمان کو دیکھنے نہیں دیا۔ لوگوں کے مانگنے پر میں صرف یہ کہتا تھا کہ جب تک تمدن عرب کا نقشہ ذہن میں نہ ہو گا اس کتاب کا پڑھنا گمراہی کا سبب ہوگا۔ اسی وقت ایک جگہ تذکرہ ہوا کہ فلاں شخص اس کا جواب لکھنے والا ہے اس شخص کی نسبت مجھے بڑی عقیدت تھی۔ میں انھیں بڑا ادیب بڑا ذہین اور محب اسلام سمجھتا تھا لیکن باوجود اس کے میں نے اپنا خیال یہ ظاہر کیا کہ وہ اس کا جواب نہیں لکھ سکتے۔ لوگوں کے پوچھنے پر میں نے کہا کہ چالیس برس کے سن میں انکی بیوی نے انتقال کیا اور انھوں نے باوجود فارغ البالی کے دوسرا بیاہ نہ کیا جو شخص ایک بیوی کا رکھنا بھی پسند نہ کرے وہ ایک سے زیادہ بیویوں کی مصلحتیں نہیں سمجھ سکتا علاوہ بریں انھوں نے اپنے بیاہ کی فکر کبھی نہ کی لیکن اپنے بیٹے کے بیاہ میں اس نے بے انتہا زحمت اٹھائی جو شخص بجائے اپنے بیاہ کے بیٹوں کے بیاہ کیلئے تمام دنیا کی زحمتیں مول لے وہ کثرت ازدواج کے متعلق جو ان خیالات سے بالکل ہی جدا تمدن پر مبنی ہے کوئی دلچسپ مضمون نہیں لکھ سکتا۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اب میں اصل مضمون کی طرف غور کرتا ہوں اور دو مہذب قوموں کے درمیان میں محاکمہ کرتا ہوں۔ مسلمان اپنی تہذیب کے زمانہ میں کسی طرح یورپین قوموں سے کم نہ تھے اور کثرت ازدواج جائز رکھتے تھے اور عیسائی اپنے زمانہ تہذیب میں اسے جرم قرار دیتے ہیں۔ میں ان دونوں قوموں کو اپنی اپنی جگہ پر حق بجانب پاتا ہوں اور یہ قول فیصل سناتا ہوں کہ جو تمدن عربوں کا تھا اس کے لحاظ سے کثرت ازدواج کا جائز ہونا عین تہذیب ہے لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ کس کا تمدن اچھا ہے تو میں بے تکلف کہوں گا کہ مسلمانوں کا۔ اور وجہ پوچھی جائے تو میں کہوں گا کہ یہ کل کتاب شروع سے اخیر تک پڑھی جائے تو وجہ سمجھ میں آجائے گی۔ کیونکہ یہی اس کتاب کا موضوع ہے۔ تمدن نام ہے عادت، رسم اور قانون ملکی کے مجموعہ کا۔ اور اس کتاب میں میرا مقصد مسلمانوں کے تمدن کو تمام دنیا کے تمدن پر فائق ثابت کرنا ہے اس لئے اگر یہ سوال ہو کہ اس زمانہ کی مہذب قوموں کا تمدن سابق مسلمانوں کے تمدن سے اچھا ہے تو میرا جواب ہو گا۔ نہیں۔ اور اگر یہ سوال ہو کہ یورپ کے موجودہ تمدن کے لحاظ سے کثرت ازدواج کا جرم قرار پانا کیسا ہے تو میں کہوں گا بہت مناسب اور اگر یہ پوچھا جائے کہ جن ممالک میں اسلام کے تمام قوانین پر عمل ہو وہاں کثرت ازدواج مناسب ہے؟ تو میں کہوں گا یقیناً مناسب ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ کثرت ازدواج اور دستور طلاق سے تمدنی حالت انسان کی خراب ہو جاتی

ہے۔ مفصلۂ بالا تقریر پڑھنے کے بعد شاید کوئی سمجھدار یہ نہ کہے گا کہ مسائل شرع ان امور کے متعلق تمدن انسانی کے بگاڑنے والے ہیں۔ دلیل و برہان سے جن کی پوری تشفی نہیں ہوتی ان کے لئے ہنری ہشتم شاہ انگلستان کے حالات سمجھنے کو کافی ہوں گے ہنری ہفتم نے تخت پر بیٹھنے کے بعد اپنے برادر متوفی کی بیوی ملکہ کیتھرائن سے بیاہ کیا۔ یہ بیاہ زیادہ تر اس شان و شوکت کا نتیجہ تھا جو کیتھرن کو اس کے شوہر کے زمانہ میں حاصل تھی عرصہ تک کیتھرن کے ساتھ رہ کر بادشاہ اس سے سیر ہو گیا تو ایک نوجوان لڑکی "اینی بولین" پر فریفتہ ہوا۔ اس زمانے میں آجکل کی طرح زناکاری کا رواج نہ تھا ورنہ معاملہ یہیں تک رہ جاتا۔ اور نہ کثرت ازدواج یا طلاق کا دستور تھا کہ کیتھرن کے ہوتے ہوئے یا کیتھرن کو طلاق دے کر اینی کے ساتھ بادشاہ دوسرا بیاہ کر لیتا۔ کثرت ازدواج کا تو رواج ہی نہ تھا اور طلاق کے لئے شرطیں اتنی تھیں کہ بادشاہ کے اختیار میں وہ بھی نہ تھا بادشاہ نے پوپ روم سے مدد چاہی اور یہ درخواست کی کہ پوپ بطور مذہبی پیشوا کے کیتھرن سے جدائی کرا دے اور اب تک جو تعلق کیتھرن سے تھا اسے ناجائز قرار دے یا دوسرے لفظوں میں یہ قرار دے کہ اب تک کیتھرن بطور مدخولہ کے تھی منکوحہ نہ تھی تاکہ اینی کے ساتھ بیاہ ہونے میں کوئی امر مانع نہ ہو۔ دیکھئے گھر کا جھگڑا کہاں پہنچا اور کس بری طرح پہنچا۔ کیتھرن نے اپنی توہین پسند نہ کی اور اس کے خلاف کوشش کی۔ کیتھرن کا بھتیجا چارلس اسپین اور جرمنی کا بادشاہ تھا اٹلی میں بھی اس کا بہت اثر تھا پوپ کو کیتھرن کے خلاف حکم دینے کی جرأت نہ ہوئی اور ادھر شاہ ہنری سے اُسے یہ ڈر تھا کہ اگر میں اس کا کہنا نہ مانوں اور یہ میرے مذہبی اثر سے خود کو الگ کر کے پراٹسٹنٹ ہو جائے جب بھی برا ہو گا۔ عرصہ تک پوپ لیت و لعل کرتا رہا اور بالآخر انگلستان میں ایک کمیشن تحقیقات کے لئے بٹھایا گیا اور وُلسے وزیر انگلستان کو بھی اس کمیشن کو ممبر بنایا گیا۔ کمیشن نے بادشاہ کے خلاف رپورٹ دی جسکی وجہ سے بادشاہ بہت رنجیدہ ہوا اور خود کو پوپ کی ماتحتی سے آزاد کر کے انگلستان کا الگ آرچ بشپ تھامس کرامر کو مقرر کیا اور وزیر کو بے وفائی کے الزام میں موقوف کر کے اسکی تمام جائداد ضبط کر لی اور اس کے بعد بلوہ کے الزام میں اسے ماخوذ کر کے اسکی طلبی کی اور وہ راستہ میں بیمار پڑ کر مر گیا۔ اب انگلستان کی عجیب کیفیت تھی کہ جو کیتھرن کو منکوحہ کہتا قتل کیا جاتا اور جو اسے بادشاہ کی مدخولہ کہتا تھا اس کا درجہ بڑھا دیا جاتا تھا۔ گویا تمام انگلستان میں خوشامدیوں کا راج اور صاف گویوں کی تباہی تھی اس تباہی میں اس وقت تھامس مور ایک بہت بڑا محب وطن اور خدا ترس بھی آ گیا تھا جب گردن مارنے کے لئے یہ تختہ دار پر چڑھایا گیا تو اس نے کہا کہ اتر آنا میرے اختیار میں ہے نہ کہ میں خود کو اوپر ہی محفوظ پاتا ہوں

اور جب گردن مقتل پر رکھی گئی تو اس نے داڑھی نیچے سے نکال لی اور بولا کہیں یہ نہ کٹ جائے قصور میں نے کیا ہے یہ بے قصور رہے۔ اب آگے اور سنیئے۔ بادشاہ کو اپنی کا چال چلن پسند نہ آیا اور کیتھرن کے معاملہ سے بادشاہ گھبرا چکا تھا اس لئے اپنی کو منہ سے طلاق دینے کی بجائے اس نے تلوار سے طلاق دی اور فوراً تیسری بیوی جین سے عقد کر لیا۔ جین اپنی موت سے مری اس کے بعد بادشاہ نے ایک جرمنی عورت اینی آف کلیوس سے بیاہ کیا یہ عورت بھدی تھی اور بادشاہ کو پسند نہ آئی اب قانون بنانا بادشاہ کے اختیار میں تھا۔ بادشاہ نے بے کھٹکے اسے طلاق دیدی اینی آف کلیوس بادشاہ کی پوری داستان گھر سے سن کر چلی تھی وہ چپکے سے اپنا طلاق نامہ پاکر غنیمت سمجھی۔ اور اس سمجھ کی وجہ سے بہت بڑی پنشن بادشاہ سے پائی اور جب تک زندہ رہی امن سے رہی۔ لیکن کرانول وزیر جس نے ایسی بھدی عورت سے بادشاہ کو پھنسانا چاہا تھا اپنا سر دیکر بادشاہ کے عتاب سے چھوٹا بادشاہ نے پھر پانچویں شادی کیتھرن ہاورڈس سے کی اور اس کو بھی قتل کیا پھر چھٹا عقد کیتھرن پار سے ہوا جس نے اخیر تک ساتھ دیا۔ بادشاہ کے جوش اور ولولے کم ہو چلے تھے ورنہ اس کو بھی جینا نصیب نہ ہوتا۔ جہاں طلاق کی جگہ پر قتل رائج ہو وہاں بے چاری عورتوں کا کیا بس چلے۔ مفصلہ بالا واقعات سے بخوبی سمجھ میں آگیا کہ طبیعت کا جوش انسان کے دبانے سے نہیں دبتا کثرت ازدواج اور طلاق اسی جوش کے دبانے کے لئے شرع میں موضوع ہوئی۔ اگر ان سے لاپروائی کی جائیگی تو ہنری ہشتم کے محلوں کا نقشہ ہر با اختیار گھر میں نظر آئے گا یا وہ صورت دکھائی دے گی جو رینالڈ کے ناولوں میں ہے۔ جن گھروں میں زن ہے دولت ہے اختیار ہے جسمانی قوت ہے اور پھر یہ باتیں نہیں ہیں۔ اور یورپ میں ایسے بھی ضرور ہیں تو وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

بعض آدمی یہ کہتے ہیں کہ پولی گیمی کے ساتھ پولی انڑی بھی روا رکھی جائے تو پورا انصاف ہو جہاں ایک مرد کئی عورتیں رکھتا ہے۔ وہاں ایک عورت بھی ایک ساتھ کئی خاوند رکھ سکے تو کیا برا ہے اگر محض عیش ونشاط کے لئے مردوں کو کئی بیویوں کا رکھنا روا ہوتا تو بے شک عورتوں کو بھی یہ اجازت ہوتی کہ وہ کئی خاوند رکھیں لیکن کثرت ازدواج ہرگز عیش ونشاط کے اصول پر روا نہیں رکھا گیا ہے۔ گو اس کے ذریعہ سے حصول نشاط بھی ممکن ہے بلکہ اس کا جواز محض اس لئے ہے کہ وہ فطرت انسانی کے مناسب ہے اور جس طرح پولی گیمی فطرت انسانی کے موافق ہے اسی طرح پولی انڑی فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ جو دلیلیں پولی گیمی کے جواز کی ہیں وہی دلیلیں

پولی انڈری کی ناجوازی کی ہیں اس لئے صریح ظاہر ہے کہ ایک ساتھ دو اضداد کا جمع ہونا بودی سے بودی شریعت میں بھی جائز نہیں ہو سکتا پولی انڈری بے شک کسی زمانے میں جا بجا رائج تھی لیکن بہت کم اور اب تو نہایت ہی کم ہو گئی ہے لیکن کبھی کسی مہذب قوم میں اس کا رواج نہ تھا اور اگر تھا تو قومی شعار نہ تھا شخصی حالت تھی اگر مہذب قوم کے چار پانچ اشخاص کسی حسن فروش عورت سے - یا کسی عزت دار عورت سے کسی خاص حالت میں مشترک تعلق رکھیں تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس قوم میں یہ دستور مروج ہے ابتدائے خلقت میں بہت سی ایسی باتیں تھیں جو کسی اصول پر مبنی نہ تھیں محض تن آسانی کی وجہ سے جائز تھیں - لوگ مچھلیاں پکڑ کر کچی کھا جاتے تھے - بجائے اناج کے درختوں کی پتیاں اور پھل کھاتے تھے - پتوں سے جسم چھپاتے تھے - غاروں میں گھس کر سردی اور گرمی سے اپنے جسم بچاتے تھے - اسی طرح اگر شروع زمانے میں کہیں یہ رواج ہو کہ بمقتضائے کہولت ایک ہی عورت پر کئی مرد قناعت کریں تو یہ بمقتضائے فطرت انسانی نہ تھا بلکہ ایک قسم کی خلاف فطرت تن آسانی تھی -

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مردوں کے لئے کثرت ازدواج زحمت ہے - بیشک اس شخص کے لئے جو ایک بیوی کا بھی بار نہیں اٹھا سکتا اسے کئی بیویاں کرنا ضرور زحمت ہے - لیکن معلوم رہے کہ ایسوں کے لئے کثرت ازدواج محکوم نہیں ہے - صفراوی مزاج کو میٹھا کھانا مضر ہو تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شرع نے مٹھائی کو حلال قرار دینے میں غلطی کی ہے دودھ سے اگر نزلہ پیدا ہو تو دودھ کی لطافت میں کوئی کمی نہ آئے گی بلکہ کھانے والے کی غلط فاسد پر الزام عائد ہو گا - کھانا کھانا باعث حیات ہے مگر اس کے لئے نہیں جو ہیضے میں مبتلا ہے اسی طرح کثرت ازدواج اسی کے لئے زیبا ہے جو ہر ایک بیوی کے لئے جدا جدا گھر رہنے کے لئے اور وافر خرچ بسر اوقات کے لئے دے سکے اور خود میں یہ قابلیت پائے کہ اپنے منصفانہ برتاؤ سے ہر ایک کو راضی رکھ سکے اور جن کے پلے ٹکا نہیں ہے اور نہ دل میں خیال حمیت ہے اس کے لئے دو بیبیوں کا کرنا غیر مستحسن ہے - مثلاً جب ایک بیوی گھر میں تھی تو دو مامائیں کام کرتی تھیں جب ایک اور آئی تو ایک ماما تخفیف کر دی گئی اور تیسری بیوی آئی تو دوسری ماما بھی موقوف ہو گئی اب پہلی بیویاں کوٹتی پیستی کھانا پکاتی ہیں گھر میں جھاڑو دیتی ہیں اور نئی بیاہی دلہن پلنگ پر چڑھی بیٹھی ہے - ایسے بے حمیت خاوند کے لئے کثرت ازدواج ضرور باعث زحمت ہو گا اور ایسوں کے لئے تو کثرت ازدواج موضوع بھی نہیں ہے - انھیں کی شان میں سورۂ نساء رکوع اول میں ہے -

• اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ کئی بیویوں میں برابری کا برتاؤ نہ کر سکو گے۔ تو ایک ہی بیوی کرو۔[1]

غرض کہ جو شخص کثرت ازدواج کی استطاعت رکھتا ہے۔ ضرورت رکھتا ہے اور انصاف بھی کر سکتا ہے۔ اس کے لئے کثرت ازدواج ہرگز زحمت نہیں ہے بلکہ عین راحت ہے۔ جیسا کہ شروع شروع مصری مسلمان کا جواب زیب عنوان کیا گیا ہے اور اگر فرض کر لیں کہ کثرت ازدواج میں زحمت ہے اور نفس زحمت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تو یہ زحمت موجب تکلیف نہیں ہے۔ جتنا ہی تعلقات دنیوی بڑھیں گے ان کے ساتھ زحمتیں بھی ضرور بڑھیں گی۔ جس کے پاس صرف ایک گھوڑا سواری کا ہے اسے بہ نسبت اس شخص کے جس کے پاس ۲ دو گھوڑے ہیں ضرور کم زحمت ہے اسی طرح بیویوں کے بڑھنے سے ضرور زحمت بڑھتی ہے لیکن یہ زحمت ان خبیث نتائج سے بدرجہا بہتر ہے جو زنا کاری سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ پہلے کہا گیا ہے کہ کثرت ازدواج محض زنا کاری سے بچنے کے لئے موضوع ہے۔ ورنہ جو حضرات اپنی حالت کے اعتبار سے ایک بیوی پر قناعت کر سکتے ہیں ان کو دو بیویاں کرنا بیکار ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جہاں کثرت ازدواج ہے وہاں عورتیں خوش نہیں رہتیں۔ لیکن یہ غلطی ہے۔ عورتیں خوش رہتی ہیں مردوں کے اچھے سلوک سے۔ ایک شخص نے صرف ایک بیوی سے عقد نکاح کیا لیکن اسے زنا کاری اور شراب خواری سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ اپنی بیوی سے کبھی مل سکے اور اس کے پڑوس میں ایک دوسرا شخص ہے جس کے پاس چار بیویاں ہیں لیکن وہ سوائے چار کے کسی پانچویں عورت کی طرف نظر بد سے دیکھنا حرام مطلق جانتا ہے اور باری باری سے ہر بیوی کے گھر چوتھے روز آتا ہے اور نہایت حسن سلوک سے پیش آتا ہے۔ اس کے یہاں نہ تو شراب خواری کا چرچا ہے نہ کسی اور منہیات سے اس کو تعلق ہے۔ عوارض جسمانی سے وہ بالکل مبرا ہے اور صحت اس کی نہایت اچھی حالت میں ہے اب یہ عورت جو اپنے خاوند کی تنہا بیوی ہے صرف دیکھنے کو ہے لیکن فی الواقع بیوہ کے حکم میں ہے۔ کہیں زیادہ خراب زندگی بہ نسبت اس عورت کے بسر کرتی ہے جس کے خاوند کی چار بیویاں ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس بدبخت عورت کے پاس شوہر آنا چاہتا ہے اور یہ چاہتی ہے کہ شوہر اپنے امراض متعدی اور خباثت نفس کے ساتھ الگ ہی رہے تو اچھا۔ میرے کہنے کا یہ مطلب یہ نہیں ہے کہ عورتیں اپنی سوتنوں کو ناپسند نہیں کرتیں وہ ضرور ناپسند کرتی ہیں لیکن اگر کوئی عورت ایسے شخص کے ساتھ اتفاق سے بیاہی گئی جو اپنی فطرت میں ایک عورت پر قناعت

---

[1] وان خفتم الا تعدلوا فواحدۃً۔

کرنے والا نہیں ہے تو اس عورت کے خوش نہ ہونے کی صرف یہ صورت ہے کہ وہ اپنے مرد کے ناجائز تعلقات چھڑوانے کے لئے جائز طور پر اس کا کسی عورت سے عقد کروا دے اور اس طرح غیر متناہی مصائب کا سد باب کرے۔

بعض اکابر اسلام کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس بہت سی بیویاں تھیں اور بہت سی بیویوں کو انھوں نے طلاق دی۔ شاید کسی مسلمان کا یہ فرض نہ ہوگا کہ وہ تمام اکابر دین کی عصمت ثابت کرے۔ ہم کو بحیثیت مسلمان کے صرف یہ لازم ہے کہ جب تک ہم اسلام پر قائم رہیں اس کی خوبیاں سمجھتے رہیں اور جو کوئی سمجھنا چاہے تو سمجھا دیں اور اعتراض کرے تو اس کی تشفی کر دیں لیکن اصول اسلام کی مزید توضیح کے لئے اس موقع پر یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ اکابر اسلام فرشتہ نہ تھے انسان تھے انسان کتنی ہی خوبیاں رکھتا ہو پھر بھی وہ انسان ہے اور انسان کی تمام خصلتیں رکھتا ہے اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ مختلف آدمیوں میں قوتوں کی کمی بیشی مختلف درجہ میں ہوتی ہے کسی میں غصہ زیادہ ہے اور کسی کا حلم بڑھا ہوا ہے کوئی زیادہ کھاتا ہے اور کوئی کم کھاتا ہے۔ ایک شخص ایک کوس بھی پاپیادہ نہیں چل سکتا اور ایک ہے کہ منزلوں چلا جاتا ہے اور نہیں تھکتا ایک شخص سردی اور گرمی ذرا بھی نہیں برداشت کر سکتا اور اسی کے بھائی جیٹھ بیساکھ میں پہاڑ سے پتھر ڈھولاتے ہیں اور ماگھ پوس میں پہاڑوں کی چوٹیوں سے لکڑیاں کاٹ لاتے ہیں کوئی ایک سیر بوجھ نہیں اٹھا سکتا اور کوئی منوں بوجھ پیٹھ پر لاد کر ٹٹو کی طرح پہاڑوں پر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک کو آواز خوش سب سے زیادہ مرغوب ہے دوسرا آب خنک کا شیدا ہے۔ کسی کو گھوڑے کا شوق ہے کسی کو کشتی لڑنے کی لت ہے۔ عورتوں کی باتوں سے کسی کا جی الجھتا ہے اور کوئی چاہتا ہے کہ سوا عورتوں کے کوئی اس کے پاس نہ آئے۔ غرض کہ مختلف طبیعتیں ہیں اور مختلف مذاق ہیں یہ فیصلہ کرنا کہ کون سا مذاق اچھا ہے نہایت مشکل ہے۔ ہر شخص اپنے ہم مذاق اور ہم خیال کا طرفدار ہوگا۔ اسلام کا یہ کام ہرگز نہیں ہے کہ وہ کسی کا مذاق بدل دے یا جذبات انسانی کو مٹا دے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ ان جذبات میں جہاں تک ممکن ہو تہذیب اور اعتدال پیدا کرے اگر کوئی بیمار عورتوں سے دور رہے تو کوئی صفت نہیں ہے صفت اس تندرست کی ہے جس کو عورتوں کی طرف فطرتاً خاص کشش ہے لیکن وہ اس کشش کو خلاف تہذیب یا غیر معتدل حالت میں نہیں رکھتا۔ جن اکابر اسلام پر کثرت ازدواج کا الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ برفستان کے رہنے والے نہ تھے بلکہ عرب کے رہنے والے تھے ان کے لئے کثرت ازدواج کوئی الزام نہیں ہو سکتا اگر ان بزرگوں کی نسبت کوئی یہ دکھا دے کہ لڑکپن سے مرنے تک

انھوں نے کبھی کسی غیر عورت کو نظر بد سے دیکھا۔ کبھی اپنی عورتوں میں انھوں نے خلاف عدل کیا یا کسی طرح ان کو ناخوش رکھا تو ضرور انکی بزرگی میں فرق آتا ہے۔ لیکن کوئی ایسا نہیں کہتا ہے اور نہ ایسا کہہ سکتا ہے۔ رہا کثرت ازواج یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ حضرت داؤد پیغمبر اور حضرت سلیمان پیغمبر ان سے قبل حضرت ابراہیم پیغمبر کے متعدد بیویاں تھیں۔ ہندوستان میں سری کرشن چندکی گوپیاں مشہور ہیں۔ راجہ دسرتھ ایسے برگزیدہ راجہ کی کئی بیویاں تھیں۔ میرے نزدیک تو جو شخص صحیح وسالم ہو اور دولت وثروت رکھتا ہو اس کے لئے کئی بیویوں کا ہونا اس کا ثبوت ہے کہ وہ چھپ کر ناجائز تعلقات رکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ حضرت امام حسنؓ کی نسبت بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بہت سے بیاہ کئے ہم کو حضرت امام حسنؓ کی ذاتیات سے تو ہرگز بحث نہیں ہے۔ ہم کو صرف اسلام کے مسائل کی خوبیاں بیان کرنا ہے اور اس لئے حضرت امام حسنؓ کی ذات کو ہم نہایت اچھا نمونہ اسلام کی خوبیاں دکھانے کے لئے قائم کر سکتے ہیں۔ حضرت امام حسنؓ شاہ عربؐ کے نواسے تھے۔ خلفائے ثلاثہ کے وقت میں وہ بے انتہا دربار خلفاء میں پیارے تھے اور محترم سمجھے جاتے تھے۔ حضرت علیؓ کے زمانے میں شہنشاہ عالم کے ولی عہد نہیں تو خلف اکبر تو تھے اور آخر میں چھ مہینے کے لئے تمام ممالک شرقی کے دکوفہ سے سرہند اور ماوراءالنہر تک شہنشاہ تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں عورتوں سے موانست رکھنے کی خواہش بہت زیادہ تھی۔ جہالت عرب کا زمانہ عین ان کے ماقبل گزرا تھا اب ناظرین یوں غور کریں کہ اگر اسلام نہ پھیلتا تو معلوم نہیں حضرت امام حسنؓ اپنی اس خاص قوت کی وجہ سے جو فطرت نے ان میں ودیعت کی تھی اس بارہ میں کہاں تک آزاد ہوتے۔ لیکن یہ خاص اسلام کی برکت ہے کہ حضرت امام حسنؓ ایسے شخص نے مسائل اسلام کے لحاظ سے اپنی قوت شہوانی کو اسدرجہ مہذب اور معتدل رکھا کہ تمام عمر کوئی فعل ان سے ایسا سرزد نہیں ہوا جو بد تہذیبی کا کیا ذکر اعلیٰ درجہ سے بھی گرا ہوا ہو۔ طلاق انھوں نے بہت سی عورتوں کو دی لیکن کسی سے بے وفائی نہیں کی طلاق کے وقت بڑی بڑی رقمیں علاوہ مہر کے وہ محض مطلقات کو انکی دلجوئی کے لئے دیتے تھے جو لڑکے ان کے تھے انکی پرورش وپرداخت میں بے حد اخلاق اور محبت صرف کرتے تھے۔ جو عورتیں ان کے نکاح میں آتی تھیں وہ سمجھ کے آتی تھیں کہ نکاح کو زیادہ پائیداری نہ ہوگی سب لوگ جانتے تھے۔ خود حضرت علیؓ کہا کرتے تھے کہ بڑے صاحبزادے طلاق دینے میں بے باک ہیں لوگ سمجھ بوجھ کر اپنی لڑکیاں دیں۔ لیکن وہاں کا طرز تمدن ایسا تھا کہ لوگ اس کو معیوب نہیں سمجھتے تھے اور امام حسنؓ میں دوسری خوبیاں اتنی زیادہ تھیں کہ چند روزہ تعلق بھی لڑکیاں اور لڑکیوں کے اولیاء

مغتنم سمجھتے تھے۔

آنحضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی کئی ازواج مطہرات تھیں۔ آنحضرتؐ میں تمام قوتیں مکمل اور معتدل حالت میں مخلوق تھیں انکی کثرت ازداج کے اسباب بالکل وہی نہیں ہیں جو اوپر بیان کئے گئے دوسرے مصالح اور دوسری ضرورتیں بھی باعث تھیں۔ یہ ایک جدا بحث ہے۔ فصل نمبر ۴۳ کتاب ہذا میں اس کا مفصل طور سے ذکر کیا گیا ہے۔

فصل نمبر ۴۲

عقد بیوگان

عرب میں عقد بیوگان زمانہ جاہلیت میں بھی جائز تھا۔ اسلام نے اسے پسند کیا اور قائم رکھا۔ اس زمانے میں ہند کے مسلمان اسے معیوب سمجھتے ہیں عقد بیوگان کا مسئلہ اتنا صاف ہے کہ اس کی خوبیاں بیان کرنا بے سود ہے اور اس لئے اس فصل میں صرف وہ باتیں درج کی جاتی ہیں جو اس بری رسم کے اٹھا دینے میں مدددیں۔

"بیوہ لڑکی کے عقد ثانی نہ کرنے کی باز پرس خدا کے یہاں ہوگی" شاید یہ مسئلہ ایسا عام نہیں ہے کہ تمام مسلمان اس سے واقف ہوں اس لئے اس موقع پر کچھ بیان کرنا ضروری ہے قرآن پاک کی سورۃ نور کے چوتھے رکوع میں حکم ہے "تم اپنی بیواؤں کو بیاہ دو[1]"۔ اب اس سے اور زیادہ صاف حکم کیا چاہیئے۔ نص قطعی موجود ہے اور اسلام نام ہے نص قطعی پر یقین کرنے اور اسکو پراز حکمت اور مناسب حال سمجھنے کا۔ "تم" سے یہاں بیواؤں کے اولیاء مراد ہیں پہلے باپ بھائی، چچا، ماں، دادی وغیرہ اولیاء تھے۔ اب ہندوستان کے رواج کے مطابق خسر ساس دیور بھی ولی بن جاتے ہیں۔ بہرحال بیوہ جس کے اختیار میں ہو اس پر واجب ہے کہ وہ بیوہ کے عقد ثانی کی فکر کرے۔

جامع ترمذی باب صلوٰۃ میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ

[1] وانکحوا الایامی منکم۔

فرمایا[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "علی تین باتوں میں دیر نہ کرو۔ نماز پڑھنے میں جب وقت آجائے۔ میت کے دفن کرنے میں جب جنازہ تیار ہو۔ بیوہ کے بیاہنے میں جب کوئی مناسب شخص مل جائے"۔ دیکھیئے نماز پڑھنے مردہ دفن کرنے کے برابر بیوہ کا عقد کرنا محکوم ہوا ہے۔ لیکن لوگ سمجھتے ہی نہیں کہ عقد بیوگان کوئی شرعی کام ہے۔

ایم کی جمع ہے ایایم اور ایایم سے ہوا آیامی۔ اس کا ترجمہ لوگوں نے رانڈ اور بیوہ کیا ہے لیکن لغت میں ہر مرد و زن کو جو بیاہنے کے قابل ہو ایم کہتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ بیاہی نہ گئی ہوں یا بیاہنے کے بعد موت یا طلاق نے زوج سے افتراق کر دیا ہو۔ لیکن یہاں ایامی سے مراد مرد نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ بیاہ کرنے پر مردوں کو نان ونفقہ دینا لازم ہوتا ہے اور اس سے محض ان کا جوان ہو جانا ان پر نکاح کرنا واجب نہیں کرتا۔ کوئی یہ کہے کہ بغیر لغوی معنی کے اعتبار سے بیوہ کی شادی کی تاکید قرآن میں نہیں ہے بلکہ تمام جوان عورتوں کی طرف اشارہ ہے۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ اولیاء کو خدا عام طور پر حکم دیتا ہے "تمہارے قبضہ میں جو نوجوان عورت بے خاوند کی ہو اس کو بیاہ دو"۔ اب یہ کہنا کہ بکر کو تو ہم بیاہیں گے اور بیوہ کو نہ بیاہیں گے گویا خدا کے نصف حکم کی توہین کرنا ہے۔

اب ہم صاف طور پر دکھاتے ہیں کہ بیوہ کی خصوصیت کے ساتھ خدا کیا حکم دیتا ہے۔ سورہ بقر رکوع ۳۰[2] میں ہے "تم میں سے جو لوگ مرجائیں اور چھوڑ جائیں اپنی بیویوں کو تو وہ (بیویاں) اپنے کو چار مہینے دس دن تک روکے رکھیں"۔ خدا تو کہتا ہے کہ چار مہینے دس دن تک رکی رہیں اور اولیاء احکام قرانی میں یہ ترمیم پیش کرتے ہیں کہ چار مہینے دس دن نہیں عمر بھر رکی رہیں۔ خدا سورہ بقر کے رکوع ۳۲[3] میں فرماتا ہے: "جب تم عورتوں کو طلاق دیدو اور وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو پھر ان کو اس بات سے نہ روکو کہ جس کو وہ خاوند بنانا چاہیں بنالیں"۔ کبھی عرب کے جہلا عورتوں کو طلاق دے کر ان کو دق کرتے تھے یعنی خود چھوڑ دیتے تھے اور دوسرے مردوں سے نکاح بھی نہیں کرنے دیتے تھے عورتوں کی حق تلفی کی اس ناپاک

---

[1] یا علی ثلث لاتوخرہا الصلوٰۃ اذا انت والجنازۃ اذا حضرت والایم اذا وجدت لہا کفو۔

[2] والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً یتربصن بانفسہن اربعۃ اشہر وعشرا۔

[3] اذا طلقتم النساء فبلغن اجلہن فلا تعضلوہن ان ینکحن ازواجہن اذا تراضوا بینہم بالمعروف۔

طریقہ کو خدا ناپسند فرمائے عورتوں کی آزادی کا یہ حکم دیا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کتاب النکاح میں حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ فرمایا[1] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے: میں عورتوں سے عقد کرتا ہوں جو میرے طریقہ سے منہ پھیرے وہ مجھ سے نہیں ہے۔ یعنی جو نکاح کو برا جانے وہ امت محمدی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ رہا یہ امر کہ پیغمبرؐ خدا نے کیسی عورتوں سے عقد کئے تھے میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ آپ کی ازواج مطہرات میں سوائے ایک حضرت عائشہؓ کے سب بیوائیں تھیں اور ہم لوگ ہیں کہ عقد بیوگان کو برا سمجھتے ہیں پیغمبرؐ خدا کی پیروی چھوڑ کر ہندوؤں کے پیرو بنتے ہیں۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ کنواری لڑکیاں راہ و رسم سے ناواقف ہوتی ہیں ان کے بیٹھے رہنے میں اتنے خطرے نہیں ہوتے جتنے کہ بیوہ کو دوسرا بیاہ نہ کرنے میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ زیادہ تصریح کی ضرورت نہیں ہے اتنا اشارہ سمجھنے کو کافی ہے۔

ایک طرف تو پیغمبرؐ خدا فرماتے ہیں کہ نماز کا وقت آ جائے تو پھر دیر نہ کرو اور اسی طرح بیوہ کا کفو کوئی ٹھہر جائے تو پھر تامل نہ کرو اور دوسری طرف ہندوستان کے مسلمان ہیں کہ آمین بالجہر اور رفع یدین پر لڑنے مرنے کو تیار ہیں نماز کی صف میں کسی کا پاؤں ذرا آگے آ گیا تو پھر آنکھیں نکال کر اس پر دوڑ پڑے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس طرح اہتمام اور بڑی بڑی باتوں میں اتنی پہلو تہی کہ اگر کوئی کہے کہ تمہارے گھر میں ایک رانڈ بیٹھی ہے اس کا نکاح کر دو پیغمبرؐ خدا کی سنت ہے قرآن میں واجب قرار پایا ہے تو لڑنے کو تیار ہو جائیں گے۔

بھائیو! اسلام یہی من مانی بات ہے تو اسلام کا ہے کو ہے کھیل ہے جو باتیں شرع کی پسند آئیں ان کو اختیار کیا اور جو ناپسند ہوئیں ان کو چھوڑ دیا۔

عقد بیوگان کی نسبت آیہ اور حدیث کا بیان تو آ چکا۔ الفاظ صاف ہیں اور مفہوم بھی واضح ہے۔ اب یہ جاننا چاہیئے کہ فقہا نے اس کو واجب، فرض، سنت کیا سمجھا ہے سنیئے فتاویٰ عالمگیری کتاب النکاح میں اس کی بابت لکھا ہے[2]: حالت اعتدال میں نکاح سنت ہے اور حالت جوش میں واجب ہے۔ سنت موکدہ کا درجہ بھی واجب کے قریب ہی ہوتا ہے۔ لیکن یہ معلوم رہے کہ حالت اعتدال بہت کم ہوتی ہے۔ عمر کی زیادتی، یا تحوق

---

[1] اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔

[2] انہ فی حالت الاعتدال سنۃ موکدۃ و فی حالۃ التوقان واجب۔

امراض نہ ہو تو صحیح الجسم اور کم سن عورتیں ہمیشہ حالت توقان میں سمجھی جائیں گی۔ ہر ایک اپنے اوپر قیاس کرکے اس کا مطلب سمجھ لے۔ درمختار میں ہے "جوش طبیعت میں نکاح واجب ہے اگر بغیر نکاح کے زنا کا تیقن ہو تو فرض عین ہے۔

فرض کا ترک کرنے والا۔ ترک فرض کی ترغیب دینے والا۔ یا اس پر صریحاً یا ضمناً مجبور کرنے والا فاسق اور گنہگار ہے۔ لیکن فرض کو فرض نہ جاننے والا۔ احکام الٰہی کو خلاف مصلحت یا باعث توہین سمجھنے والا۔ خدا کے حکیم ہونے میں شک رکھتا ہے۔ نبی کے فعل کو برا جاننے والا کس منہ سے نبی کو رسول اللہ یعنی خدا کا پیغام پہنچانے والا کہہ سکتا ہے۔ پیغمبرؐ خدا کے وقت میں جو منافق تھے ان کے پاس بجائے ایک سر کے دو سر نہ تھے۔ دو آنکھوں کی جگہ وہ چار آنکھیں نہیں رکھتے تھے ۔۔ بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہم شکل ہوتے تھے زبان سے وہ بھی توحید و رسالت کے قائل تھے۔ لیکن آیات قرآنی کی عظمت ان کے دلوں میں نہ تھی اور نہ فعل رسولؐ کو وہ اچھا سمجھتے تھے اسی لئے منافق کہے جاتے تھے۔ احکام شرع کو ذلیل اور خلاف مصلحت سمجھنے والا خود اپنے دل میں فیصلہ کرے کہ وہ پیغمبرؐ خدا کے وقت میں ہوتا تو منافق سمجھا جاتا یا مومن۔

قرآن شریف عملیات کا کوئی مجموعہ نہیں ہے اور نہ وہ سحر اور جادو کی کوئی کتاب ہے اس میں تمثیلات۔ حکایات یا صریحی احکام کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو دنیا میں کیونکر بسر کرنا چاہیئے۔ قرآن کا ماننا یہ نہیں ہے۔ کہ دس پانچ رومالوں میں وہ لپیٹ کر رکھا جائے یا بیماری میں اس کے اوراق تعویذ کی جگہ مستعمل ہوں۔ قرآن کی سچی تعظیم یہ ہے کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے اس کے بعد یہ آداب کی باتیں ہیں کہ وہ احتیاط سے رکھا جائے۔ بے وضو اسے کوئی نہ چھوئے۔ پشت اسکی طرف نہ ہو۔ اونچی جگہ پر وہ عظمت کے ساتھ رکھا جائے۔ افسوس کہ یہ باتیں رہ گئیں اور اصل امر یعنی قرآن کا سمجھنا اور اس کو دستور العمل بنانا جاتا رہا۔

بھائیو! نہایت نازک وقت اسلام پر ہے۔ اسلام کی باتیں خود مسلمانوں کو پسند نہیں ہیں مسلمانی نام کو رہ گئی ہے۔ جن باتوں پر مسلمانان سابق کو ناز تھا وہی باتیں اس زمانے میں باعث ہتک سمجھی جاتی ہیں۔ ایک عقد بیوگان ہی نہیں ہے دنیا میں رسم و رواج نے بہت کچھ احکام قرآنی میں ترمیم کر رکھی ہے۔ لیکن جو کچھ امید ہے وہ صرف یہ ہے کہ قرآن اپنی حالت پر ہے لوگ اس کے مفہوم کی نہیں تو الفاظ کی عظمت ضرور کرتے ہیں۔ پہلے مجھے قرآن کو طوطے کی طرح پڑھنے پر ہمیشہ اعتراض رہا اب کچھ دنوں سے میری رائے بدل گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح قرآن اپنی اصلی حالت پر

تو رہے گا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی عظمت تو باقی رہے گی۔ رہا مفہوم سمجھنا اور اس پر عمل کرنا وہ کب تک نظر انداز رہے گا۔ قوم کی حالت ضرور بدلے گی اور آیات قرآنی پر عمل کرنے سے جس کے بغیر اسلام میں روز بروز تنزل ہے پھر ترقی ہوگی۔ میں اسلام کی قوت یا ضعف یا ترقی یا تنزل کی نسبت ایک بالکل جدا رائے رکھتا ہوں۔ علوم جدیدہ۔ نئی روشنی اور صنعت و حرفت سے مسلمانوں کی ترقی نہیں ہوسکتی۔ مسلمانوں کی ترقی کا ایک ہی ذریعہ ہے یعنی احکام قرآنی پر عمل کرنا۔ جب سے یہ عمل چھوٹا تنزل شروع ہوا۔ اقبال جاتا رہا۔ ادبار نے گھیر لیا۔ اور جب ترقی ہوگی تو اسی حالت میں ہوگی جب قرآن مسلمانوں کا دستور العمل ہوگا اس وقت جتنی ترقی یافتہ قومیں دنیا میں ہیں گو وہ مسلمان نہیں ہیں لیکن اکثر معاملات دنیا میں مسلمانان ہند سے زیادہ تر ان کا عمل قرآن کے موافق ہے اور یہی وجہ ان کے عروج کی ہے۔

اس موقع پر رسولؐ اللہ اور صحابہؓ کرام کے زمانہ میں جو عقد بیوگان ہوئے ان کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ پیغمبرؐ خدا نے ملکی حالت، قومی حالت اور ترویج دین محمدیؐ وغیرہ وغیرہ بہت سے دینی اور دنیاوی مصالح کے اعتبار سے جن کے بیان سے تمام سیر کی کتابیں بھری ہوئی ہیں، بہت سے نکاح کئے جن میں بجز ایک حضرت عائشہؓ کے اور تمام عورتیں بیوائیں یا مطلقہ تھیں۔ ازواج مطہرات کے تفصیلی حالات کے لئے فصل ۴۳ کتاب ہذا پڑھنا چاہیئے۔

آنحضرتؐ کی لڑکیوں میں سے صرف حضرت رقیہؓ پہلے عتبہ ابن ابی لہب سے بیاہی گئیں پھر حضرت عثمانؓ ابن عفان کو اور حضرت ام کلثومؓ پہلے عتبہ ابن ابی لہب کو اسکے بعد حضرت رقیہؓ کی وفات کے بعد حضرت عثمانؓ غنی کو۔

پیغمبر خدا کی نواسی حضرت اُمامہؓ بنت حضرت زینبؓ حضرت فاطمہؓ کے انتقال پر خود ان کی وصیت کے مطابق پہلے حضرت علیؓ کو بیاہی گئیں اور جب حضرت علیؓ شہید ہوئے تو حضرت علیؓ کی ہدایت کے مطابق حضرت مغیرہؓ ابن نوفل سے بیاہی گئیں۔

حضرت فاطمہؓ کی بیٹی حضرت ام کلثومؓ کے چار عقد ہوئے۔ پہلا امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دوسرا عون ابن جعفر طیار برادر حضرت علیؓ سے تیسرا عون کے مرنے پر ان کے بھائی محمد سے پھر چوتھا بیاہ ان کے مرنے پر ان کے تیسرے بھائی عبداللہ ابن جعفر سے۔

یہیں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت عون آٹھ حقیقی بھائی حضرت جعفر طیار کے بیٹے اسمائؓ کے بطن سے تھے اسماء نے جعفر طیارؓ کی شہادت کے بعد آٹھ بیٹوں کی موجودگی میں اپنا دوسرا عقد حضرت

ابو بکرؓ سے کیا جس سے محمد ابن ابی بکر پیدا ہوئے۔ اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ کی وفات پر تیسرا عقد حضرت علیؓ سے کیا جن سے یحییٰ پیدا ہوئے۔ دیکھئے عربوں کا طریقہ کیسا سچا اور صاف تھا۔ یہیں سے یہ بھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ وہ لوگ زنا کو کتنا معیوب جانتے تھے اور اپنی آزادی کی کتنی قدر کرتے تھے۔

حضرت امام حسینؑ کی صاحبزادی سکینہؓ کے چار نکاح ہوئے پہلا مصعب بن زبیر سے دوسرا عبداللہ ابن عثمان بن حکیم سے تیسرا اصبغ بن عبدالعزیز بن مروان سے چوتھا زید بن عمر بن عثمان غنی سے۔

آنحضرتؐ کی پھوپی زاد بہنوں اور پھوپیوں کے بھی متعدد نکاح ہوئے تھے۔ آپ کی پردادی یعنی عبدالمطلب کی ماں سلمہ کے بھی دو نکاح ہوئے پہلا احیحہ بن جلاح سے اور دوسرا ہاشم سے۔ جنکی اولاد ہاشمی کہلاتی ہے۔ اگر یہ عقد بیوگان روا نہ ہوتا تو فخر روزگار ہاشمیوں کا وجود دنیا میں نہ ہوتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو بات رسولؐ اور صحابۂ رسولؐ کے زمانے میں باعث فخر تھی اور ہندوستان کے باہر تمام بلاد اسلام میں جائز ہے وہ ہندوستان میں کیوں مکروہ، باعث ذلت اور عملاً گویا داخل معصیت سمجھی جاتی ہے؟ سوائے جہالت کے اور کوئی وجہ نہیں ہے مشہور ہے کہ ہندوؤں کی صحبت سے مسلمانوں میں بھی عقد بیوگان ناجوازی رائج ہوئی ایک حد تک یہ کہنا صحیح ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ عقد بیوگان کی ناجوازی ہی مسلمانوں نے ہندوؤں سے نہیں لی بلکہ اپنی بہت سی عمدہ باتیں وہ کھو بیٹھے ہندوؤں کی بہت سی باتیں اختیار کر لیں بہت سی رسمیں مسلمانوں میں ایسی رائج ہوگئیں جو شرک فی اللہ اور شرک فی النبوۃ کی حد تک پہنچیں۔ ہمت مستعدی۔ حمیت۔ مردانگی۔ راست بازی۔ ایفائے وعدہ ہم کن کن باتوں کے لئے روئیں۔ زمین ہند میں ہمارے تمام اوصاف باپ دادا کے ساتھ دفن ہوگئے نکبت اور ذلت کے دن دیکھنے کے لئے ہم لوگ رہ گئے ہیں اقبال نے منہ پھیر لیا ادبار نے آگھیرا اور دنیا ومافیہا سے غافل کسی طرح زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ نور ایمان کی کمی اپنے عیوب ظاہر ہونے نہیں دیتی۔

مردوں نے صرف عقد ثانی سے روک کر عورتوں کے حقوق تلف نہیں کئے بلکہ دنیا کے تمام امور میں وہ عورتوں کو عام اس سے کہ وہ مائیں ہوں، بہنیں ہوں۔ بیویاں ہوں یا لڑکیاں ہوں بہائم اور لونڈیوں کی طرح سمجھتے ہیں انکے حقوق اور انکی آزادیوں کے غصب یا تلف کرنے میں کچھ بھی پس وپیش نہیں کرتے اور یہ نہیں سمجھتے کہ اسلام کو دنیاوی معاملات میں بڑا ناز اس امر پر ہے کہ اس نے عورتوں کے حقوق کی پوری نگہداشت کی ہے۔ کوئی قوم ترقی

نہیں کر سکتی جب تک عورتوں کے حقوق کی پوری نگہداشت نہ ہو اور انکی غلامی رفع نہ کی جائے۔ مری ہوئی طبیعتیں رکھ کرا ور ذلیل حالت میں رہ کر عورتیں جو اولاد جنیں گی وہ غلامی کا سبق اپنی ماں سے لے کر نشو نما پائے گی ایسی اولاد کیا خاک ترقی کرے گی۔ عورتوں کی جائز اور شرعی آزادیوں میں خلل ڈالنا گویا آئندہ نسل کی مٹی خراب کرنا ہے۔

ہندوؤں میں بدھوا بیوہ کی ممانعت زمانہ حال کی رسم ہے۔ جب ہندوؤں کی ترقی کا زمانہ تھا تو اس قسم کا خیال بھی نہیں تھا۔ کلکتہ اور بنارس کے پنڈتوں نے ادھر توجہ کی ہے۔ دہلی لاہور اور بمبئی وغیرہ شہروں میں ادھر خیالات رجوع ہوئے ہیں۔ یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ ہنود کی مقدس کتابوں میں کہیں بھی عقد بیوگان کی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ بعض رشیوں کے قول سے اس کی ہدایت پائی جاتی ہے۔ صاف طور پر محکوم ہے کہ شوہر کے طلاق دینے مفقود الخبر ہو جانے یا مرجانے یا مرد کی ناقابلیت کی وجہ سے عورت بے خاوند کی ہو جائے تو اس کو دوسرا بیاہ کتنے دنوں کے بعد کرنا چاہیئے۔ جب ہندوؤں کی جہالت اور خود غرضی کا زمانہ آیا علم اور آزادی کا شوق جاتا رہا تو عقد بیوگان بھی مسدود ہو گیا۔ لوگ کہنے لگے کہ پہلے زمانے میں جائز تھا اور اب جائز نہیں ہے۔ گویا پہلے فطرت انسانی کچھ اور تھی اور اب کچھ اور ہو گئی ہے۔ اسی طرح جب مسلمانوں کے برے دن آئے۔ تو بہت سی بری عادتوں اور دستوروں کے ساتھ عقد بیوگان بھی ان میں معیوب ٹھہرا مشہور تو یوں ہے کہ جب ہند کی عورتوں سے خلا ملا ہوا اور وہ مسلمان ہو کر مسلمانوں کے گھر آئیں تو عقد بیوگان کی ممانعت کی نص قطعی بھی اپنے ساتھ لائیں۔ ممکن ہے کہ اور بد رسمیں اسی طرح پھیلی ہوں۔ مگر عقد بیوگان کو ناروا سمجھتے ہیں تو میں زیادہ تر مردوں ہی کو الزام دوں گا۔ دیکھتا ہوں کہ لڑکیوں کے پیدا ہونے سے لوگ بے وجہ ملول ہو جاتے ہیں۔ ان کا بڑھنا۔ سہاگن رہنا۔ صاحب اولاد ہونا اس خیال کے بالکل منافی ہے جو شروع ہی میں لڑکیوں کے وجود کو وبال جان سمجھتا تھا۔ ملکی رسم کے خیال سے لڑکیاں پہلی دفعہ بیاہ دی گئیں۔ یہی بڑی بات ہوئی۔ بار بار ان کے بیاہ کا بار اٹھانا بھلا کب گوارا ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں عورتوں کی حق تلفی کو عار نہیں سمجھتے۔ بھائی بہن کے حصے غصب کرنے کو تیار رہیں۔ بعض باپ ایسے نیک بخت ہیں جو چاہتے ہیں کہ ان کے مرنے پر ان کی جائداد قرآن کے حکم کے خلاف لڑکیوں کی حق تلفی کے ساتھ تقسیم کی جائے۔ یہ بڑی شرم کی بات ہے۔ جہاں نیتیں ایسی ڈانواڈول ہوں وہاں عورتوں کا صاحب خاوند ذی اولاد ہونا گویا ان کے دعوؤں کا اور مضبوط ہونا بھلا کب پسند کیا جائے گا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ بڑے

بڑے متمول خاندانوں میں عورتوں کے بیوہ ہونے پر اولیا خوش ہوتے ہوں گے کہ اچھا ہوا لڑکی بیوہ ہو گئی خاندان کی جائداد باہر نہیں گئی اعوذ باللہ من شرور انفسنا۔ بھائیو! خدا سے ڈرو اور احکام خدا کی محبت دل میں پیدا کرو۔ منہ سے مسلمان اور دل میں احکام شرعی سے نفرت۔ اس منافقانہ طریقہ کو چھوڑو۔

اور ملکوں میں مردوں کو زیادہ تر نکاح کی تلاش ہوتی ہے اور یہاں عورتوں کے اولیا سے جو نکاح کی بات چیت کرتا ہے تو گویا ان پر بہت بڑا احسان کرتا ہے۔ کنواری لڑکیوں کے بیاہنے میں تو یہ دقت ہے۔ بیوہ عورتوں کا بیاہ کوئی کرنا بھی چاہے تو مناسب حال شوہر کا ملنا مشکل ہے تمام واعظین لڑکیوں کے اولیاء پر الزام رکھتے ہیں گو وہ کسی طرح الزام سے بچ نہیں سکتے لیکن میں ان پر بھی الزام رکھتا ہوں جنکو خواہش عقد ہوتی ہے اور اپنی طلب کا دائرہ کنواری لڑکیوں پر محدود رکھتے ہیں۔ عمر کتنی ہی زیادہ ہو۔ چوتھے پانچویں عقد کی نوبت آئی ہو جب بھی کنواری لڑکیوں کی تلاش ہو گی۔ حالانکہ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ ایران میں لوگ بیوہ عورتوں کو ترجیح دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ راہ ورسم دنیا اور طریقہ خانہ داری سے واقف ہوں گی۔ سردست تو تمام خیالات کا بدلنا آسان نہیں ہے لیکن جب کوئی رنڈا عقد ثانی کی فکر میں ہو تو کنبہ، محلہ، شہر کے با اثر لوگ ہم عمر رانڈ عورتیں اس کے لئے تجویز کریں تو آسانی سے سنت محمدی زندہ ہو سکتی ہے

حضرت عمرؓ کا قول[1] احیاء العلوم میں نقل کیا گیا ہے۔ کہ دو ہی باتیں نکاح سے منع کرتی ہیں۔ مجبوری یا بدچلنی۔ یعنی کوئی آدمی دولت اور صحت جسمانی سے ہر طرح موزوں ہوتے ہوئے نکاح سے گریز کرے تو اس کو بدچلن سمجھنا چاہیئے۔ جوان عورتیں صحت جسمانی کی حالت میں نکاح نہ کریں تو ضرور بدچلن ہو جائیں گی شریف خاندان والی عورتیں جو گھر کی چار دیواری میں قید رہتی ہیں غیر مرد کی صورت نہیں دیکھ سکتیں وہ اپنی خاص حالت کی وجہ سے عفت مآب رہ سکتی ہیں۔ لیکن قانون فطرت میں جو زور ہے اور انسانی طبیعت میں بمقابلہ ہوا و ہوس جو مخلوبی ودیعت کی گئی ہے وہ بھی کسی طرح نظر انداز نہیں ہو سکتی۔

مشو ایمن از زن کہ زن پارسا ست
کہ خربستہ بہ گرچہ دزد آشنا ست

---

[1] من النکاح الا عجز او فجور۔

اور جو عورتیں بے طرح جبر گوارا کر کے معصوم صفت زندگی بسر کرتی ہیں وہ طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہو کر اپنی زیست کے دن بہت جلد ختم کرتی ہیں۔

جب کنواری لڑکی کا بیاہنا شرم نہ تھا تو رانڈ کے بیاہنے میں کیا عیب ہے لڑکے رنڈوے ہو جائیں تو بیاہنے میں حرج نہیں ہے اور لڑکیاں رانڈ ہو جائیں تو ان کا عقد ثانی معیوب سمجھا جاتا ہے کچھ عجیب منطق ہے کہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کیسی شرم کی بات ہے کہ ۴۰ برس کی ماں اپنے شوہر کے پاس رہے اور اس کی پندرہ برس کی بیوہ لڑکی گھر میں موجود ہو۔ ایسے بے حمیت بھی بہت سے پائے جاتے ہیں کہ پندرہ بیس برس کی بیوہ لڑکیاں ان کے گھر میں موجود ہیں اور خود پچاس ساٹھ برس کے ہو کر عقد ثانی کرتے ہیں۔

صحیح بخاری کتاب الادب میں حضرت ابو حریرہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ایک مسافر راستہ چلا جاتا تھا اسے پیاس معلوم ہوئی۔ قریب ایک کنواں نظر آیا اس کنویں میں وہ اتر گیا اور پانی پی کر باہر نکلا۔ دیکھا کہ ایک کتا زبان نکالے نم مٹی چاٹ رہا ہے۔ وہ پھر کنوئیں میں اتر گیا اور اپنے جوتے میں پانی بھر کر اس جوتے کو منہ سے تھام کر اوپر نکلا اور کتے کو پانی پلایا۔ اب ان بے حمیتوں کو دیکھئے کہ گھر کی رانڈوں کے ساتھ اتنا سلوک بھی نہیں کرتے جتنا کہ اس مسافر نے کتے کے ساتھ کیا تھا۔ بے چاری بے زبان رانڈوں پر ظلم کرتے ہوئے ان کو شرم نہیں آتی۔

مردی نہ بقوت ست وشمشیر زنے　　　آنست کہ ظلمے کہ تو انے نہ کنی

کیا لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ عورت اور مرد کی یکجائی انتظام عالم کے لئے ضروریات سے ہے انسان اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا خدا نے انسانی فطرت میں ایسی قوت رکھی ہے کہ قانون فطرت کی غرض کبھی فوت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس یکجائی میں اولاد کا ہونا لازم ہے۔ اولاد کی پرورش اور حسن معاشرت کے لئے باپ کا جائز طور پر مقرر ہو جانا ہی نکاح کی غایت ہے۔

نوع انسانی کا گھٹانا قانون فطرت کا بڑا جرم ہے۔ ہر مذہب نے اسے تسلیم کیا ہے تمام حکومتیں اس کی حمایت کرتی ہیں ۱۸۸۱ء میں جو مردم شماری ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ پانچ کروڑ ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان ہندوستان میں تھے جن میں تقریباً ڈھائی کروڑ مرد تھے اور اسی قدر عورتیں تھیں ان عورتوں میں ۴۰ لاکھ سے کچھ زیادہ بیوائیں تھیں یعنی کل عورتوں میں ایک سدس کے قریب بیوائیں تھیں۔ اگر دو ثلث جوان فرض کی جائیں

تو امت محمدی کی ترقی میں نویں حصہ کی کمی عقد بیوگان کو ناروا سمجھنے سے ہوتی ہے۔

مزا تو یہ ہے کہ جب لڑکی بیوہ ہو جاتی ہے تو لوگ اسے کم بخت سمجھتے ہیں اور نہایت محبت سے کہتے ہیں کہ ہائے یہ بدنصیب جلنے کے لئے بیٹھی رہ گئی اور جو کہیں اتفاق سے وہ لڑکی بھی مرگئی تو بہت خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ بیوی خوش نصیب تھی کہ دنیا سے اٹھ گئی۔ پتھر پڑیں اس سمجھ پر۔ جہاں ہندوؤں میں مرد کی چتا پر عورتیں زندہ جل جاتی تھیں تو لوگ خوش ہوتے تھے۔ وہاں عورتیں اپنی موت سے مرجائیں تو بھلا کب افسوس ہو سکتا ہے عورتیں ایسی ہی فالتو ہیں تو پیدا ہوتے ہی مار ڈالی جائیں تو اور اچھا۔ شرم! شرم!! شرم!!!

جب قوم کی یہ کیفیت ہے کہ وہ رانڈ کا مرنا مبارک فال سمجھتے ہیں تو یہ تذکرہ کرنا فضول ہے کہ باعصمت رانڈوں کو کیا کیا بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ترتیب گفتگو کی تکمیل کے لئے ان کا بیان بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بیاہ نہ کرنا گویا قانون فطرت کے خلاف کرنا ہے۔ بیوائیں قانون قدرت پر تو غالب نہیں آسکتیں خود مغلوب ہو کر اختناق الرحم۔ تپ دق۔ مالیخولیا۔ جنون۔ عشق۔ مرگی۔ غشی وسواس وغیرہ وغیرہ بہت سے امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اولیا جب کبھی علاج کے لئے مستعد ہوئے تو حکیم صاحب فصد۔ جلاب۔ ٹھنڈا تجویز کرتے ہیں اور اصل علاج بتلاتے ہوئے شرماتے ہیں اور بیوائیں ان نادان طبیبوں کی تشخیص پر زبان حال سے کہتی ہیں۔

اُف اُف ستم اے طبیب نادان
رنجم مفزائے با مداداں!

آگاہ نئی تپ درون را
نشتر چہ زنی رگ جنون را

چشمے بدل مشوش انداز
قارورہ بر در آتش انداز

ایں شیشۂ دل کہ پر زخون است
داری نظرے بہ بیں کہ چون است

اور اپنے اولیا سے کہتی ہیں۔

آسودہ ولا حال دل زار چہ دانی
خونخواری عشاق جگر خوار چہ دانی

شب تا بسحر خفتہ بخلوتگہ نازی　　　بیداری این دیدہ بیدار چہ دانی
اے فاختہ پرواز کناں بر سر سرے　　　دردِ دل مرغان گرفتار چہ دانی

اختناق الرحم کی وجہ سے کبھی کبھی وہ حالتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ لوگوں کو آسیب، بھوت چڑیل کا شبہ ہوتا ہے۔ پھر اسی دھوکے میں ہزاروں شرک اور کفر کی باتیں ہو جاتی ہیں۔ مالیخولیا میں بھی کبھی کبھی آسیب کا گمان ہوتا ہے اور ہر طرح کے افعال ناکردنی اس کی بدولت کئے جاتے ہیں۔ غرض کہ باعصمت بیوائیں مختلف امراض میں مبتلا ہو کر مرجاتی ہیں اور انکی تربت پر جلی قلم سے یہ شعر کندہ ہوتا ہے۔

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریرے　　　کہ این مقتول را غیر از گناہے نیست تقصیرے

امام الہند مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ رسالۂ عقد بیوگان میں لکھتے ہیں۔

" از جملہ رسوم فاسدہ مخالف شرع کہ در کفر ہندوستان اشتہار دارد و بعضے از سفہائے مسلمین کہ بایشاں اختلاط میدارند آموختہ التزام نمودہ اند ممانعت زنان بیوہ ست از نکاح ثانی۔ وہمچنیں معیب دانستن طلاق و اہانت بیوہ زن کہ نکاح ثانی کردہ باشد وہمچنیں اہانت زنان مطلقہ و ایں امور و ایں ممانعت چناں کہ مخالفت شرع است ہم چناں مخالف رسوم جمیع مسلمین است چہ مجمع اہل اسلام ملک عرب و روم و توران و سیستان است و دراں دیار ہرگز ایں امر عار نیست۔ نہ دریں خبر و زمان نہ پیشتر ازاں وطرفہ تر ایں است کہ چند از سفہائے مسلمین ہندوستان کہ خود را بشرفا ملقب ساختہ اند۔ نسبت نسب خود را بصحابۂ کبار و ائمہ اطہار کردہ روسائے عرب بودہ اند افتخار خود می انگارند و پر ظاہر است کہ رسوم مذکورہ یعنی نکاح ثانی زنان بیوہ و طلاق منکوحات عندالحاجت درایشاں جاری بود پس گویا ایں حمقا بزرگان خود را کہ شرافت از ایشاں یافتہ اند لعن میکنند و رسم ایشاں را عار می انگارند پس الیق بحال ایشاں آنست کہ خود را از زمرہ سادات و شیوخ نہ شمارند "

" نہے سفاہت ایں حمقا کہ خود را بشرفا ملقب ساختہ اند بنا بر پاسداری چندے کفرہ از ہندوستان آباؤ اجداد خود را کہ افضل خلائق بودہ اند مطعون و ملام می سازند زیرا کہ نکاح ثانی زنان بیوہ متوفی عنہا یا مطلقہ را عار و ننگ می شمارند پس فی الحقیقت آں پیشوایان دین کہ بیخ و بنیاد شرافت و نجابت بسبب ایشاں مستحکم گردیدہ بسوئے

دبے ناموسی نسبت می کنند۔ اعاذنا اللہ من شرور اولئک المنافقین الضالین ۔"

ترجمہ:۔ بہت سی ایسی رسوم فاسدہ مخالف شرع ہندوستان کے کافروں میں شہرت پذیر ہیں جن کو بے وقوف مسلمانوں نے بھی میل جول رکھ کر سکھ لیا ہے اور خود پر لازم کر لیا ہے۔ بیوہ عورتوں کو نکاح سے روکنا بھی اسی قبیل سے ہے۔ طلاق کو برا جاننا۔ اس بیوہ عورت کی اہانت کرنا جس نے دوسرا نکاح کر لیا ہو اور ایسا ہی جن عورتوں کو طلاق ملی ہو ان کی توہین کرنا۔ یہ سب امور اور یہ نکاح سے روکنا جس طرح مخالف شرع ہے اسی طرح تمام مسلمانوں کی رسوم کے بھی مخالف ہے۔ کیونکہ مجمع اہل اسلام ملک عرب و روم، توران۔ سیستان ہے اور ان ملکوں میں اس امر سے ہرگز عار نہیں ہے نہ اس زمانے میں اور نہ اس سے پہلے۔ زیادہ طرفہ یہ ہے کہ ہندوستان کے چند بے وقوف مسلمان جو اپنے آپ کو شرفا کا لقب دیتے ہیں اپنے نسب کو صحابہؓ کبار آئمہ طہار سے (جو روسائے عرب تھے) منسوب کرنے میں اپنا فخر سمجھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ رسوم مذکورہ یعنی بیوہ عورتوں کا نکاح کرنا اور ضرورت کے وقت نکاحی عورتوں کو طلاق دینا ان میں جاری تھا پس گویا کہ یہ احمق اپنے بزرگوں کو جن سے شرافت پائی ہے طعنہ دیتے ہیں اور ان کی رسم کو عار سمجھتے ہیں۔ ان کو مناسب ہے کہ اپنے کو سادات اور شیوخ کے گروہ میں نہ شمار کریں۔"

"وہ احمق گروہ جس نے اپنے آپ کو شرفاء کا لقب دیا کیسا بے وقوف ہے کہ ہندوستان کے چند کفار کی خاطر داری سے اپنے آباؤ اجداد کو جو بزرگ ترین خلائق تھے مطعون اور قابل ملامت بنا رکھا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کو (خاوند کے قضا کرنے یا طلاق پانے پر) ننگ و عار سمجھتے ہیں۔ اور اس طرح فی الحقیقت دین کے ان پیشواؤں کو جن کے باعث شرافت اور نجابت کی جڑ مستحکم ہوئی ہے بے حمیت اور بے ناموس بتلاتے ہیں ان گمراہ منافقوں کے شر سے خدا ہم سب کو پناہ دے۔"

عوام میں چند حیلے عقد بیوگان کے خلاف مشہور رہیں۔ قرآن اور حدیث اور سنت نبوی سے خلاف کرنے یا کہنے کی جرأت تو مسلمانوں کو نہیں ہوسکتی بہانوں سے کام لیتے ہیں۔ جو شیطانی وسوسوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ مثلاً

لوگ کہتے ہیں عقد بیوگان شرافت کے خلاف ہے۔ اس کا جواب سوا اس کے کیا دیا جائے گا کہ خود کو پیغمبرؐ سے زیادہ شریف سمجھنا احکام قرآنی کو خلاف شرافت جاننا ضلالت نہیں ہے تو کیا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا نے ایسا نہیں کیا ہے تو ہم کیوں کریں۔ کفار عرب بھی دعوت اسلام پیش کرنے پر ایسا ہی کہتے تھے۔ سورۂ بقرہ رکوع ۲۱ میں ہے۔

"اور جب ان کو کہا جاتا ہے چلو اس حکم پر جس کو اللہ نے اتارا ہے۔ تو کہتے ہیں نہیں ہم تو اس پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ گو ان کے باپ دادا نادان و گمراہ رہے ہوں"۔

لیکن اس سے قطع نظر کرکے میں کہتا ہوں کہ باپ دادا سے ہندوستان ہی کے مسلمان کیوں مراد لئے جائیں مسلمانان سابق کیوں نہ دیکھے جائیں جن پر مسلمانوں کو فخر ہے۔ باپ دادا کو ناحق بدنام کرنے والے صریح جھوٹ بولتے ہیں۔ باپ دادا کا طرز زندگی ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔

کوئی کہتا ہے کہ نکاح ثانی رائج ہونے سے عورتوں کو اپنے خاوندوں کی محبت نہ رہے گی واہ کیا معقول حجت ہے۔ سچی محبت تو اسی وقت ہوگی جب سچائی اور آزادی کے ساتھ خیالات کا اظہار ہوگا دوسرے یہ کہ زن وشو کی محبت فطرتی ہے۔ مرد تو دوسرے نکاح سے ممنوع نہیں ہیں پھر وہ عورتوں سے کم محبت کیوں نہیں رکھتے۔

جُہلا کہتے ہیں کہ دوسرا بیاہ کرنے سے اولاد کی محبت کم ہو جائے گی۔ اول تو یہ تمام بیواؤں سے متعلق نہیں ہے دوسرے یہ کہ اولاد سے جو فطری محبت عورتوں کو ہے وہ کبھی کم نہیں ہو سکتی ماں کی محبت بچوں کے کس کام کی۔ باپ کی محبت جس کی بدولت بیٹے پلتے ہیں نکاح ثانی سے کم ہو جاتی ہے تو مردوں کا نکاح بھی ناروا ٹھہرا دینا چاہیئے۔ اپنے ذاتی منافع میں تو لوگ کسی کی پیروی یا تقلید ضروری نہیں سمجھتے بیچاری مظلوم بیواؤں کے فائدے کی صورت میں ناحق کا بہانہ پیش کیا جاتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر بیواؤں کا نکاح کیا جائے تو اولاد کہاں بیاہی جائے گی۔ واہ کیا معقول حجت ہے۔ اچھا لوگ بازاری عورتوں سے نکاح کرتے وقت یہ کیوں نہیں سوچتے ؟ اور پھر نکاح کے وقت یہ کیوں نہیں سوچتے کہ بچہ پیدا ہوگا تو کھائے گا کہاں سے۔ بھائیو! یہ سب خدا کے اختیار میں ہے۔ یہ سوچنا کہ کل کیا ہوگا انسان کے ضعف ایمان کی دلیل ہے۔ لعض کفار

لہ واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اٰباءنا اولو کان اٰباؤھم لا یعقلون شیئا ولا یھتدون۔

عرب لڑکیوں کو مار ڈالتے تھے ان کی شان میں خدا کہتا ہے[1]۔

"اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے نہ مارو۔ ہم تم کو بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی"

جن لوگوں نے عقد بیوگان جائز رکھا ہے ان کے کہنے میں کہیں شادی بیاہ رکا رہا ہے۔؟ ہرگز نہیں۔

جہلا کہتے ہیں کہ بڑے لوگ عقد بیوگان روا رکھیں۔ علمائے وقت نمونہ دکھائیں تو ہم بھی ایسا کریں یہ حجت گو سست ہے لیکن قوم کے با اثر لوگوں پر ضرور الزام عائد کرنے والی ہے کہ وہ اپنے فعل سے سنت نبوی زندہ کرنے میں اور قومی حقوق ادا کرنے میں پہلوتہی کرتے ہیں۔

ہندو بیواؤں کی فریاد

ضلع گورکھپور میں ایک متمول خاندان کی ایک بیوہ برہمنی اس جرم میں عدالت سشن سپرد کی گئی کہ اس نے اپنی لڑکی پیدا ہوتے ہی مار ڈالی تھی ناظرین خود بخود سمجھ جائیں گے کہ لڑکی حمل حرام کی تھی اور شرم سے اس عورت نے مارڈالا۔ فی الواقع اس عورت پر یہی الزام تھا پولیس اور سپرد کرنے والا مجسٹریٹ دونوں ایسا ہی سمجھے تھے۔ محض اتفاق تھا کہ جج کے نزدیک ثبوت قابل اطمینان نہ تھا اور اس لئے محض اخفائے موت کے جرم میں حسب دفعہ ۳۱۸ تعزیرات ہند بیوہ کو ۹ ماہ کی سزا دی گئی۔

ملزمہ بار بار یوں کہتی تھی کہ کوئی اپنے بچے کو بھلا کیوں مار ڈالے گا اس کی یہ حجت دوسرے ملکوں کے طرز تمدن پر لحاظ کر کے کتنی ہی باوقعت ہو لیکن افسوس کہ ہندوستان میں اس گفتگو کو کچھ وقعت نہیں ہے۔ جج اور تمام تماشائی ضرور سمجھتے تھے کہ جو حجت ملزمہ پیش کرتی تھی وہ خود ملزمہ کے دل میں بھی بے وقعت تھی۔ جس وقت ملزمہ کو قید کا حکم سنایا گیا خوشی سے اس کا چہرہ بدل گیا وہ سمجھی کہ گویا پھانسی سے اتاری گئی اپنے ایک دوسرے نابالغ بچے کی پرورش اور اپنے اثاثہ خانہ کی بابت جیل جاتے وقت جو اس نے ہدایت کی وہ بہت دل ہلا دینے والی تھی۔ شروع سے اخیر تک یہ نہایت حیرت افزا اور درد انگیز نظارہ تھا۔

ہم اپنے مضمون کے اغراض کے لئے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس عورت کو پھانسی دیدی گئی

---

[1] لا تقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقکم وایاہم

یہ نہ سہی اس کی اور ملکی بہنیں سیکڑوں ہزاروں اس جرم میں پھانسی پا چکی ہوں گی۔ ہم کو یہاں منصفانہ طور پر یہ رائے قائم کرنا ہے کہ اس بچہ کے قتل کا اور اگر وہ بیوہ پھانسی پا جاتی تو اس کے یا اور جتنی بیوائیں اس جرم میں پہلے پھانسی پا چکی ہیں ان سب کے خون کا الزام کس کی گردن پر ہے۔

اصل باعث اس سب فساد کا وہ شخص ہے جس نے عورت کے ساتھ ہمبستری کی۔ نہیں۔ نہیں! اس کا کچھ قصور نہیں۔ بیوہ عورت کے ساتھ تعلق پیدا کرنا اس وقت کسی مہذب گورنمنٹ کے قانون میں منع نہیں ہے۔ ہندوستان میں جو مجموعہ تعزیرات جاری ہے۔ گو وہ ان تعلقات میں اور ملکوں سے کسی قدر سخت ہے لیکن اس نے بھی اس کو ناجائز نہیں ٹھہرایا ہے۔ ہاں مذہب اسلام اس بارے میں بہت سخت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی، آسانیاں بھی قابل لحاظ ہیں۔ ہزاروں قسم کی آسانی اور سچی آزادی بہم پہنچانے کے بعد وہ حکم لگاتا ہے کہ تم ان آسانیوں پر لحاظ نہ کرو گے۔ خدا کی نعمت کو جائز اور آسان طریقہ کے ہوتے ہوئے ناجائز طریقہ سے اپنے کام میں لاؤ گے تو تم کو سخت سزا دی جائے گی غرض کہ مسلمانوں کے قانون کا شمار نہ کیا جائے جس میں سختی کے ساتھ نرمی بھی ہے تو کسی مہذب ملک میں یہ شخص مجرم نہ سمجھا جائے گا۔

اب رہی وہ عورت اس کی نسبت قتل طفل کے قبل تک کوئی تعزیری احکام متعلق نہیں ہوتے۔ یہاں تک وہ گو بانہایت جائز طور پر قانونی زینہ پر چڑھتی ہوئی چلی گئی۔ انتہائی بلندی تک غار میں گرنے کی جو صورت پیدا ہوئی وہی صورت زیر بحث ہے۔ ہمارے نزدیک وہاں تک پہنچنے کے بعد وہ کسی طرح باد مخالف کے جھونکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی وہ گڑھے میں گر پڑنے پر مجبور تھی اور یہی مجبوری ہمارے نزدیک قابل بحث ہے کہ آیا یہ فطرتی طور پر ہے یا ملکی رسم و ملکی قانون کی بدولت ہے۔

ایک باشرم عورت جب اپنے شوہر کے مر جانے پر تمام عالم کو تاریک دیکھتی تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ رسم و رواج اور ملکی قانون کی بے جا پابندیوں نے تمام ذرائع آسائش ہمیشہ کے لئے اس سے الگ کر دیئے۔ انتظام عالم کے فطرتی کاروبار میں وہ وجود معطل رہ گئی۔ اپنے بیگانے اس کی زندگی کو وبال سمجھنے لگے تو تمام دنیا کی نظروں میں ذلیل اور سب کے خیال میں بار ہو کر زندگی بسر کرنے سے جان دے ڈالنا اس کے نزدیک کہیں اچھا نظر آیا۔

اور پھر گھر والوں کی خواہش بھی محرک ہوئی تو "دیوانہ را ہوئے بس است" کا مضمون ہوا۔ تمام گھر والے جب اس کا جل کر خاک ہو جانا چاہتے تھے تو وہ بے چاری کس کس کا مقابلہ کرتی۔ فرط غم۔ فرط حیا۔ آئندہ زندگی کی تلخ کامیوں کا خیال دریا میں کود پڑنے پر اسے مائل کرتا تھا اور گھر کے لوگ ہوائے تند کی طرح اسے بہا کر موج آب میں اس طرح ڈالتے تھے کہ وہ پھر نکل نہ سکتی تھی۔ بیوہ نے اپنی آئندہ زندگی کو خیال کر کے جب اپنی جان دے ڈالنے میں یعنی ستی ہو جانے میں آسانی دیکھی تو اس کو گورنمنٹ نے قانون کے ذریعہ سے روک دیا لیکن ان اندرونی حالات کی کچھ درستی نہ کی جس کے ذریعہ سے اس بے چاری کو جان دے ڈالنا آسان تھا گورنمنٹ نے مرنے والی کو چتا پر جل بھن کر خاک ہو جانے سے تو روک لیا لیکن ان زحمتوں کا کچھ بھی خیال نہ کیا جو اس کو سسرال یا میکے کے جیل خانے میں اٹھانی پڑتی ہیں۔ گورنمنٹ نے اسے بہی خواہان قوم پر چھوڑا تھا۔ لیکن سیکڑوں ہزاروں گریجویٹ ہر سال کالجوں سے نکلتے ہیں روشن خیالی اور اعلیٰ تعلیم کا خواب دیکھتے ہیں۔ مگر اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

ملکی قانون یا رواج نے خلاف عقل یہ حکم دے رکھا ہے کہ انتظام عالم کے کتنا ہی خلاف ہو۔ قانون فطرت کتنا ہی اپنا زور دکھائے لیکن بیوہ گو وہ کتنی ہی کم عمر ہو کسی مرد سے ایسا تعلق پیدا نہیں کر سکتی جو برادری کے سامنے جائز ہو۔

صرف برادری ہی کے سامنے نہیں بلکہ ملکی قانون کے نزدیک بھی اس کا کسی سے جائز تعلق پیدا کرنا ممنوع ہے۔ جائداد شوہری پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد اگر بیوہ کسی سے چھپا ہوا ناجائز تعلق پیدا کرے تو بہت سے فیصلے اس کے شاہد ہیں کہ وہ جائداد شوہری سے بیدخل نہ ہو گی لیکن اگر وہ دوسرا بیاہ کرے اور اعلانیہ تعلق جائز پیدا کرے تو وہ جائداد سے بالکل بے تعلق ہو جائے گی۔

ایک بیوہ جس کے قبضہ میں ہزاروں لاکھوں روپے کی جائداد ہے اس سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی تمام جائداد پر لات مار کر کسی جوگی کے ساتھ جوگن بن کر گھر سے نکل جائے گی اور عیش وانبساط کے ساتھ سچی آزادی کا لطف اٹھائے گی انسانی کمزوریوں پر نظر کر کے ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ بیواؤں سے ایسی توقع کرنا امر محال کا فرض کرنا ہے۔

ملکی رسم اور ملکی قانون نے گویا بیواؤں کو مجبور کر رکھا ہے کہ وہ ناجائز تعلق مردوں سے رکھیں اور حتی الوسع اسے مخفی رکھیں یہیں پر ہم یہ کہنا بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ صحت جسمانی اور

آزادی حاصل ہونے کے بعد یہ غیر ممکن ہے کہ توالد وتناسل کا سلسلہ جاری نہ ہو جائے قانون فطرت انسانی کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ جس نے عالم پیدا کیا اور جس نے یہ مقدر کر دیا کہ روز بروز عالم کی ترقی ہوتی رہے گی اسی نے انسان کو مجبور محض کر کے اس میں وہ قوت ودیعت کی ہے جسکو انسان جب تک انسانیت کی پوری حالت میں ہے کسی طرح دبا نہیں سکتا۔ بیوہ حالت صحت میں ہے یا بعض خاص خاص شریف خاندانوں کی عورتوں کی طرح گھر کی چہار دیواری میں حبس دوام بغیر عبور دریائے شور کی سزا نہیں بھگت رہی ہے تو ایسی صورت میں اس عورت سے یہ توقع رکھنی کہ وہ اپنے کو خدا کی فطرت سے زیادہ قوی ثابت کرے گی۔ محال ہے۔ غیر ممکن ہے دیوانہ پن ہے اور جب فطرت نے اپنا اثر ظاہر کیا پھر اس وقت یہ خیال کرنا کہ عورت اس اثر کو مٹانے کی جس کو تمام برادری کے لوگ برا سمجھتے ہیں کوشش نہ کرے گی یہ ایک دوسرے امر محال کا ممکن فرض کرنا ہے۔ جس عورت کو تمام عمر بجز شرم کے اور کوئی چیز سکھائی نہیں گئی اس کی سمجھ ہی میں نہیں آسکتا کہ اپنی خطا کاریوں کی زندہ شہادت گود میں لے کر وہ کسی طرح بھی دوسروں سے نظر چار کر سکے گی۔ اسقاط حمل کی تدبیریں تو گویا لازمی ہیں اس کے بعد اپنی جان دینی یا بچے کی جان لینی دو صورتیں رہ جاتی ہیں۔ چھوٹی قوم یا بے حیا خاندان کا تذکرہ نہیں ہے۔ خاندان جتنا ہی اونچا ہوگا اتنا ہی ان باتوں کا وہاں زیادہ رواج ہوگا گورنمنٹ تک اگر ایسی خبریں کم پہنچیں تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ قوم میں ایسے دل ہلا دینے والے واقعات نادر الوجود ہیں۔

ہندو بیوائیں زبان حال سے گورنمنٹ سے کہتی ہیں۔

اندرون قعر دریا تختہ بندم کردۂ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

جب ہم شوہر کی چتا پر جلنے جاتے تھے اس وقت تو آپ بہت ہی رحیم المزاج اور سراپا ہمدردی کی صورت بن کر سامنے آ کھڑے ہوئے اور ہمیں جلنے اور اس طرح مٹ جانے سے روک رکھا لیکن وہاں سے آ کر جب گھر والوں کی قید میں پڑے ملکی رسم ورواج کی بدولت اذیتیں اٹھانے لگے۔ مردوں کی خود غرضیوں کے شکار بنے طرح طرح مصیبت جھیلنے لگے تو کبھی بھولے سے خبر بھی نہ لی۔

اصل شکایت ہم کو پیشوایان قوم سے ہے کہ جو رسم قدیم موجودہ حالت کے نامناسب

ہے۔ عقل کے خلاف ہے۔ مہذب ملکوں کے چلن کے بالکل مخالف ہے مسلمان قوم اس کے مٹانے کی بالکل کوشش نہیں کرتے بعض مقاموں پر ہندوؤں کے چند معزز پیشواؤں نے عقد بیوگان کا رواج دینا چاہا۔ اس پر چند اخباروں نے اپنی مسرت ظاہر کی اکثروں نے سکوت کیا سکوت کرنے والے بھی غنیمت تھے لیکن ہم کو تو تعجب ان اخباروں پر ہوا جو اس ریفارم کے مخالف ہوئے اور کہنے لگے کہ ہندو مذہب میں کسی طرح بدھوا کا بیاہ نہیں ہو سکتا۔

گورنمنٹ پر ہم ضرور الزام دیتے ہیں کہ وہ اپنی رعایا کے جزو اعظم یعنی عورتوں سے جو کہ مردوں سے تعداد میں زیادہ ہیں بالکل غافل ہے۔ لیکن جب ہم قوم کی ہٹ دھرمی پر خیال کرتے ہیں تو پھر ہمت نہیں ہوتی کہ گورنمنٹ پر نکتہ چینی کریں۔ عمر رضامندی کی میعاد جب بارہ برس مقرر ہونے لگی تو کہیں سے بھی یہ خیال ہو سکتا تھا کہ اس پر کوئی ذی علم باشندہ ہند کا معترض ہوگا؟ اگر بل پیش ہونے سے پہلے یہ سوال مشتہر کیا جاتا تو شاید کہیں سے بھی جواب اثبات میں نہ ہوتا لیکن بل پیش کرنے کے بعد العظمۃ للّٰہ اس قدر شور و غل ہوا کہ گویا گورنمنٹ ہندوستان کے مروجہ مذہب کی جڑ کاٹ رہی ہے۔

خیر جو قوم اپنے نقصانات سے اس درجہ بے خبر ہو وہاں کی گورنمنٹ سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قوم کے پیشواؤں کے خلاف کوئی بات رائج کرے گی ملک داری کی پالیسی کے خلاف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم ہرگز ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ انگلش گورنمنٹ ہندوستان کی عورتوں کے حقوق کی پامالی۔ اخلاقی اور تمدنی حالت میں یوں دیکھتی رہے گی اور کچھ بھی توجہ نہ کرے گی۔ ہمارے نزدیک انھیں برائیوں کے رفع کرنے کے لئے قوم میں تعلیم رائج کی گئی ہے۔ گورنمنٹ نے جو تعلیم کا سلسلہ جاری کیا اس کے ذریعہ سے امید ہے کہ آہستہ آہستہ یہ تمام خرابیاں رفع ہوتی جائیں گی۔ لیکن حیرت ہم کو جب ہوتی ہے کہ یونیورسٹی کے بڑے سے بڑے ڈگری پانے والے اخلاقی اور تمدنی حالت میں ترقی معکوس کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔

جو لوگ بڑی بڑی کتابیں پڑھ کر لمبی چوڑی باتیں کرتے ہیں انھیں پر یہ الزام ہے کہ باوجود اس قدر دانش کے وہ اپنے گھر کی اصلاح میں کوشش نہیں کرتے تمام دنیا کا انتظام کرنا چاہتے ہیں بات بات میں انگلستان کی پارلیمنٹ کا ذکر کرتے ہیں تمام باتوں میں انگریز بنا چاہتے ہیں گورنمنٹ سے اپنے حقوق کے لئے اٹرش قوم سے بھی زیادہ آزادی کے خواہاں ہیں لیکن اس کا ذرا خیال نہیں کہ (جو حقوق عورتوں کے) ہم پر ہیں ان کو کہاں تک ادا کرتے ہیں یا ادا کرنے کی کوشش

کرتے ہیں۔کوئی برا مانے یا بھلا آج تک دنیا میں کسی قوم نے ترقی نہیں کی جب تک اس نے عورتوں کی ترقی اور ان کے حقوق کی حفاظت کی طرف توجہ نہیں کی۔اکثر عورتیں مثل لونڈیوں کے سمجھی جائیں گی یا اولاد پیدا کرنے کے لئے محض ایک بے حس وحرکت مشین مانی جائیں گی نہ ان کے حقوق کا خیال ہوگا اور نہ ان کے آرام، آزادی اور آسائش کی فکر ہوگی تو جو بچے ان سے پیدا ہوں گے وہ بھی غلامی مجبوری اور معطل وجود کا سبق اپنی ماں سے لیں گے اور ایسی حالت میں قوم کیا خاک ترقی کرے گی۔

ہندوؤں میں تمام پرانی باتوں کے بیان کرنے میں ہزاروں لاکھوں برس کا ذکر کرنا تو گویا تکیہ کلام ہوگیا ہے۔لیکن غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے ابتدائی زمانہ جس میں تہذیب کی ضرورت ہی نہ تھی اس کو ست جگ کہتے ہیں اور قومی ترقی کے آغاز کو تریتا کہتے ہیں اور دواپرہ زمانہ ہے جب ترقی حد کو پہنچی۔بہار کے بعد جس طرح خزاں آتی ہے اسی طرح انتہائی ترقی پر پہنچ کر انحطاط کی طرف مائل ہوئی ہندو جب اپنی ترقی کھو کر برے دن دیکھنے لگے تو اس کو کلجگ کہنے لگے اور جس طرح بگڑی ہوئی قوموں میں صرف پچھلے زمانے کے فسانے یادرہ جاتے ہیں اسی طرح اب ہندوؤں میں بھی پچھلی باتیں صرف عام پسند حکایتوں کا پیرایہ رکھتی ہیں اس پر بھی ایک خرابی یہ ہے کہ اگر وہ پچھلی باتوں کو بطور صحیح واقعات کے یادرکھیں تو کچھ کام بھی چلے۔تمام واقعات ان کے مثل فسانے کے ہورہے ہیں اور ان غلط فہمیوں سے جو حالت موجودہ قائم ہے وہی ملکی رواج اور ملکی قانون سمجھی جاتی ہے اور گورنمنٹ بھی آئین جہانداری کے لحاظ سے اس کو قانون کے برابر سمجھنے پر مجبور ہے۔

اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ ہندوؤں میں عقد بیوگان کا دستور کس جگ میں تھا اور کس جگ میں نہیں ہے۔مہابھارت ہندوؤں میں سب سے بڑی تاریخ اور سب سے زیادہ معتبر کتاب ہے یہ دواپر کے اخیر میں لکھی گئی ہے اور تذکرہ ست جگ اور تریتا کی باتیں بھی اس میں بیان کی گئی ہیں۔

بیاس جی اپنی کتاب مہابھارت میں ازدواج کے متعلق قدیم رسم کو یوں بیان کرتے ہیں کہ ست جگ کے آغاز میں عورتوں اور مردوں کا تعلق مثل بہایم کے تھا جب زمانہ نے ترقی کی اور خود غرضی اور خودداری ساتھ ساتھ چلی وسائل معاش میں دقتیں پیدا ہوئیں تو ضرورت اس امر کی ہوئی کہ اولاد کی پرورش کا بار باپ پر ڈالا جائے اور اسی وقت سے یہ خیال پیدا ہوا کہ

جب تعلق ہمبستری کے ساتھ اولاد کی پرورش کا بار لینا باپ کو مرکوز خاطر نہ ہو تو وہ زنا ہے اور ناجائز ہے۔ ابتدائی زمانہ تھا اور ابتدائی قانون تھا اس لئے ایک مرد کے بعد دوسرے مرد کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کے درمیان صرف ایک مہینہ کا انتظار عورت کے حاملہ یا نہ حاملہ ہونے کی جانچ کے لئے ہوتا تھا۔ آخر ست جگ تک اسی قدر زمانہ ترقی کر چکا تھا۔ ترتیا و دواپر میں شادی بیاہ کے قانون میں کچھ کچھ اور ترقی ہوئی۔ لیکن اس بارے میں ہندوؤں کا قانون کبھی سخت نہیں ہوا وہ فطری جذبات کا بہت بڑا احترام کرتے تھے مثلاً دواپر میں مہابھارت کے پانچ ہیرو جن کو پانڈو کہتے ہیں پانچ مختلف باپ سے تھے۔

آخر دواپر میں ایک رشی سویت گیتو گزرے۔ یہ اس زمانے میں تھے۔ جب ہندوؤں کی تہذیب اعلیٰ درجہ کو پہنچ گئی تھی کم سنی میں وہ اپنے باپ سے پڑھ رہے تھے کہ سامنے سے ایک غیر برہمن آیا اور وہ ان کی والدہ کو تخلیہ میں لے گیا رشی جی نے اپنے باپ سے اس مداخلت بیجا پر اپنی ناخوشی ظاہر کی باپ نے اس وقت کے موجودہ قانون پر نظر ڈال کر بیٹے کو سمجھایا کہ یہ بات ابتدائے زمانہ سے چلی آتی ہے اور یہی مناسب بھی ہے اور گویا زبان حال سے یہ کہا کہ فطرتی جوش کا روکنا انسانی قوت سے باہر ہے۔ جیساکہ منو جی نے فرمایا ہے۔ سویت کیتو نے باپ کی توجیہہ پسند نہیں کی اور اسی وقت انھوں نے قلم اٹھاکر قانون بنایا کہ اپنے مرد کے جیتے جی دوسرے مرد سے تعلق پیدا کرنا جرم قرار پاتا ہے اور اس کی سزا وہ قرار پائی ہے جو اسقاط حمل کی ہے تمام قوم نے اس کو پسند کیا اور اس وقت سے زناکاری بہت زیادہ معیوب سمجھی گئی۔ لیکن اس وقت تک ہندوؤں کو کہیں سے یہ خیال بھی نہیں گزرا تھا کہ عقد بیوگان نامناسب ہے۔

چنانچہ ارجن نے ناگ کنیا کے ساتھ اس وقت بیاہ کیا تھا جب پہلے شوہر سے دس برس کا لڑکا اس کے پاس تھا۔

دواپر کے آخر تک یعنی بیدوں کی اعلیٰ ترقی تک کہیں بھی عقد بیوگان کی ممانعت نہ تھی اور نہ قوم کچھ بھی اس سے آگاہ تھی۔

ہم یہاں پر یہ لکھنا مناسب سمجھتے ہیں کہ ہندو مقنن قابل سند صرف اٹھارہ ہیں۔
منو[1]۔ اتر[2]ے۔ بشنو[3]۔ ہاریت[4]۔ جاگیہ ولک[5]۔ اوشنس[6]۔ انگرا[7]۔ جم[8]۔ ایستنب[9]۔ کاتیاین[10]۔ برہسپتی[11]۔ پاراشر[12]۔ بیاس[13]۔ سنکھ ولیکھت[14]۔ دکش[15]۔ گوتم[16]۔ ساتاتپ[17]۔ بششٹ[18]۔
یہ امر مسلمہ ہے کہ سوائے ان اٹھارہ کے دوسرا کوئی ہندو مقنن قابل وقعت نہیں ہے

اور یہ بھی مسلمہ ہے کہ ان لوگوں نے بجائے ممانعت کرنے کے صاف اور صریح لفظوں میں بدھوا بیوہ کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ پاراسر نے کلجگ کے لئے جو مجموعہ قانون بنایا ہے اس کا نام پاراسر سنگھتا ہے اس میں لکھا ہے کہ پانچ حالتوں میں عورتوں کو دوسرا شوہر کرنا جائز ہے۔ (۱) شوہر کی مفقود الخبری (۲) شوہر کے طلاق دینے پر (۳) شوہر کی وفات پر (۴) شوہر کے لئے نامرد ہونے پر (۵) شوہر کے ترک مذہب کرنے پر پھر لکھا ہے کہ شوہر کی مفقود الخبری کی حالت میں اولاد والی برہمنی ۸ سال تک سابق شوہر کا انتظار کرے اور بے اولاد والی ۴ سال تک انتظار کرے اسی طرح چھتری کی عورت کو چھ برس اور تین برس کا عرصہ دیا گیا ہے اور دیش کو چار برس اور دو برس۔ شودر کے لئے کوئی ایام مقرر نہیں ہیں مفقود الخبری کے بعد جب چاہے دوسرا بیاہ کرے ناظرین کے اطمینان کے لئے تھوڑی سی عبارت اصل کتاب سے نقل کی جاتی ہے۔

नष्टे मृते प्रव्रजिते क्लीबे च पतिते पतौ ।०।०।०।

पञ्चस्वापत्सु नारीणां पतिरन्यो विधीयते॥

अष्टौ वर्षाण्युदीक्षेत ब्राह्मणी प्रोषितं पतिम्।

अप्रसूता तु चत्वारि परतोऽन्यं समाश्रयेत्॥

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہندوؤں کے ترقی کے زمانے میں یہ حالت تھی تو اب عقد بیوگان کیوں معیوب سمجھا جاتا ہے اس کے سمجھانے کے لئے مسلمانوں سے زیادہ دوسری تمثیل ہمارے پاس نہیں ہے۔ ان کے قرآن میں حکم ہے "وانکحوا الایامیٰ منکم" خود محمدؐ رسول اللہ نے سوائے ایک بیوی کے اور تمام بیواؤں سے عقد کئے۔ اپنی لڑکیوں کے بھی عقد مکرر کئے تمام صحابہؓ کرام میں بھی ایسا ہی رواج تھا۔ باوجود اس کے اس زمانے کے مسلمانان ہندا اور وہ بھی عام مسلمان نہیں خاص خاص لوگ جو اپنے کو پیغمبرؐ اور صحابہ پیغمبرؐ کی نسل میں بتاتے ہیں عقد بیوگان معیوب جانتے ہیں اسی طرح جب ہندوؤں کے تنزل کا زمانہ آیا تو انھوں نے ترقی کی بہت سی باتیں چھوڑ دیں۔ منجملہ ان کے عورتوں کے حقوق سے بھی وہ بے پروا ہو گئے دختر کشی کی رسم ان میں جاری ہوئی زندہ عورت اپنے متوفی شوہر کی لاش کے ساتھ جلنے لگی عقد بیوگان بالکل مسدود ہو گیا۔

اسی مقام پر ہم ایک تاریخی واقعہ بھی لکھتے ہیں کہ عقد بیوگان کی ممانعت کیونکر شروع

ہوئی۔ کلجگ میں ایک رشی (لیکن کوئی بڑے نامی رشی نہیں) تھے۔ جن کی آنکھیں جاتی رہی تھیں مزاج کے کڑے تھے اور کاہل الوجود تھے۔ ان کی بیوی ان سے سخت متنفر تھی۔ ایک روز دریا کے کنارے وہ نہاتے ہوئے بہہ گئے ان کو خیال گزرا کہ بیوی نے بہا دیا ہے وہ سمجھتے تھے کہ میرے بعد دوسرے سے وہ اپنا لطف قائم کرے گی۔ اتفاق سے وہ کہیں آگے چل کر دریا سے نکلے اور کسی بڑے راجہ کے دربار میں رسوخ پا گئے۔ وہاں انھوں نے یہ قانون جاری کیا کہ کسی حالت میں بیوگان کا عقد نہ ہو۔ تاکہ وہ ہر حالت میں اپنے شوہروں کو مغتنم سمجھا کریں۔ قومی خیالات بھی بدل رہے تھے رشی جی کا بچن سہارا ہو گیا۔

مسلمانوں نے بہت کم دخل ہندوؤں کے رسم و رواج میں دیا اور نہ ہندوؤں نے کوئی اخلاقی بات مسلمانوں سے سیکھنا چاہی بلکہ خود اپنے برے رسم و رواج میں انھوں نے مسلمانوں کو پابند کر لیا۔ جلال الدین اکبر نے خود نیم ہندو ہو کر ہندوؤں کی رسم میں بہت کچھ دخل دینا چاہا عقد بیوگان کو اس نے جاری کرنا چاہا وہ کچھ کامیاب بھی ہو چلا تھا لیکن اس کے مرنے کے بعد پھر دوسرے بادشاہوں نے ادھر توجہ نہ کی۔

اب ہم یہاں یہ لکھنا چاہتے ہیں کہ انگلش گورنمنٹ نے ہندوؤں کی ناجائز رسم و رواج کی کہاں تک اصلاح کی۔

زندہ عورت کا متوفی کے ساتھ جل جانا اور زندہ لڑکیوں کا دریائے گنگ کی نذر کرنا ۱۸۲۹ء میں موقوف ہو گیا۔

غلامی کا دستور ہندوستان میں بہت برا تھا۔ خریداری کے ذریعہ سے ایک شخص دوسرے شخص کو اپنے مویشیوں میں شمار کرتا تھا اور کبھی سرقہ بالجبر اور سرقہ مخفی کے ذریعہ سے بھی غلام حاصل کئے جاتے تھے ۱۸۴۳ء میں گورنمنٹ نے اسکو موقوف کر دیا اور اس کے ساتھ ہی غلامی کے متعلق جتنے شاستری احکام تھے سب تقویم پارینہ ہو گئے۔

جو کوئی بیوہ عورت کے ساتھ یا کسی غیر برادری کی عورت کے ساتھ بیاہ کرے۔ اور جائز تعلق کی حالت میں اولاد پیدا ہو تو گو وہ ہندو لا کے مطابق اولاد صحیح النسب نہ ہو لیکن گورنمنٹ نے لارڈ میو کے وقت میں برہمو سماج کی تحریک پر یہ قانون پاس کیا کہ ایسی اولاد واسطے اغراض وراثت کے اولاد صحیح النسب سمجھی جائے گی۔

دختر کشی کے انسداد کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے بہت کچھ عملی کارروائی کی گئی

ہے اور خاص ایکٹ پاس کیا گیا۔

۱۸۵۰ء میں یہ قرار پایا کہ کوئی شخص تبدیل مذہب کی وجہ سے اس وراثت سے محروم نہ ہوگا جو مذہب تبدیل کرنے کی حالت میں اس کو پہنچتی تھی۔

ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ گورنمنٹ ہند کے اختیار میں جو رفارم ہے وہ اس سے غافل نہیں ہے۔ لیکن لوگ اپنی بیوہ لڑکیوں کو نہ بیاہیں اور ایسا کرنا معیوب سمجھیں تو ظاہر ہے کہ یہ بات گورنمنٹ کے کرنے کی نہیں ہے قوم کے پیشواؤں کے کرنے کی ہے۔

گورنمنٹ اور رعایا کا عجب تعلق ہے۔ جیسی رعایا ویسی ہی گورنمنٹ۔ مہذب رعایا کی مہذب گورنمنٹ۔ غیر مہذب رعایا کی غیر مہذب گورنمنٹ۔ رعایا سخت مزاج اور جاہل ہے تو گورنمنٹ کے لئے بھی سخت مزاجی اور جہالت لازمی ہے۔ رعایا سنجیدہ ہے تو گورنمنٹ کی سنجیدگی بھی یقینی ہے۔ اس اعتبار سے اگر کہا جائے کہ ہندوستان میں بہت سی بے جا رسمیں ایسی ہیں جن کے مٹانے کی طرف گورنمنٹ متوجہ نہیں ہے اور اس لئے اس میں نقص ہے۔ تو یہ کہنا ایک حد تک مناسب ہو سکتا ہے لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو گورنمنٹ بالکل بے قصور ہے اس زمانہ کا دستور جہاں داری پنچائتی قسم کا نہیں ہے۔ اگر گورنمنٹ ایک محکمہ قائم کرے۔ حلقہ بندی کے ذریعہ سے قومی رفارم کی مجلسیں قائم ہوں تو یہ انوکھا دستور تمام مہذب گورنمنٹ کے خلاف ہی نہیں ہوگا بلکہ گورنمنٹ کی طرف سے عوام میں نارضامندی پھیلنے کا سبب ہوگا ... گورنمنٹ جو کچھ کر سکتی تھی اس نے کر دیا اس سے زیادہ اصلاح اس کے اختیار سے باہر ہے۔

عام تعلیم کا سلسلہ قائم کر دیا گیا ہے۔ لوگ پڑھ کر نکلتے ہیں۔ تمام دنیا کے حالات سے واقف ہوتے ہیں۔ قانون قدرت اور انتظام عالم کی ماہیت اور اسرار کم و بیش دریافت کرتے ہیں آزادی ایسی نعمت کی قدر کرتے ہیں۔ جہالت کو برا جانتے ہیں۔ قوموں کے تنزل اور ترقی کے اسباب سے واقف ہوتے ہیں۔ جب ایسے لوگوں کے پیدا کرنے کا بندوبست گورنمنٹ نے کر دیا تو وہ اپنی ذمہ داری سے بری ہو گئی اب ذی علم اور ذی عقل باشندے اپنی تمدنی حالت کی اصلاح کی طرف خود مائل ہوں اور سمجھیں کہ گورنمنٹ نے ان کو اس لئے تعلیم نہیں دی ہے کہ وہ دانشمند ہو کر بے دانشوں کو نہ سمجھائیں قومی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوں قانون فطرت کے اغراض کو نہ سوچیں۔

گورنمنٹ تعلیم پر بے انتہا روپیہ اس لئے صرف کرتی ہے کہ قومی اصلاح خود رعایا کی

اخلاقی حالت درست ہو ایک ذی علم ہزاروں لاکھوں جاہلوں کا رفارم کر سکتا ہے جو کوئی لکھ پڑھ کر اور اعلیٰ تعلیم سے بہرہ یاب ہو کر عوام کی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور رفارم میں سعی کرنے سے گریز کرتا ہے تو وہ بالکل گورنمنٹ کے منشا اور گورنمنٹ کی امیدوں کے خلاف کرتا ہے اور قوم کے حقوق ادا کرنے میں سخت پہلو تہی کرتا ہے۔ غرض کہ الزام انھیں پر ہے جو کچھ کر سکتے ہیں اور نہیں کرتے۔

فصل نمبر ۴۳

امہات مومنین ۔ ازواج مطہرات رسولؐ

آنحضرتؐ نے سب سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے نکاح کیا حضرت خدیجہؓ کی پہلی شادی ابوہالہ بناش سے ہوئی تھی ان کے مرنے پر دوسرا بیاہ عتیق بن عابد سے ہوا۔ پہلی شادی سے دو بیٹے ہند اور ہالہ دونوں زندہ تھے اور دونوں آنحضرتؐ پر ایمان لائے تھے دوسرے خاوند سے ایک بیٹی تھیں وہ بھی ہند کے نام سے مشہور تھیں۔ تیسرا نکاح ان کا چالیس برس کی عمر میں آنحضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ انھیں کے بطن سے حضرت فاطمہؓ پیدا ہوئیں اور حضرت فاطمہؓ کی اولاد سید کہی جاتی ہے اور غالباً اور لڑکیوں سے سلسلہ اولاد قائم نہ ہوا۔ ہندوستان میں جو جتنا ہی شریف ہے اتنا ہی عقد بیوگان کو معیوب جانتا ہے عقد بیوگان کو سادات اپنی ہتک سمجھتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ انکی دادی حضرت خدیجہؓ اپنا تیسرا نکاح نہ کرتیں تو زمانہ انکی سادات سے خالی رہتا جو اپنے وقت میں فخر روزگار تھے اور اب بھی وہ سادات فخر زمانہ سمجھے جاتے ہیں جو احکام شرع کے عامل باعمل ہیں یہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ حضرت خدیجہؓ نسل قریشی سے تھیں۔ تمول۔ عقل اور خوش اخلاقی کی وجہ سے ایام جاہلیت میں بھی مکہ کی تمام عورتوں میں ممتاز تھیں اور طاہرہ انکا لقب تھا۔

حضرت سودہؓ قریش کی نسل سے تھیں پہلا نکاح ان کا سکران ابن عمر سے ہوا تھا اور دوسرا نکاح آنحضرتؐ سے ہوا۔ پہلے نکاح سے عبدالرحمن صحابی تھے جو کسی لڑائی میں شہید ہوئے۔

حضرت حفصہؓ حضرت عمر فاروقؓ کی بیٹی پہلے خنیس سے بیاہی تھیں حضرت خنیس بدری صحابی تھے ان کی وفات پر حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ سے حضرت حفصہ کو بیاہنا چاہا۔ حضرت عثمانؓ نے کہا اچھا میں غور کر کے جواب دوں گا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ شادی نہ کروں۔ پھر حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے درخواست کی یہ چپکے ہو رہے ہاں نہیں کچھ بھی نہیں کہا۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ مجھے ابو بکرؓ کا سکوت برا معلوم ہوا لیکن جب آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ کا پیغام بھیجا اور میں نے ان کو آپ سے بیاہ دیا اس وقت معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ سرور کائنات حضرت حفصہؓ کا ذکر حضرت ابو بکرؓ سے کر چکے تھے اور یہی وجہ حضرت ابو بکرؓ کے سکوت کی تھی۔

حضرت ام سلمہ بھی قریش النسب تھیں پہلا نکاح ان کا عبداللہ ابن عبدالاسد ابن مغیرہ سے ہوا۔ عبداللہ کی کنیت ابو سلمہ تھی۔ یہ بدری صحابی تھے ابو سلمہ کے انتقال پر ام سلمہؓ آنحضرتؐ کی زوجیت میں داخل ہوئیں۔ پہلے شوہر سے دو بیٹے سلمہ اور عمر اور دو بیٹیاں درہ اور زینب پیدا ہوئیں۔ سلمہ کو امامہ بنت امیر حمزہ سے آنحضرتؐ نے بیاہا تھا۔ عمر کو حضرت علیؓ کے وقت میں فارس اور بحرین کی حکومت ملی تھی۔

حضرت ام حبیبہؓ سردار مکہ ابو سفیان کی لڑکی تھیں یہ اپنے خاوند عبیداللہ بن جحش کے ساتھ حبش کو ہجرت کر گئیں۔ وہاں عبیداللہ کے مرنے پر تنہا رہ گئیں۔ عمر ابن عمیہ ضمیری کو بھیج کر آپ نے نجاشی بادشاہ حبش کو اپنا وکیل کیا اور اس نے آنحضرتؐ کے ساتھ ام حبیبہ کا عقد کیا اور ان کو آنحضرتؐ کے پاس مدینہ بھیج دیا۔

حضرت زینبؓ بنت جحش پہلے زید بن حارثہ کے عقد میں تھیں۔ زید نے طلاق دی تب آنحضرتؐ نے خواستگاری کی اور زید ہی کو پیغامبر بنایا۔ اس وقت تک آیتہ پردہ نازل نہیں ہوئی تھی۔ حضرت زینب نے زید کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ اور رسول اللہ کا پیغام سن کر کہا کہ میں نماز پڑھ لوں تو جواب دونگی۔ اسی اثنا میں آیت اتری۔

"جب زید اس سے اپنی غرض پوری کر چکا یعنی طلاق دے چکا تو ہم نے اس کو تجھ سے بیاہا تا کہ مومن اپنے لے پالکوں کی بیویوں سے عقد کرنے میں جب وہ مطلقہ ہو جائیں کوئی حرج نہ سمجھیں"[1]

---

[1] فلما قضی زید منہا وطراً زوجناکہا لکیلا یکون علی المومنین حرج فی ازواج ادعیاءہم اذا قضوا منہن وطرا۔

آنحضرتؐ زید کو بہت مانتے تھے ۔ گویا وہ آنحضرتؐ کے منہ بولے بیٹے تھے ۔ منافق کہنے لگے کہ آنحضرتؐ نے اپنی بہو سے نکاح کیا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ۔

"محمدؐ تم میں سے کسی مرد کا باپ نہیں ہے رسول ہے اور خاتم النبیین ہے "۔

ممکن ہے کہ اس وقت آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زینبؓ کو اپنی زوجیت میں قبول کرنا جہلا کے نزدیک نامناسب امر ہو ۔ لیکن اس زمانے کی موجودہ حالت پر نظر رکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آنحضرتؐ کا فعل بڑی ہی مصلحت پر مبنی تھا ۔ پیغمبرؐ نے ہر طور پر نکاح کی آزادیوں کا سبق خود اپنے فعل سے اپنی امت کو دیا ہے ۔ لیکن افسوس ہے کہ نکاح کے معاملات کو لوگ نہیں معلوم کس طرح ڈراونا بھیانک غیر معمولی وحشت انگیز معاملہ سمجھنے لگے ۔

نکاح سے اصل غرض یہ ہے کہ لوگ زنا سے بچیں زنا میں مختلف عوارض لاحق ہونے اور روز کے جھگڑے قضیے پیدا ہونے کے علاوہ ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ پرورش اولاد کے لئے کوئی مناسب طریقہ پیدا نہیں ہوتا اور انتظام عالم میں فتور واقع ہونے کا احتمال ہوتا ہے عورتوں کی طرف سے مردوں کا اور مردوں کی طرف سے عورتوں کا میلان طبع قانون فطرت ہے اس کا توڑنا خدا سے لڑنا ہے شرع نے اس میلان طبع کو ذرا مقید اور مہذب کرنا چاہا ہے کہ زنا کی حالت پیدا نہ ہو یا یہ کہ زنا سے انسان کا عملی طور پر بچنا آسان قرار دینے کے جتنے وسائل تھے ان کا نکاح ، طلاق ، خلع وغیرہ مسائل متعلقہ زناشوئی میں لحاظ رکھا گیا اب ان سیدھی سیدھی پاک باتوں کو اپنی جہالت سے کوئی تماشا بنائے تو یہ مرض لاعلاج ہے (دیکھو زناکاری فصل بست و دوم)

حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے معاملات میں بہت کچھ شرعی تعلیم کی گئی ہے ۔ سوا زید کے اور کسی صحابی کا نام قرآن میں نہیں ہے ۔ حضرت زید ایک شریف عرب کے لڑکے تھے ایک ظالم کسی طرح انکو پکڑ کر لے گیا ۔ پیغمبرؐ خدا کے ہاتھ یہ غلام ہو کر بکے ۔ جب ان کے باپ کو خبر ہوئی تو وہ لینے آئے ۔ پیغمبرؐ نے آزاد کر دیا ۔ لیکن وہ ایسے مہربان کا ساتھ کب چھوڑنے والے تھے ۔ وہ اپنے گھر نہ گئے اور آزاد ہو کر پیغمبرؐ ہی کے پاس رہنے لگے آنحضرت نے ان کو بیٹے کی طرح پالا یہ جوان ہوئے تو چاہا کہ اپنی پھوپی زاد بہن زینب کے ساتھ ان کو بیاہ دیں ۔ حضرت زینب اور ان کے بھائی عبداللہ نے زید کی سابق غلامی پر نظر کر کے تامل کیا اس وقت یہ آیت اتری ۔

"کسی مسلمان مرد یا عورت کو زیبا نہیں ہے کہ جب خدا اور رسول ان کے کام میں حکم دیں تو وہ پھر اپنی رائے کو دخل دیں"[1]

ظاہر ہے کہ اس آیت سے صرف یہ مقصود تھا کہ ایک دوسرے کو صرف خارجی اسباب کی وجہ سے معاملات نکاح میں ذلیل نہ سمجھے۔ حضرت زینب نے بیاہ تو کیا لیکن یہ خیال دل سے نہ گیا کہ غلام کو انھوں نے شوہر بنایا ہے۔ حضرت زید کو حضرت زینب سے ہمیشہ بے لطفی رہی پیغمبرؐ خدا نے سمجھایا لیکن اس سے بھی کام نہ نکلا تو حضرت زید نے حضرت زینب کو طلاق دیدی اختلاف مزاج کی حالت میں فریقین کے لئے طلاق سے عمدہ کوئی دوسرا چارہ کار نہیں ہوتا ممکن ہے کہ اس طلاق سے حضرت زینب کچھ ملول ہوئی ہوں۔ ان کو یہ خیال ہوا ہو کہ غلام نے بھی مجھے اپنے قابل نہ سمجھا۔ آنحضرتؐ نے انکی تسکین کے لئے خود اپنی زوجیت میں ان کو لینا چاہا اور زید ہی کی معرفت پیغام نکاح بھی بھیجا۔ حضرت زینب کے پہلے نکاح میں آیت قرآنی نازل ہوئی تھی انھوں نے ایک شان بے اعتنائی سے فرمایا یا اقتضائے فرط غم سے یہ کہا کہ جیسا خدا حکم دے گا کیا جائے گا۔ کیا عجب کہ حضرت زینب کو بھی پیغمبرؐ خدا کے ساتھ نکاح کرنے میں وہی تامل تھا جو منافقوں کے دل میں آیۂ قرآنی اترنے کے بعد بھی قائم تھا اور یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب حضرت زینب کا پہلا نکاح وحی سے حضرت زید کے ساتھ ہوا تھا تو وہ دوسرے نکاح کے لئے بھی نص قرآنی کی منتظر تھیں۔ حکم ہوا کہ "زوجنا کہا" جیسا اوپر پوری آیت پڑھ کر بیان کیا گیا ہے۔ حضرت زینب کے سمجھنے کو یہ کافی تھا وہ نہایت مسرت سے پیغمبر خدا کی زوجیت میں داخل ہو گئیں۔ لیکن منافقین اس پر بھی ہنستے تھے۔ منافقوں کی شان میں تیسری آیت اس مضمون کی نازل ہوئی کہ محمدؐ کسی کا باپ نہیں ہے یعنی یہ خیال کہ لے پالک کی بیوی سے نکاح بیجا ہے بالکل غلط ہے۔ یہ سب اہتمام صرف اس لئے تھا کہ امت محمدیؐ کو نکاح کی حقیقت معلوم رہے۔ لیکن افسوس کہ لوگ پھر بھی اسے نہیں سمجھتے۔

حضرت زینبؓ بنت خزیمہ بھی آنحضرت کی ازواج مطہرات سے ہیں۔ پہلے ان کے کئی نکاح ہو چکے تھے۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ آنحضرتؐ سے ان کا نکاح پانچواں تھا۔

حضرت میمونہؓ کی نسبت بھی مشہور ہے کہ آنحضرتؐ سے انکا تیسرا یا پانچواں نکاح تھا۔

---

[1] کان لمؤمن ولا مومنة اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لہم الخیرة من امرہم۔

حضرت جویریہؓ جب آنحضرتؐ کے نکاح میں آئیں اس وقت ان کا پہلا شوہر مرچکا تھا آنحضرتؐ کے ساتھ ان کا دوسرا نکاح تھا۔

حضرت صفیہؓ کا نکاح آنحضرتؐ کے ساتھ تیسرا تھا۔

ایک اعتراض پیغمبرؐ خدا پر یہ کیا جاتا ہے کہ وہ شہوت پرست تھے ان کو اتنی بہت سی بیویوں کی کیا ضرورت تھی۔ شہوت پرست ہونے کی نسبت تو یہ کہنا کافی ہے کہ آپ کبھی زنا سے متہم نہیں ہوئے۔ پچیس برس تک آپ نے کسی عورت سے قربت نہیں کی اور عین شباب کو ستر اسی برس کے بڈھوں کی طرح کاٹا اس کے بعد شادی بھی کی تو اپنے سے زیادہ عمر والی عورت سے کی۔ ۲۵ برس کے بعد آپ نے عقد نکاح کرنے شروع کئے۔ وفات تک سات بیویاں موجود تھیں لیکن ان بیویوں میں بجز حضرت عائشہؓ کے اور کسی بکر سے آپ نے عقد نہیں کیا برابر بیواؤں ہی سے عقد کیا۔ سب سے زیادہ آپ عائشہؓ کو چاہتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی عدل کا بھی خیال رکھتے تھے ان عورتوں کا بڑھنا گویا حضرت عائشہؓ ایسی پیاری بیوی کی ملاقات میں فرق ڈالنا تھا۔ اور اس لئے یہ قیاس کہ یہ عورتیں لطف بڑھانے کے لئے عقد نکاح میں لائی گئیں بالکل قائم نہیں ہوتا۔ جس فقر و فاقہ سے آپ بسر کرتے تھے وہ اظہر من الشمس ہے نہ آپ کی زوجات کے گھر درست تھے نہ آپ کے پاس اور کوئی سامان عیش و نشاط تھا۔ کیا شہوت پرستی کے یہی نشان ہیں کہ مسن بیوائیں گھر میں بند کر کے ان کے ساتھ چٹائی چمڑے کی کھال پر سویا جائے۔ اور فقر و فاقے سے بسر کی جائے؟ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر اتنی بیویوں کے بڑھانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب تھوڑے غور کے بعد بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ آنحضرت قانون زبانی جاری کرنے آئے تھے قرآن تو گویا ایک اصول کی کتاب ہے فقہ کے مسئلے حدیث کو قرآن کے ساتھ ملا کر پیدا کئے گئے ہیں۔ حدیث نقل کرنے کے ذریعہ تھے اصحاب۔ غیر عورتوں سے صحبت رکھنا مناسب نہ تھی اور جو باتیں فقہ کی عورتوں سے متعلق ہیں وہ مردوں کے سامنے بیان کرنے کی نہیں تھیں اور نہ مردوں کے پوچھنے کی تھیں۔ یہی باعث تھا کہ اتنی بہت سی عورتیں آنحضرت کے پاس تھیں جن کی بدولت آج حیض۔ نفاس۔ طہارت وغیرہ وغیرہ کے مسئلے اور نیز بہت سی باتیں ازواج مطہرات سے دوسری مسلمان عورتوں کو معلوم ہوئیں اور پھر ان کے ذریعہ سے عام مسلمانوں میں پھیلیں۔ ایک یہ غرض بھی تھی کہ لوگ بیواؤں سے عقد کرنا عیب نہ سمجھیں۔ بکر کے ساتھ نکاح کرنا ہر زمانے میں انسانی طبیعت کا مقتضا رہا ہے۔ پیغمبرؐ خدا نے چاہا کہ لوگوں

میں بیواؤں کے عقد ثانی کی تحریص اپنے فعل سے پیدا کریں باوجود اس کے آنحضرتؐ کے بعد ہی ایران میں "زن بیوہ مکن اگرچہ حور است" کا مقولہ جاری ہوا اور پھر ہندوستان میں آکر تو بیواؤں سے عقد کرنا بند ہی ہو گیا۔ اگر پیغمبر صاحب کی سنت نہ ہوتی تو شاید شرعی تحریم بھی قائم کر لی جاتی۔ یہ غلط مشہور ہے کہ ہند کے مسلمان اپنی بیوہ بہنوں اور بیوہ لڑکیوں کا عقد نہیں کرتے۔ وہ خوشی سے کریں لیکن کوئی منظور بھی کرے کیا وہی کرتے پھریں خدمت گاروں کے سر منڈھ دیں بیچارے کیا کریں۔ بیواؤں کے ساتھ شادی کرنے میں تو لوگ خود رکتے ہیں اور مشہور یہ کر رکھا ہے کہ بیوہ لڑکیوں کے ساتھ بیاہنے پر ان کے اولیا راضی نہیں ہوتے۔ چھوٹی چھوٹی حیثیت کے آدمی بھی اپنے لئے بکر ہی تلاش کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ شاہ دارین محمد مصطفیؐ کے عقد میں بجز حضرت عائشہؓ کے تمام بیوائیں تھیں۔

ایک ملکی مصلحت بھی ان بیاہوں میں شامل تھی وہ یہ کہ مختلف قبیلوں میں شادی کرنے سے آنحضرتؐ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے جاں نثاروں کا گروہ بڑھ جائے گا۔ اس وقت کے دستور کے مطابق ایسا خیال ایک ملکی مسئلہ تھا اور بڑے مصالح پر مبنی تھا۔

فصل نمبر ۴۴

عدالتی کارروائی

عہدۂ قضاء

مسلمانوں میں شروع شروع عہدۂ قضاء جدا نہ تھا پیغمبرؐ اور ان کے بعد خلفاء اربعہ دینی اور دنیاوی احکام برابر تعلیم کرتے تھے۔ نماز پڑھاتے تھے بیت المال کی حفاظت کرتے تھے۔ احکام شرع بتاتے تھے ان کے اجرا اور نفاذ کے نگراں رہتے تھے۔ فوجی احکام بھی صادر کرتے تھے۔ بنو امیہ کے زمانے میں یہ طریقہ نہ رہا۔ کچھ تو خلیفہ وقت کی عدیم الفرصتی (وہ کسی سبب سے ہو) باعث ہوئی اور کچھ عوام کا خیال خلفاء وقت کی نسبت ایسا ہوا کہ وہ تمام امور میں خود کو مدار المہام رکھنا خلاف مصلحت سمجھے۔ جدا جدا عہدے قائم ہونے لگے تو عدالتی کارروائی کے لئے قاضی القضاۃ اور ان کے ماتحت قاضیوں کا تقرر ہوا اور قاضی کی مدد کے لئے مفتی مقرر کئے گئے (جیساکہ اب یورپ میں ججوں کے ساتھ اسیسر اور جوری کام کرتے ہیں) بنو عباس کے عہد میں بھی یہی قاعدہ جاری رہا۔ عوام سے قاضیوں کو زیادہ تعلق رہتا ہے اور انسان سب برابر نہیں ہوتے اس لئے قاضیوں کی عیب جوئی کے اشارات شروع ہی سے قصہ کہانیوں کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ اسلام کے زمانہ عروج میں قاضیوں کے انتخاب میں بڑی احتیاط کی جاتی تھی محض فضیلت کی پگڑی بندھ جانا یا کوئی امتحان پاس کر لینا اس عہدہ کا مستحق نہیں ٹھہراتا تھا اس عہدہ کے لئے بہت سی شرطیں تھیں جو قاضیوں کے تقرر کے وقت ملحوظ رکھی جاتی تھیں فقہ کی ایک چھوٹی سی کتاب کنز کی عبارت کا ترجمہ ہے وہ چاہیئے کہ قاضی بد مزاج، سنگدل سرکش

اور دشمنی کرنے والا نہ ہو۔ قاضی ایسا شخص ہونا چاہیئے جس کی پرہیزگاری، عقل، صلاح، سمجھ حدیث دانی اور صحابہؓ کے قول اور شریعت کی راہوں کے عالم ہونے پر اعتماد ہو۔ مفتی کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ کوئی شخص قاضی کو ہدیہ بھیجے تو قاضی اسے واپس کردے۔ دعوت بھی قاضی کسی کی قبول نہ کرے۔ خصوصاً وہ جو صرف قاضی ہی کی دعوت ہو۔

قاضی کی تہذیب اور خلق کی نسبت محکوم ہے۔

"نماز جنازہ اور مریض کی عیادت کے لئے قاضی کو جانا چاہیئے۔ مدعی اور مدعی علیہ دونوں کو قاضی برابر بٹھلائے اور دونوں کی طرف توجہ کرے اور ایک سے کان میں بات نہ کرے اور نہ اشارہ سے کچھ کہے۔ نہ کسی کو ان میں سے حجت سکھائے اور نہ کسی کو مدعو کرے۔ نہ کسی سے ہنسی کرے اور نہ گواہ کو گواہی دینے کا طریقہ سکھائے۔

قاضیوں کا انتخاب شروع شروع بڑے اہتمام سے کیا جاتا تھا۔ مشہور ہے کہ اخیر زمانہ بنو امیہ میں امام محمد ابن مالکؒ اور شروع زمانہ بنو عباس میں امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ عہدۂ قضا کے نامنظور کرنے سے مورد عتاب سلطانی ہوئے تھے۔ ممکن ہے کہ سلطان وقت کو محض ان کی لیاقت ذاتی کی وجہ سے ان کا قاضی القضاۃ مقرر کرنا مناسب معلوم ہوا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ملکی مصالح مقتضی ہوئے ہوں کہ ایک با اثر شخص کا ملازمت میں داخل ہو جانا استحکام سلطنت کا باعث ہوگا۔ ان بزرگان دین کے انکار کی وجہ یہ مشہور ہے کہ اتنا بڑا بار لینا انھوں نے پسند نہ کیا۔ لیکن ممکن ہے کہ یہ وجہ نہ ہو۔ جو بار پیغمبرؐ خدا اور خلفائے راشدین نے اٹھایا اس کے اٹھانے کی عزت سے گریز کرنا اعلیٰ درجہ کی حب الوطنی کے خلاف نہیں تو اس کے موافق بھی نہیں ہے۔ میری سمجھ میں انکار کی وجہ ایک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دربار خلافت سلاطین عجم کا رنگ پکڑ رہا تھا ان سیدھے سادے مسلمانوں نے خلاف دانش تصور کیا کہ سلطان وقت کے ملازم ہو کر اس کے جائز اور ناجائز احکام کی پیروی سے اپنی ورع میں فرق ڈالیں یا ان سے روگردانی کر کے خود کو مورد عتاب سلطانی قرار دیں۔

جس طرح ہندوستان کے فاتحین اعلیٰ درجے کے اوصاف ساتھ نہیں لائے اسی طرح یہاں کے قاضی اور مفتی بھی اعلیٰ درجہ کے اوصاف سے متصف نہیں تھے۔ وجہ یہ تھی کہ عربوں کی سلطنت یورپ افریقہ اور ایشیا میں نابود ہونے کے بعد یہاں اسلام پہنچا اور ہم نے بار بار ثابت کیا ہے کہ اسلام کی حالت اپنے عجائبات کے ساتھ اسی وقت تک نمونہ قدرت تھی جب تک وہ عربی

النسل خلفا کی حمایت میں تھا ہم کیا تمام یورپین مورخ یہی رائے رکھتے ہیں اور اس بارہ میں غیروں ہی کی رائے زائد مستند ہو سکتی ہے۔ فاتحان ہندوستان کی کیا حالت تھی اس کے لئے ہند اور اہل اسلام فصل ۲ پڑھیئے۔ لیکن فاتحین ہند سے قاضیان ہند نسبتہً اچھے تھے اور اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ برابر قریشی النسل علماء سے منتخب کئے جاتے تھے۔ قرآن وحدیث پڑھنے سے ایک خاص صلاحیت ان میں پیدا ہو جاتی تھی۔ فوجی مالی اور ملکی خدمتیں ترک تاتار اور مغل انجام دیتے تھے۔ ہنود بھی ان خدمتوں پر مامور ہوتے تھے۔ لیکن قاضیوں اور مفتیوں کا گروہ زائد تر مسلمان اور وہ بھی عرب یا عربی النسل عجمی مسلمانوں سے منتخب کیا جاتا تھا وہ لوگ ہندوستان میں اسی طرح آتے تھے جس طرح اب سویلین انگلینڈ سے آتے ہیں فرق اتنا ہے کہ یہ امتحان پاس کر کے اور تقرری کا پروانہ لے کر چلتے ہیں اور وہ علم و ہنر اور قومی امتیاز کے بھروسہ پر چلتے تھے اور آتے ہی خدمتوں پر مامور ہو جاتے تھے۔ ابن بطوطہ کا سفرنامہ پڑھنے سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے دربار شاہی میں کس درجہ اس کی آؤ بھگت ہوئی تھی اور بہ جبر یا با خوشی عہدۂ قاضی القضاۃ اسے دیا گیا تھا۔ تاریخ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ محمد تغلق نے خلیفہ بغداد سے جو اس وقت ترکوں کے ہاتھ میں شاہ شطرنج سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا خطاب اور سند سلطنت نہایت شوق سے حاصل کی ہندوستان میں جتنے گھرانے قاضیوں کے ہیں اکثر ان میں عربی النسل ہیں اور جتنے عربی النسل خاندان ہندوستان کے مختلف حصوں میں آباد ہیں انکو کم وبیش ملکیت زمین بھی شاہوں نے عطا کی تھی اور اس لئے اکثر حصص ہند میں ملکیوں سے انکی اولاد کو تعبیر کرتے ہیں انھیں امور پر لحاظ کر کے میرا خیال ہے کہ عربی النسل علماء کو شاہان ہند مختلف حصص ہند میں آباد کرتے تھے جاگیریں دیتے تھے عہدے عطا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اسلامی تہذیب ان کے ذریعہ سے پھیلے گی اور شرائع اسلام سے یہ لوگوں کو واقف کریں گے اور ایک حد تک اس میں کامیابی بھی ہوئی کیونکہ گئی گذری حالت میں بھی ہندوستان کی عدالتوں کا انتظام اور صیغہ جات کے انتظام سے اچھا تھا قاضیوں اور مفتیوں نے ان فتاویٰ سے جو انکے بہت پہلے مدون ہو چکے تھے اعلانیہ طور پر کبھی گریز نہیں کیا اور علمائے عصر نے احکام فقہ کو جس حد تک اس میں پہلے ترقی ہو چکی تھی بدستور قائم رکھا زمانہ انحطاط میں اس سے زائد اور کیا امید ہو سکتی تھی ہمارے بیان کے ثبوت میں برٹش گورنمنٹ کا طرز عمل پیش کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اس نے نظامت میں مداخلت

پسند نہیں کی تمام صیغوں کے انتظامات درست کرنے کے بعد اخیر میں ادھر توجہ کی۔ ضعف سلطنت مغلیہ کے باعث جتنے خطرات پیدا تھے ان میں سب سے کم خطرناک یہی صیغہ سمجھا گیا اور ایک طبیب حاذق کے طور پر تمام دیگر امراض کے رفع کرنے کے ... بعد الیسٹ انڈیا کمپنی نے ادھر توجہ کی۔

دیوالیہ

قید کی سزا دَین کے باقی رہنے پر مسلمان بھی دیتے تھے اور مفلسی ثابت ہونے پر وہ رہا بھی کرتے تھے لیکن شے بیعہ کے زر ثمن مہر مجل یا ضمانت کے مواخذہ میں جو کوئی قید ہوتا تھا اس کی مفلسی اس کی رہائی کی مانع نہیں ہوتی تھی گویا نادار کے لئے قرض لینا یا مہر مجل مقرر کرکے کسی عورت کو دھوکہ دینا یا ناداری کی حالت میں کسی کا ضامن ہو جانا ایک قسم کا جرم فوجداری تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ قانون اسی وقت مناسب تھا جب کل احکام شرع زیر عمل تھے سودی بہوار بند تھا قرض حسنہ سے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں خرید و فروخت زائد تر نقد ہوا کرتی تھی اب کہ تمام تجارت ایک قسم کی قمار بازی ہو رہی ہے نہایت ہی نیک نیتی سے روزگار کیا جائے جب بھی دیوالہ نکل جاتا ہے قید کی سزا نادار مدیون کو دینا مناسب نہ ہوگا۔ دیکھئے "زناکاری فصل[۲۲]" جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ احکام شرع اسی وقت بنی نوع انسانی کے مہذب کرنے والے ہو سکتے ہیں جب ان پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر بجائے نفع کے ضرر پہنچاتا ہے۔

پنچایت

پنچایت کے قاعدے مسلمانوں میں ایسے ہی تھے جیسے کہ اب ہندوستان میں رائج ہیں ـــ متخاصمین اپنی نزاع کے فیصلہ کے لئے جب کسی کو منتخب کرتے تھے تو حاکم عدالت پر اسے ترجیح دیجاتی تھی۔

فصل نمبر ۴۵

شہادت

شہادت کا قانون بھی مسلمانوں میں مثل اور قوانین کے بہت زائد مکمل ہے معاملات کی سادگی اور راستبازی اور قوم کی مردانگی اور عالی حوصلگی کے اصول پر اس کے مسائل متفرع ہیں مسلمانوں میں یہ طریقہ نہیں ہے کہ فریقین کے گواہ گزریں اور پھر عدالت غور کرے کہ کن کے گواہ سچے ہیں۔ نہایت برا نظارہ ہے کہ دو میں سے ایک ضرور دروغ حلفی کرتا ہے اور عدالت مجبور رہے کہ جھوٹے کا کچھ نہیں کر سکتی اور روز بروز عوام میں دروغ حلفی ترقی کرتی ہے۔

باب جرائم میں گواہوں کی تعداد اور ان کے متعلق احکام پورے طور سے بیان ہو چکے ہیں۔ رہے دیوانی کے معاملات ان کے لئے بہت مختلف صورتیں ہیں۔ مختلف حالتوں کے لئے مختلف طریقے فتاویٰ کے ذریعہ سے قائم ہوئے ہیں گواہوں کی تعداد معین کر دی گئی ہے شہادت کس کو دینا چاہیئے بتا دیا گیا ہے۔ مختلف معاملات کے لئے مختلف طریقے جو مناسب حال تھے قائم ہو گئے ہیں فقہ کی کتاب سامنے رکھ کر تمام صورتوں کا خیالی نقشہ جما کر ذہنی عدالت قائم کی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ اس سے اچھی صورت نوع انسانی کی حاجت براری کے لئے جہاں تک اس کو مخاصمت سے تعلق ہے پیدا نہیں ہو سکتی۔ تمام صورتوں کا بیان کرنا مضمون کی طوالت کا باعث ہو گا۔ ایک صورت شفع کی بیان کرنے سے سمجھ میں آ جائے۔ کہ کیسی سنہری حالت مسائل شرعیہ کی ہے۔

شفعہ

مسئلہ شرع یہ ہے کہ اگر کوئی اپنا مکان فروخت کرے تو مکان کے شریک یا پڑوسی کو یا اس شخص کو جو اس راہ میں شریک ہو جو مکان بیعہ تک جاتی ہے یہ حق ہوتا ہے کہ جتنا روپیہ مشتری نے دیا ہے اتنا ہی دے کر خود وہ مکان لے لے اس حق کو حق شفعہ کہتے ہیں۔ پیغمبر خدا کی حدیث سے یہ حق مسلمانوں میں قائم ہوا ظاہر ہے کہ نیک نیتی اور صفائی سے اس حق کا نفاذ کیا جائے تو بے انتہا آسائش کے ذریعے اس سے تمدنی حالت میں پیدا ہو سکتے ہیں یہ قانون اسلام کی خصوصیات سے ہے۔ دنیا میں اور کہیں یہ قانون نہیں تھا اب جہاں ہے مسلمانوں سے ماخوذ ہے لیکن اگر بدنیتی سے اس کا نفاذ کیا جائے تو اس سے زائد مضر اور آزادی کا روکنے والا کوئی دوسرا قانون نہیں ہو سکتا۔ اب شرعی مقننوں نے بدنیتی کی روک تھام کے لئے اس کے متعلق شہادت میں ذرا سختی قائم کی ہے اور وہ سختی بجائے خود نہایت سادہ اور سیدھے طریقے پر مبنی ہے۔ یعنی شفیع کے لئے یہ حکم ہے کہ جب وہ عدالت میں آئے تو حلف سے کہے کہ بیع کی خبر سننے کے ساتھ ہی میں نے اپنی رائے خریداری کے متعلق قائم کی تھی۔ . . . . . . اگر کسی وجہ سے حلف لینے کے لئے نہ آسکے تو اس کو گواہوں کے ذریعے سے بھی ثابت کر سکتا ہے۔ اول درجہ تو یہ ہوا اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ پھر وہ گواہوں سے ثابت کرے کہ محض ارادہ قایم کر لینے پر وہ مکتفی نہیں ہوا بلکہ مشتری کے پاس یا شئے مبیعہ کے پاس پہنچ کر فوراً اپنا ارادہ دو گواہوں کے سامنے ظاہر کر دیا یہ سادہ سادہ مسائل ہیں اور ان کا نام طلب مواثبت اور طلب اشہاد رکھا گیا ہے۔ اب دونوں لفظوں اور ان کے مفہوم کے سمجھنے میں اس قدر غلطیاں ہوئیں کہ ان مسائل کے مصالح نظر انداز ہو گئے اور ان امور کا گواہوں سے کہلانا ایک قسم کی رسم کا ادا کرنا سمجھا گیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ حق شفعہ سے اگر طلب مواثبت اور طلب اشہاد نکال ڈالئے تو حق شفعہ بجائے تمدنی حالت درست کرنے کے اس کا مخرب ثابت ہوتا ہے پڑوسی پورا دام نہیں دیتا اغیار شفع سے ڈرتے ہیں بیچنے والا مبتلائے عذاب ہے اگر کسی نے دل کڑا کر کے خرید بھی لیا تو ایک سال تک وہ اپنی حالت غیر محفوظ پاتا ہے۔ سال بھر میں حالتیں بدل جاتی ہیں ارادوں میں انقلاب پیدا ہوتا ہے سال کے ختم پر ایک ایسے شخص نے دعوئ شفعہ کا ارادہ کیا جو شروع سال میں گداگری پر بسر کرتا تھا استطاعت خریداری بالکل نہیں رکھتا تھا دیکھیے خریدار کے لئے کتنی بڑی زحمت کا سامنا

ہوا۔ غرض کہ عدالتی کارروائیوں میں بھی بڑے بڑے مصالح اور نکات ہیں جن سے واقف ہونے اور ان پر غور کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ شرع محمدی نے اپنے دلوں میں بہت کچھ آسائش بندگان خدا کو پہنچائی ہیں لیکن یہ بھی واضح رہے جیساکہ میں باربار کہہ چکا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ شرع محمدی تمام اصول کے ساتھ متعلق کی جائے جب ہی اس میں آسائش ہے ورنہ نہیں۔ مثلاً اسی مقام پر سمجھیئے کہ جہاں شرع محمدی کا مسئلہ شفع رواج ہوکر متعلق کیا جاتا ہے اور طلب مواثبت اور طلب اشہاد کا خیال نہیں ہوتا۔ وہاں مسئلہ شفعہ سے تمدنی حالت میں بجائے بہبودی کے ابتری پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے

مفقود الخبر

مفقود الخبر کی نسبت احکام شرع نہایت اچھے ہیں کہ اسکی جائداد کے انتظام کے لئے اس کو مردہ تصور کر لیتے ہیں اور دیگر امور کی نسبت اسے ایک زمانہ معین تک زندہ مانتے ہیں۔ زمانہ انتظار حنفیوں کے نزدیک بے شک بہت زائد ہے جو لبسا اوقات نامناسب وقفہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اور ائمہ کے نزدیک اس سے بہت کم زمانہ رکھا گیا ہے۔ اور اوسط حساب سے کم وبیش وہی ہوتا ہے جو انگریزی قانون میں معین ہے یعنی آٹھ سال اور بعض ائمہ نے اس سے بھی کم زمانہ رکھا ہے۔ امام مالک نے ۴ برس کی مدت رکھ کر عورتوں کے حقوق کی نگہداشت کی ہے اور مفقود الخبر کی بیوی کو یہ حق دیا ہے کہ اس کے بعد وہ قاضی سے افتراق کا حکم صادر کرائے۔

باب پنجم ۵

عقائد مذہبی اور علمی مباحث

فصل نمبر ۲۶

حقیقت اسلام

کوئی سمجھے تو دنیا کی ہر ایک چیز نمونہ قدرت ہے اور سوچے تو ہر ذرّے سے صنعت کردگار ہویدا ہے کن کن چیزوں کا نام لیا جائے۔ آفتاب، ماہتاب، ستارے، زمین، ابر دریا، پہاڑ، آگ، پانی ہوا، مٹی، حیوانات نباتات، جمادات وغیرہ وغیرہ ہر ایک بجال خود تماشہ اور بجائے خود ذریعہ معرفت ہے۔ ان کو آنکھوں سے دیکھنے والے تو سب ہی ہیں۔ لیکن غور کرنے والے کم ہیں۔

مثلاً تغیر موسم کہ وہ خود ایک تماشہ ہے۔ ابھی گرمی تھی سارا جسم پھکا جاتا تھا کہ دفعتاً ہوا چلی ابر گھرا مینھ برسنے لگا۔ زمین سے آسمان تک کرہ نار تھا اور دو ایک منٹ میں طبقہ زمہریر ہوگیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلے آتے ہیں۔ زمین سطح آب کی طرح سپید ہو رہی ہے کہ نباتات نے زمین سے اپنا سر نکالا۔ بوئے ہوئے بیج دو چار روز ہی میں جم گئے۔ سبزہ زمردیں سے تمام زمین بھر گئی۔ درختوں میں بھی نئی نئی کونپلیں نکلیں۔ جامہ سبز پہن کر تمام درخت اکڑے ہوئے کھڑے ہیں۔

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتر است معرفت کردگار

برسات کا موسم جانے پر جاڑے کا موسم شروع ہوا اور جاڑے کے بعد گرمیاں آئیں جاڑے بدلا

وہ گرمیوں میں بیکار ہو کر خود بخود نظروں سے گر گئیں۔ برسات میں یہ سمجھا گیا تھا کہ پانی نباتات کی جان ہے۔ جاڑے کی شب شبنم کی وجہ سے نصف برسات ہے۔ لیکن پھر بھی سبزہ زار زندگی سے ناخوش ہے اور اپنی صورت سے بیزار ہے۔ درختوں کے پتے گر گئے ہیں۔ سوکھی ٹہنیاں کھڑی موسم بہار پر ماتم کر رہی ہیں یا آئندہ بہار کے خیر مقدم کے لئے برہنہ تن خواب گاہ سے دوڑی چلی آتی ہیں۔

جاڑوں میں تو کچھ شبنم کا آسرا تھا اب چیت کی ہوا نے اسے بھی الگ کیا زمین جیسی دن کو خشک ویسی ہی رات کو بھی خشک۔ پچھوا ہوا نے سطح زمین کو سوکھی راکھ سے مشابہ بنا دیا ہے قیاس چاہتا ہے کہ سبزہ برسوں دیکھنے میں نہ آئے گا کہ دفعتاً تغیر موسم نے اپنا زور دکھایا موسم برسات سے بھی کہیں زیادہ خوشنما حالت میں سروں پر پھولوں کے تاج رکھے ہوئے نئی پتیاں نمودار ہوئیں۔ دنیا کے انقلابات کا بظاہر ایک سبب ہے لیکن وہ سبب محض تسکین قلب کے لئے ہے۔ نہ کوئی کلیہ ہے اور نہ کوئی معین قاعدہ ہے جو حالت پیدا ہوتی ہے انسان اس کے لئے کوئی رائے قائم ہی کر لیتا ہے اور اس جھوٹ موٹ کی رائے زنی کو وہ انتہائے علم یا کمال دانش تصور کرتا ہے لیکن جو جتنا ہی سمجھ دار ہے وہ اتنا ہی معاملات دنیا میں اپنی رائے کو ناقص اور عقل کو ناکافی محض سمجھتا ہے۔ بیشک خدا نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے اور اسی کو تقدیر کہتے ہیں لیکن ہم نہیں سمجھتے۔

علم طب کے پڑھنے والے اور علم تشریح کے جاننے والے پیٹ کے دھندے سے فرصت نہیں پاتے ورنہ صنعت کردگار کے معائنہ سے دیوانے بن جائیں۔ انسان پیدا ہوا بچہ جوان ہوا۔ بوڑھا ہوا۔ کمزور ہوا اور مر گیا اور کبھی چلتے چلتے گرا اور قبل از وقت مر گیا اس دوران میں اس کی حالت بے انتہا تغیرات سے دوچار ہوتی ہے جن میں سے اکثر اسے خود محسوس نہیں ہوتے خود اس کی ترکیب جسم کے متعلق ایسے ایسے راز اور ایسی ایسی حکمتیں ہیں کہ تمام دنیا کا علم حاصل ہونے پر بھی انسان خود کو پہچان نہیں سکتا اور نہ اپنے جسم کی ماہیتوں کا مدرک کامل بن سکتا ہے اللہ اللہ کچھ ٹھکانا ہے۔ جس طرح آنکھ کے تل میں تمام عالم سمایا ہوا ہے اسی طرح انسان جزو ضعیف تمام قدرت کا ایک خلاصہ ہے یا دوسرے معنوں میں کہیئے تو قادر مطلق کی بے انتہا صنعتوں کا ایک ادنیٰ نمونہ یا باغ عالم کا ایک ادنیٰ شگوفہ ہے۔

بہر حال انتظام عالم پر غور کیا جائے، خود اپنے وجود اور ترکیب جسم پر لحاظ کیا جائے دنیا کے انقلابات اور عالم کے موجودات پر بغور نظر ڈالی جائے تو ان تمام چیزوں میں کم سے کم

ایک قوت کا ادراک تو ہر فرد بشر کو ہو گا اور یہ معلوم ہو گا کہ اسی قوت سے چیزوں کا وجود قائم ہے۔ پھر اس وجود کے اسباب پر غور کیا جائے تو ہر ایک اپنے پندار کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور سمجھ لے گا۔ سوچنے والے ذرا بھی سوچیں تو ان قوتوں کو جدا جدا خالق ماننے کی جرأت نہ کریں گے اور نہ یہ کہہ سکیں گے کہ یہ اسباب باہم ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں۔ اب یہ قوتیں بہ حیثیت مجموعی یا یہ اسباب بہ شکل واحد کسی قوت یا سبب پر خواہ منتہی ہوں گے بس اسی علۃ العلل کو اہل اسلام الٰہ یا خالق سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی ذات واحد کو مختلف اعتبارات سے قادر مطلق۔ رب۔ رحیم۔ رزاق وغیرہ وغیرہ پیارے ناموں سے پکارتے ہیں۔

اسلام پہلے یہ سکھاتا ہے کہ مختلف قوتوں کو تم اللہ نہ کہو اور نہ مختلف اسباب کو خالق سمجھو۔ یہ ضرور مانتا ہے کہ اللہ نے ہر چیز کے عالم وجود کے لئے اسباب بنا رکھے ہیں۔ معمولی طور پر ان اسباب کے خلاف نہیں ہوتا ان اسباب پر غور کرنا انسان کا فرض ہے بلکہ ایک قسم کی عبادت یہ بھی ہے۔ لیکن اسلام یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ خالق مطلق نے انسان کو پیدا کر کے اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ دنیا کا گورکھ دھندا بنا کر وہ خود وجود معطل بن بیٹھا۔ بیشک اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ وہ اسباب سے قطع نظر کر کے ہر وقت اپنے اختیار تمیزی کو نافذ کرتا رہے علم اور تجربہ کہتا ہے کہ خدا ایسا نہیں کرتا لیکن یہ کہنا کہ وہ چاہے جب بھی نہیں کر سکتا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔

خدا کو واحد اور قادر مطلق ماننے میں جو مصلحت ہے اسے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا میں جتنی باتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں ان کے لئے ایک نہ ایک سبب ضرور ہوتا ہے۔ سبب یا تو ایسا ہے کہ انسان اس کو بادی النظر میں یا ذرا غور کے بعد سمجھ جاتا ہے یا ایسا ہے کہ انسانی عقل اس کے ادراک سے قاصر ہے آخر الذکر صورت میں بسا اوقات انسانی کمزوری گمراہی کی طرف منجر ہوتی ہے۔ مثلاً بیماری کی حالت میں طبیب کے پاس جانا۔ عطار سے دوا مانگنا حجام کی خوشامد کرنا بیجا نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا دار الاسباب ہے اسباب کا محتاج بننا گویا قانون قدرت کے بالکل موافق ہوتا ہے لیکن بیماری کو خطرناک سمجھ کر اسباب ظاہر سے چشم پوشی کی جائے اور کسی جاہل کے کہنے سے بیمار اپنے جسم کے برابر دھاگا ناپ کر پیپل کے درخت میں لپیٹ آئے اور امید رکھے کہ پیپل شفا بخشنے میں اپنا اثر دکھائے گا تو یہ عقلاً بہت معیوب ہے اور اسلام اس کو شرک بتاتا ہے اور صاف صاف کہتا ہے کہ وہ انھیں کم فہمیوں کے مٹانے کے لئے میں ضروری سمجھا گیا ہوں۔ یعنی اسباب ظاہر نہ ہوتے ہوئے کسی شئے کو بے وجہ

قادر مطلق مان لینا قادر مطلق کی قوت سے انکار کرنا ہے اور اسی کو اصطلاح شرع میں کفر کہتے ہیں۔ یا ایسی ہی حالت میں کسی کو اللہ کا ساتھی سمجھ لینا شرعی اصطلاح میں شرک کہلاتا ہے اور یہ کفر و شرک دونوں نوع انسانی کے لئے بیحد مضر ہیں۔ جس طرح عالم اسباب ظاہر میں بسا اوقات حاکم وقت کی اطاعت لازم ٹھہرتی ہے اور بغیر اس کے انسان کو آرام میسر نہیں آسکتا ویسے ہی اسباب مخفیہ میں ایک قوت (اللہ) کو قادر مطلق ماننا۔ صبر۔ قناعت۔ دلجمی۔ قوت دل اور مضبوطی خیالات کا سبب ہوتا ہے اور تجربہ کہتا ہے کہ بغیر ان باتوں کے سچی خوشی جس کی احتیاج سے کوئی بے نیاز نہیں ہوسکتا کسی طرح حاصل نہیں ہوتی جس طرح کئی خدا کے ماننے میں انسان کے خیالات میں پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا کے انکار کرنے سے بھی دل میں کمزوری اور بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے سب کو خود سے بڑا سمجھنے سے جس طرح دل بے انتہا کمزور ہوجاتا ہے اسی طرح کسی کو خود سے بڑا نہ سمجھنے سے بے انتہا زبردست ہوجاتا ہے اور یہ دونوں حالتیں انسان کے حسن معاشرت و حسن تمدن پر برا اثر رکھتی ہیں۔ اعتدال کی حالت یہ ہے کہ انسان صرف ایک خدا کا قائل ہو۔ کسی سے نہ ڈرے مردانہ وار معاملات دنیا میں کوشش کرے۔ کامیابی کی صورت میں خدا کا شکر کرے کہ نخوت پیدا نہ ہو اور ناکامی کی حالت میں یہ سمجھے کہ السعی منی والاتمام من اللہ۔ اپنے مقدر نے نہ چاہا کام نہ ہوا آئندہ پھر کوشش کی جائے گی خدا سے ناامید نہ ہونا چاہیئے۔ انھیں معتدل خیالات سے دنیا میں موحد قومیں ہمیشہ خوشحال اور سرسبز رہتی ہیں اور اسی لئے اس اعتدال کی تعلیم اسلام نے بھی کی ہے۔

اللہ ایک ہے (لا الہ الا اللہ) اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ دو تین اللہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ دنیا میں جتنی باتیں ہوئیں۔ ہورہی ہیں۔ یا ہوں گی ان سب کا سبب صرف وہ قوت ہے جس کو مسلمان اللہ کہتے ہیں اور چونکہ یہ ایسی قوت یا ایسا سبب ہے جہاں تمام قوتیں یا اسباب منتہی ہوتے ہیں اس لئے اس قوت یا سبب کا قادر مطلق ہونا لازم ہے۔ اور کسی کو قادر مطلق نہیں کہہ سکتے جب تک اس کے شریک یا ہمسر کا وجود ممتنع نہ ہو۔

خدا کا شریک کوئی دوسرا ٹھہرایا جائے تو خدا کو تکلیف نہیں ہوتی اور نہ خدا کو کوئی رنج پہنچتا ہے۔ جب اس کے وجود سے انکار کیا جاتا ہے۔ وہ ان باتوں سے بے نیاز ہے۔ یہ باتیں شرع محمدی میں اس لئے ممنوع ہے کہ خود انسان کو ان باتوں سے بالآخر اذیت پہنچتی ہے۔

منہ سے لا الہ الا اللہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تمام امور دنیاوی میں اللہ ہی سبب سمجھا جائے خدا کی عظمت اور جلالت کسی حالت میں کم نہ ہو عملی طور پر یہ دکھا دیا جائے کہ کلمہ گو کے دل سے کسی

انسان یا حیوان کا خوف یا دنیاوی طمع اللہ کے قادر مطلق ہونے کے علم اور یقین کو ذرا بھی کم ہونے نہیں دیتی۔ مسلمان کسی سے ڈرتا ہے تو صرف اسی حالت میں کہ وہ ڈرنے کو اپنے اوپر شرعاً فرض جانتا ہے بیجا خوشامد، بے موقع چاپلوسی ناروا انّامی یہ ہرگز اہل اسلام کا شعار نہیں ہے اسلام جو شجاعت تعلیم کرتا ہے اس کا اقتضا یہ ہے کہ اگر لاتلقوا بایدیکم الی التہلکۃ قرآن میں نہ آتا تو اہل اسلام بوقت ضرورت سانپ ہاتھ سے پکڑ لیتے۔ شیر کے منہ میں کلائی ڈال دینے یا دریا میں کود پڑنے میں بھی دریغ نہ کرتے غرض کہ مسلمان کی شان سے ہے کہ وہ اللہ کو ہردم حاضر و ناظر سمجھیں اور یہی ان تمام ترقیوں اور کارناموں کی جڑ ہے جو پچھلے مسلمانوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ زمینداروں کے نزدیک تحصیلدار، مالگزاری خدائے حلقہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن معائنہ تحصیل کے لئے کوئی چھوٹا سا مجسٹریٹ ضلع یا کمشنر قسمت آجائے تب دیکھئے کہ تحصیلدار سے کہ ادنیٰ چپراسی کی وقعت بھی عوام کی نظروں میں نہیں رکھتا۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کی حالت بدل جاتی ہے مشعل کے آگے چراغ کی روشنی زائل ہوئے بغیر نہیں رہتی دن میں سورج کے سامنے مشعل کی کیا مجال کہ اپنی روشنی پھیلا سکے۔ ضرب المثل ہے کہ نقارخانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے بس یوں ہی سمجھنا چاہیئے کہ اللہ کو پورے یقین کے ساتھ حاضر و ناظر اور قادر مطلق جاننے والوں کو پھر کوئی دوسری شے قابل لحاظ نہیں معلوم ہوتی ایسے لوگ نہ خوف بیجا کو قریب آنے دیتے ہیں اور نہ کسی چیز کی طمع دل میں رکھتے ہیں۔ جھوٹ، چوری، زنا، غیبت، کبر، لالچ، بغض حسد وغیرہ اخلاق مذموم ان سے اس طرح فرار کرتے ہیں جس طرح تاریکی شب سے نور اور حرارت آفتاب سے شبنم منھ سے۔ موحد بن جانا تو آسان ہے۔ لیکن دل سے اور یقین سے موحد ہونا ذرا مشکل ہے اور اس زمانہ میں تو بہت ہی مشکل ہے۔ اسلام نے یہ سمجھایا ہے کہ کافر کلمہ پڑھنے سے ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا وہ آج ماں کے پیٹ سے نکلا۔ توحید زبانی کوئی چیز نہیں ہے ہاں سچے دل سے اگر مانی جائے تو آدمی کی ماہیت اس سے بدل جاتی ہے سانپ جس طرح کیچلی سے نکل کر نئی حالت پیدا کرتا ہے اسی طرح انسان بھی موحد بننے سے ایک نئی دنیا میں آجاتا ہے اس توحید سے کچھ ایسے خیالات حمیدہ اور عقائد حسنہ پیدا ہوتے ہیں کہ انسان اپنی پہلی حالت سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتا۔ سچے اسلام نے اپنا جلوہ دکھایا نہیں کہ جبن جاتا رہا۔ ہمت بڑھ گئی دل و دماغ میں قوت آگئی۔ خیالات میں تازگی اور شادابی پیدا ہوئی۔ حق اور باطل میں تمیز ہونے لگی تاریکی خیالات زائل ہوئی۔ مختصر یہ کہ اسلام سے دفعتہً نوعیت ہی بدل گئی۔ کسی گاؤں کے دو بھائیوں سے کاشتکاری

کے کام میں گھر پر چھوڑ دیا جائے اور چھوٹا کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے لئے انگلینڈ بھیج دیا جائے اب آٹھ دس برس کے بعد چھوٹا بھائی اپنے گھر واپس آئے تو ظاہر ہے کہ بڑے بھائی کو چھوٹے سے کوئی نسبت نہ ہوگی۔ انگلینڈ کی تعلیم اور صحبت پچھلے لڑکے پر کچھ ایسا اثر ڈال دے گی کہ اس کی فطرت ہی بدلی ہوئی نظر آئے گی اس سے کہیں زیادہ حیرت افزا ترقی تھی جو ابتدا ر اسلام کی بدولت آناً فاناً عرب اور اس کے گرد ونواح کے باشندوں کو حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کی صحبت نصیب ہوتے ہی تمام باتوں میں آسمان وزمین کا فرق ہو جاتا تھا سبب صرف یہ تھا کہ پیغمبرؐ خدا کے اثر صحبت سے لوگ توحید کے معنی سمجھتے تھے اور اس پر دل سے یقین کرتے تھے اور بے تکلف اس قابل تھے کہ اپنے یقین کو فیض صحبت سے دوسروں کی طرف منتقل کر سکیں۔

رسالت

"تصدیق رسالت کے ساتھ منھ سے کلمہ توحید کہنا اور دل سے اس پر یقین کرنا اسلام کے لئے کافی ہے" یہ تو ایک مسلم بات ہوئی اب گفتگو یہ ہے کہ یقین یا تصدیق بالقلب کیا شے ہے بعضوں نے لکھا ہے کہ جو شخص بغیر انفعال بڑے بڑے معاصی کا مرتکب ہو وہ ہرگز مومن نہیں ہے اور حجت یہ کی ہے کہ خدا کو سچے دل سے حاضر اور ناظر جاننے والا یا دل کی آنکھ سے اس کا دیکھنے والا ارتکاب جرائم کر ہی نہیں سکتا اگر کسی فوری اثر اور دیوانہ وار جوش کی وجہ سے وہ جادۂ اعتدال سے کبھی پھر بھی گیا تو خدا کا خیال اسے پھر اپنی اصلی حالت پر ضرور کھینچ لائے گا اسی بازگشت کو اصطلاح شرع میں توبہ کہتے ہیں ایک شخص منہ سے تو کلمہ پڑھتا ہے لیکن اس کے افعال بالکل مسلمانوں کے سے نہیں ہیں۔ اگر یہ مسلمان ہے تو پیغمبرؐ کے زمانے میں منافق کس کو کہتے تھے منافق وہ تھے جو خوف، طمع یا مصلحت سے کلمہ تو پڑھ لیتے تھے لیکن ان کے دلوں میں کچھ بھی اسلام کا خیال نہ تھا۔ اب زمانہ حال کے مسلمان اپنی طبیعتوں پر غور کریں کہ وہ کلمہ گو محض اس لئے ہیں کہ ان کے باپ دادا کنبہ نسلتے والے کلمہ گو تھے۔ یہ بھی ان کی تقلید کرنے لگے یا کہ وہ خود اس طرح توحید کے دلدادہ ہیں کہ اگر مسلمان گھرانے میں پیدا نہ ہوتے جب بھی توحید کی محبت انھیں اسلام کی طرف ضرور کھینچ لاتی اب ہر شخص بطور خود فیصلہ کرے کہ اس کے اسلام کی نوعیت کیا ہے یہاں اس زمانے کے اسلام پر کوئی لیکچر نہیں دینا ہے لیکن اس قدر لکھنا بھی بے موقع نہیں ہے کہ زمانہ گزشتہ کی حالت کچھ ہی ہو اس زمانہ میں منہ سے کلمہ پڑھ لینا مسلمان ہونے کے لئے ہرگز کافی نہیں

ہے۔وہ زمانہ انھیں زمانے والوں کے ساتھ گیا کہ ادھر کلمہ پڑھا ادھر فیض صحبت نے کلمہ کا مفہوم دل پر نقش فی الحجر کندہ کر دیا اور تصدیق خود بخود حاصل ہو گئی۔اب تو یہ حالت ہے کہ ہم خود ہی مسلمان نہیں ہیں دوسروں کو کیا مسلمان کریں گے۔ہم خود راہ بھولے ہیں دوسروں کو کیا راہ دکھائیں گے۔کئی صدی پہلے سے "مسلمانان درگور و مسلمانی در کتاب" کہا جاتا تھا۔اب تو اس مقولے کے سمجھنے والے بھی مفقود ہوتے جاتے ہیں۔یہاں موجودہ اسلام کی تضحیک مقصود نہیں ہے۔لیکن مصلحتاً لکھنا ناگزیر ہوا کہ اس کتاب میں حالت اسلام اس طرح لکھی جاتی ہے کہ اس کے پڑھنے کے بعد مسلمان تمام بنی نوع انسانی میں اشرف اور افضل دکھائی دیں اور ان کے طریقے سب کے طریقوں سے اعلیٰ اور اکمل معلوم ہوں اور اسلام گویا نعمت خدا معلوم ہو۔اس کتاب کی لمبی چوڑی داستانیں پڑھنے والے جب خارج میں مسلمانوں کے اطوار دیکھتے تو کہتے کہ "اگر یہی نعمت خدا ہے تو ہم اس نعمت سے درگزرے۔یہ مسلمان ہی کو مبارک رہے۔اس لئے مختصر طور پر دکھا دینا ناگزیر ہوا کہ زمانہ حال کے مسلمان اور خصوصاً ہند کے مسلمان بہ شکل اپنے کو مسلمان کہہ سکتے ہیں۔کچھ دنوں پہلے مسلمان کے یہاں اہل اسلام کی صورت بنا کر خیر اسلام کے نقال سمجھے جاتے تھے اور اب زمانے کے ایر پھیر سے وہ حالت بھی جاتی رہی۔اب مسلمانوں کو مسلمانی صورت بنانے سے بھی نفرت ہے۔اہل اسلام ہونا اور اسلام پر فریفتہ ہونا کیسا۔جس اسلام کی عظمت اور حکمت اس کتاب میں دکھائی جاتی ہے وہ اسلام معدوم نہیں ہے اور نہ معدوم ہو سکتا ہے لیکن بہت ہی خاص خاص لوگوں میں ہے اور وہ بھی اس طرح کہ بے سروسامانی کی حالت میں پڑا اپنے پرانے چاہنے والوں کے سوگ میں ماتم کر رہا ہے اگر اسلام کا نعمت خدا ہونا عملی طور پر دیکھنا ہے تو ناظرین پچھلے مسلمانوں کے کارنامے اس کتاب کے صفحے الٹ کر پڑھیں اور سمجھیں کہ جب تک اسلام اسلام کی طرح سمجھا گیا اس نے کیسے کیسے سلوک اپنے چاہنے والوں کے ساتھ کئے اور اپنے چاہنے والوں کو کیا سے کیا کر دیا یا انھیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا اب بھی جو لوگ اس کے چاہنے والے ہیں اپنی نعمت سے وہ ان کے ساتھ دریغ نہیں کرتا۔لیکن دو ایک کا تنعم یا دو چار کی حالت کسی شمار میں نہیں۔سب سچے دل سے اسکی پیروی کریں تو معلوم ہو کہ اسلام کا چشمہ فیض کبھی خشک نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے سچے اور مستحکم اصول کسی حالت اور کسی زمانے میں نامناسب کہے جا سکتے ہیں یہ ہر وقت ہمارے اخلاق درست کرنے کو تیار ہے بشرطیکہ اس سے مناسب طور پر مدد چاہی جائے۔نوع انسانی کی اصلاح کے لئے اسلام

سے اچھا قانون نہیں بن سکتا۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ خود اہل اسلام جب چاہتے ہیں کہ اپنی حالت درست کریں تو غیر قوم کے برے قواعد کی پیروی کرتے ہیں۔ اسلام جس نے تمام دنیا کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا تھا آج وہ پرانی مسجدوں کے کھنڈروں میں ارکان و منوع کی صحت، درستی صف نماز جنازہ وغیرہ وغیرہ چند محدود امور پر منحصر ہو رہا ہے اور اس زمانے کے بڑے بڑے علماء کی تنگ خیالی یہ کہہ رہی ہے کہ انھیں چند ارکان میں اسلام کی تمام خوبیوں کا ظہور ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ آج اسلام کے عمدہ اصول کے کاربند ہونے سے یورپ کی قوم کس درجہ نمایاں حالت رکھتی ہے۔ غضب ہے کہ اہل اسلام اور وہ بھی کیسے کہ بڑے بڑے متقی جو آمین بالجہر سن کر۔ یا نماز کی صف ٹیڑھی دیکھ کر مرنے کو تیار ہو جائیں یہ بھی نہیں جانتے کہ ایفائے وعدہ کیا شے ہے۔ معاملات بیع و شریٰ میں دیانت کا کیا مقتضیٰ ہے۔ بدعہدیوں کا مفہوم کیا ہے۔ اور رزق حلال کس کو کہتے ہیں۔

"محمد رسول اللہ" محمدؐ خدا کا پیغامبر ہے۔ منہ سے تو یہ پانچ لفظ کا جملہ بہت ہی آسانی سے بولا جاتا ہے لیکن اس پر عمل کرنا اور اس کو سچا سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا منہ سے کہہ ڈالنا۔ ایمان کی تکمیل کے لئے وحدانیت کے ساتھ یہ بھی ماننا ضروری ہے کہ آنحضرت محمدؐ خدا کے پیغمبر ہیں۔ یعنی جتنی باتیں آنحضرت نے سکھائی ہیں وہ سب اللہ کی طرف سے ہیں اور اس لئے وہ سب حکمت سے بھری ہوئی ہیں۔ "اللہ کی طرف سے ہیں" یہ سمجھنا تو اعتقاد اور یقین پر مبنی ہے۔ لیکن ان کا حکمت سے پر ہونا سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے اور غور اور فکر سے اس اعتقاد اور یقین کی استواری میں بہت کچھ مدد ملتی ہے یعنی جب بعد غور و فکر کے یہ معلوم ہوا کہ جو قانون آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری کیا وہ تمام گزشتہ موجودہ اور آئندہ قوانین سے عقلاً افضل ہے تو خود بخود عقل سلیم مان لے گی کہ ایسا مستحکم اور لازوال قانون حکمت اور نعمت سے بھرا ہوا سوائے خالق عالم کے دوسرے کا بنایا ہوا ہو ہی نہیں سکتا۔ خدا کا گھر۔ خدا کی کتاب۔ خدا کا قانون۔ خدا کا حکم ان سب میں اضافت محض اظہار تخصیص کی غرض سے ہے۔ ورنہ کوئی گھر کوئی کتاب کوئی قانون کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو خدا کے علۃ العلل ہونے کے لحاظ سے خدا کا نہ سمجھا جائے۔ "شریعت خدا کا قانون ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قانون قدرت نے انتظام عالم قائم کیا ہے اس کا مقتضا یہ ہے کہ انسان پرلطف زندگی بسر کرنے میں شریعت محمدی یعنی اس قانون کا پابند رہے جو قانون ربانی کہا جاتا ہے۔ قرآن "کلام اللہ" ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے جو قانون بندوں کے لئے بنایا اس کا اس میں ذکر ہے اور اللہ نے بندوں کی تعلیم کے لئے اپنے رسول پر اتارا ہے۔ یوں تو ہر چیز اللہ کی بنائی ہوئی

ہے اور تمام چیزیں اسکی اتاری ہوئی ہیں لیکن شریعت محمدی یعنی قرآن کی نسبت یہ تخصیص انھیں معنوں میں ہے جنکی توضیح اوپر کی گئی ہے۔

پیغمبرؑ کو ریفارمر سے تعبیر کریں تو نئے خیال والے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ تاریخ جاننے والے متفق ہیں کہ پیغمبروں سے ہمیشہ اصلاح حالت ہوتی رہی ہے۔ کسی زمانے میں کوئی قوم مذہبی خیال سے خالی نہیں رہی۔ خلقت آدم سے مذہبی خیالات کا وجود پایا جاتا ہے۔ گویا بنی نوع انسانی کے ساتھ ہی مذہب بھی پیدا ہوا۔ عقل سے کام نہ لینا بڑا ظلم ہے۔ خلقت انسان کے ساتھ مذہب کا لزوم روز ازل سے ہے اور آخر کچھ اسکی وجہ سوچنا چاہیئے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس فطرت نے انسان پیدا کئے اسی نے انسان کے بہ امن زندگی بسر کرنے کے لئے قانون بھی بنا دیئے اس قانون کے بنانے والے اصطلاح مذہب میں رسول اور نبی کے نام سے پکارے جاتے ہیں اصول میں یہ قوانین یکساں ہیں جہاں کچھ اختلاف ہے وہ بہت ہی خفیف اور نا قابل لحاظ ہے ایک جدید پیغمبر کا آنا اس غرض سے نہ تھا کہ کسی نئے دین یا نئے خدا کا وجود اس کو قائم کرنا تھا بلکہ ایک پیغمبر کے احکامات کو جب اس کی امت بھولنے لگی تو اصلاح حالت اور یاددہانی کے لئے دوسرا پیغمبر یا ریفارمر آیا اسوقت دنیا کے مختلف مذاہب میں جو اختلاف ہے وہ محض امت کی غلط فہمیوں یا قصور کا نتیجہ ہے اور یہی ایک بڑا ثبوت اس امر کا ہے کہ کیوں پے درپے پیغمبروں کے آنے کی ضرورت ہوئی۔ پیغمبر آخرالزماں کا درجہ جو اور پیغمبروں سے فائق سمجھا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انکی بعثت ایسے زمانے میں ہوئی کہ دنیا بہت کچھ ترقی کر چکی تھی جو کام پہلے انبیاء کے متعلق تھا وہ پیغمبر آخرالزماں کے علمائے امت کے تعلق کیا گیا۔ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔ دیکھو ہر قرن اور ہر فرقہ میں سوائے قرآن کے کتنی مذہبی کتابیں قرآن کی موافقت میں یا اس کی تفسیر میں تصنیف ہوئیں۔ اصلاح امت کے لئے کیسے کیسے لوگ پے درپے پیدا ہوتے رہے اور انھیں درمیانی اشخاص کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ ہم اسلام کو مانیں یا نہ مانیں۔ اسے سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ لیکن اسلام کی تصویر کہیں سے خراب یا میلی نہیں ہونے پائی۔ اب جس پیغمبر کی امت میں انبیاء بنی اسرائیل کی طرح علماء پیدا ہوں اس کے خاتم النبیین افضل البشر ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ محمدؐ رسول اللہ کے ساتھ ایک صفت اور بھی مخصوص ہے جو دوسرے پیغمبروں میں کم ملے گی وہ یہ کہ آنحضرتؐ نے ترک دنیا کی ترغیب دے کر خداشناسی کی تعلیم نہیں کی بلکہ یہ بتلایا کہ دنیا اور دین دونوں کو ساتھ ساتھ رکھ کر کیونکر ایک انسان اعلیٰ درجے کی خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ آنحضرت جو قانون اپنی امت

کے لئے لائے اس پر غور کرنے سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ مکمل کوئی دوسرا دین نہیں ہوسکتا اور نہ بجز شرع محمدی کے کوئی دوسری شرع ایسی ہے جس پر عمل کرنے والا سچی خوشی سے فیضیاب ہو۔ قرآن میں اسی طرف اشارہ ہے :۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً " کتاب ہذا میں مختلف مقامات پر دکھایا گیا ہے کہ آنحضرت کی تعلیم مذہب تمام امور میں افضل اور اکمل ہے آنحضرتؐ کی فضیلت خصوصیت کے ساتھ بیان کرنے کا یہ کوئی محل نہیں ہے کیونکہ تمام کتاب اسی بحث میں ہے اس کتاب کو ناظرین غور سے پڑھیں گے تو خود بخود ان کے منہ سے نکل جائے گا کہ " محمدؐ تو رسول برحق ہے اور دنیا میں کوئی بشر تجھ سا مجمع کمالات پیدا نہیں ہوا تیری شریعت تیری افضلیت کی دلیل ہے "

بعضوں کا خیال یہ ہے کہ امور دنیا ایک معین قانون قدرت پر چلتے رہتے ہیں۔ خدا کو پیغمبر کو پیدا کرنا۔ اس کے پاس جبرئیلؑ کی معرفت کتاب بھیجنا۔ معجزات سے اپنے پیغمبر کو سچا ثابت کرنا اس دخل در معقولات سے کیا واسطہ ؟ اس کا جواب وہی ہے جو پہلے لکھا گیا کہ اہل اسلام کیا دنیا کا کوئی سمجھ دار یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ نے دنیا کا گورکھ دھندا بنا کر اپنے وجود کو معطل کر دیا۔ انسان جو یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ خالق مطلق نے پہلے انڈے سے مرغی پیدا کی یا مرغی سے انڈا اسکی مجال نہیں ہے کہ تحقیق عالم پر کوئی ایسی قطعی رائے قائم کرلے کہ اس سے عدول کرنے کو بے عقلی سمجھے گا

حیف بریں دانش و فرزانگی

لیکن جو لوگ ایسے ہی ضدی ہیں کہ جو بات ان کے ذہن میں آئی اس کے خلاف سمجھ ہی نہیں سکتے ان سے پوچھا جائے کہ کبھی کبھی دم دار ستارے کا ظاہر ہونا۔ خود بخود پہاڑ سے آگ کا شعلہ نکلنا آسمان سے شہاب ثاقب گرنا اسی قسم کی ہزاروں لاکھوں باتیں ہیں کہ سائنس کوئی نہ کوئی وجہ یا تاویل اسکی نسبت پیدا کر ہی لیتی ہے جیسے یہ سمجھتے ہیں کہ لاکھ دن کے بعد دم دار تارے کا نکلنا انتظام عالم کے لئے ضروری ہے گردش فلک مقتضی ہے کہ سورج گرہن اور چاند گرہن ضرور ہوا کرے ویسے ہی اگر یہ بھی سمجھ لیں کہ انتظام عالم کا مقتضا ہے کہ معین وقت کے بعد مخلوقات کی اصلاح حال کے لئے ایک مقنن یا ریفارمر رسول اللہ کے لقب سے وقتاً فوقتاً پیدا ہوتا ہے تو کیا استحالہ ہے اگر یہ کہا جائے کہ دمدار ستارے آنکھ سے دکھائی دیتے ہیں اور اس لئے کوئی نہ کوئی وجہ دل سے پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی کو کیا غرض ہے کہ پیغمبروں کے وجود سے بحث کرتا پھرے۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ " بیشک غرض ہے " حالات دنیا پر رائے

قائم کرنا یہ بھی ایک کام انسان کے تعلق کیا گیا ہے۔ جن ملکوں میں سیکڑوں قانون اور رعایا کی عام رائے شامل کرنے کے بعد قانون بنتے ہیں وہ ہر روز معرض ترمیم رہتے ہیں اور پھر بھی نقص وعیب سے پاک کبھی نہیں ہوتے۔ محمدؐ امی محض تھا اور ایک نا تربیت یافتہ قوم سے تھا لیکن اس کا قانون آج تیرہ سو برس گزرنے پر بھی ویسا ہی عمدہ اور کارآمد ہے جیسا شروع میں تھا جنگلیوں اور پہاڑیوں کے درست کرنے کے لئے وہ اتنا ہی کارآمد ہے جتنا کہ حکمائے وقت اور عقلائے زمانہ کو مہذب اور شائستہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ بغیر خاص تائید ربانی کے یہ کام محمدؐ نے کیا اور خاص تائید ربانی ہی کا دوسرا نام رسالت یا نبوت ہے جو لوگ اس کو پورے طور سے سمجھتے ہیں وہ رسالت کے وجود کو دل کی آنکھ سے اسی طرح دیکھتے ہیں جس طرح دمدار ستارے یا کسوف وخسوف کو چشم ظاہر سے ہم سب دیکھتے ہیں۔ آنکھ تو خطا بھی کرتی ہے وجدان خطا نہیں کرتا۔

○

فصل نمبر ۴

کارخانۂ قدرت پر نصوص قرآنی

" لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے جو گزرے ہیں انکو پیدا کیا۔ عجب نہیں کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔ اسی نے تمہارے لئے زمین کا بچھونا بنایا۔ آسمان کی چھت بنائی۔ اور آسمان سے پانی برسا کر تمہارے کھانے کے لئے پھل پیدا کئے۔ کسی کو اللہ کا ہم پلہ نہ بناؤ۔ تم خود جانتے ہو۔ سورہ بقر رکوع ۳ "

"کیونکر تم خدا کا انکار کر سکتے ہو تم بے جان کے تھے اور اس نے تم میں جان ڈالی۔ تمہیں وہ مارے گا اور زندہ کرے گا اور پھر اسی کے پاس تم واپس جاؤ گے اسی نے تمہارے لئے زمین کی کل کائنات پیدا کی ہے اور پھر آسمان کی طرف متوجہ ہو کر سات آسمان ہموار بنا دیئے ہیں وہ ہر چیز سے واقف ہے " سورۂ بقر رکوع ۳۔

" تمہارا معبود خدائے واحد ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ بڑا رحم کرنے والا مہربان ہے " سورۂ بقر رکوع ۱۹۔

"بے شک آسمان وزمین کا پیدا کرنا۔ رات دن کا ادل بدل۔ جہازوں کا دریا میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر چلنا۔ مینہ کا آسمان سے برسانا اس سے مری ہوئی زمین کا پھر سے زندہ ہونا اور اس میں ہر قسم کے جانوروں کا پھیلانا۔ ہواؤں کا پھیرنا۔ بادلوں کا آسمان وزمین کے درمیان میں گھرا رہنا ان سب میں دانش مندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ سورہ بقر رکوع ۲۰

" پیغمبر تو کہہ - اے خدا ملک کے مالک جسے تو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے - جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے - خیر تیرے ہاتھ میں ہے اور تو ہر چیز پر قادر ہے[۱] - سورہ آل عمران رکوع ۴ -

" تو ہی رات کو دن میں شامل کرتا ہے اور تو ہی دن میں رات کو شامل کرتا ہے تو ہی بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے اور تو ہی جاندار سے بے جان نکالتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے[۲] - سورہ آل عمران رکوع ۳ -

" آسمان اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے ردوبدل میں ان عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں جو کھڑے ہوئے - بیٹھے ہوئے - لیٹے ہوئے خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی ساخت پر غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے پروردگار تو نے اسے بے فائدہ نہیں بنایا ہے - تیری ذات پاک ہے - ہم کو عذاب دوزخ سے محفوظ رکھنا - پروردگار تو نے جسکو دوزخ میں ڈالا اسکو خوار کیا - گنہگاروں کا کوئی بھی مددگار نہیں ہے - اے پروردگار ہم نے ایک منادی کرنے والے پیغمبر کو سنا کہ ایمان کی منادی کر رہا تھا اور لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ - تو ہم ایمان لایا - پروردگار ہمارے گناہ معاف فرما - اور ہم سے ہمارے گناہ دور کر - اور نیک بندوں کے ساتھ ہمارا خاتمہ کر[۳] سورہ آل عمران رکوع ۲۰ -

" ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا - کیا تم بتوں کو معبود مانتے ہو - میں تم کو اور تمہاری قوم کو صریح گمراہ پاتا ہوں - پھر ہم ابراہیم کو آسمان اور زمین کے انتظامات دکھانے لگے تاکہ

---

[۱] اللھم ملک الملک تؤتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء و تعز من تشاء و تذل من تشاء بیدک الخیر انک علی کل شیٔ قدیر -

[۲] تولج الیل فی النہار و تولج النہار فی الیل و تخرج الحی من المیت و تخرج المیت من الحی و ترزق من تشاء بغیر حساب -

[۳] ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنہار لایت لاولی الالباب الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلی جنوبہم ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ماخلقت ہذا باطلا سبحٰنک فقنا عذاب النار ربنا انک من تدخل النار فقد اخزیتہ وما للظلمین من انصار ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی للایمان ان امنوا بربکم فامنا - ربنا فاغفرلنا ذنوبنا وکفر عنا سیاتنا وتوفنا مع الابرار -

وہ یقین کرنے والوں میں ہو جائے۔ جب رات ہوئی تو ایک ستارہ نظر آیا۔ وہ کہنے لگا کہ یہی میرا پروردگار ہے۔ جب وہ غروب ہو گیا تو بولا غروب ہونے والی چیزوں کو میں پسند نہیں کرتا۔ پھر چاند کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہنے لگا یہی پروردگار ہے۔ جب وہ بھی غروب ہو گیا تو وہ بولا میرا پروردگار مجھ کو راہ راست نہ دکھلائے گا تو بے شک میں گمراہ رہوں گا۔ پھر جب سورج چمکتا ہوا نظر آیا تو کہنے لگا کہ یہی میرا پروردگار ہے کہ یہ سب سے بڑا ہے۔ جب وہ بھی غروب ہو گیا تو بولا بھائیو! تم خدا کے ساتھ شرک کرتے ہو۔ میں اس سے بری ہوں۔ میں تو ایک کا ہو کر اپنا رخ اسی ذات پاک کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمان اور زمین کو بنایا۔ میں مشرکوں میں نہیں ہوں اس کی قوم جھگڑنے لگی۔ تو اس نے کہا تم مجھ سے خدا کے بارے میں جھگڑتے ہو وہ مجھکو سیدھا راستہ دکھا چکا ہے۔ میں ان بتوں سے نہیں ڈرتا جن کو تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو۔ ہاں خدا مجھکو بے شک نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس کا علم تمام چیزوں پر حاوی ہے۔ کیا تم نہیں سوچتے میں کیونکر اس چیز سے ڈروں جس کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ تم کو خوف نہیں معلوم ہوتا کہ تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور پھر تم دوسروں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ تم سوچو اگر تم کو علم ہے کہ ہم میں سے کون اطمینان سے رہے گا۔ جو لوگ خدا پر ایمان لائے ہیں، اور اپنے ایمان میں بے انصافی کی آمیزش نہیں کی ہے۔ یہی لوگ اطمینان سے رہیں گے اور یہی راہ راست پر ہیں[1] سورہ انعام رکوع ۹۔

○ اسی نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر ہر قسم کے نباتات پیدا کئے۔ نباتات سے ہری ہری کونپلیں پیدا کیں اور ان کونپلوں سے گتھے ہوئے دانے پیدا کئے۔ کھجور کے گابھے سے

---

[1] واذ قال ابراہیم لابیہ آزر اتتخذ اصناما آلہۃ انی ارٰک وقومک فی ضلل مبین وکذٰلک نری ابراہیم ملکوت السمٰوٰت والارض ولیکون من الموقنین فلما جن علیہ الیل راٰ کوکبا قال ہذا ربی فلما افل قال لا احب الاٰفلین۔ فلما را القمر بازغا قال ہذا ربی فلما افل قال لئن لم یہدنی ربی لاکونن من القوم الضالین فلما را الشمس بازغۃ قال ہذا ربی ہذا اکبر فلما افلت قال یٰقوم انی بری مما تشرکون انی وجہت وجہی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین وحاجہ قومہ قال اتحاجونی فی اللہ وقد ہدٰین ولا اخاف ما تشرکون بہ الا ان یشاء ربی شیئا وسع ربی کل شیء علما افلا تتذکرون وکیف اخاف ما اشرکتم ولا تخافون انکم اشرکتم باللہ ما لم ینزل بہ علیکم سلطٰنا فای الفریقین احق بالامن ان کنتم تعلمون۔ الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم اولٰئک لہم الامن وہم مہتدون۔

گچھے جھکے پڑتے ہیں۔ انگور، زیتون اور انار کے باغ صورت میں یکساں اور مزے میں مختلف۔ یہ جب پھلتے ہیں تو ان کے پھل اور پھلوں کا پکنا دیکھو۔ مومنوں کے لئے اس میں نشانیاں ہیں[1] سورہ انعام رکوع ۱۲۔

"تم لوگ خدا کے سوا نرے ناموں کی پرستش کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے آبا نے گڑھ رکھے ہیں۔ خدا نے ان کے معبود ہونے کی کوئی سند نہیں اتاری ہے[2] سورہ یوسف رکوع ۵۔

"ساتوں آسمان اور زمین اور جتنی چیزیں ان میں ہیں۔ وہ سب خدا کی تسبیح کرتی ہیں کوئی شے ایسی نہیں جو اسکی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہیں کرتی۔ لیکن تمہاری سمجھ میں نہیں آتا[3] سورہ بنی اسرائیل رکوع ۵۔

"تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے لئے سمندر میں جہازوں کو چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل یعنی معاش تلاش کرو۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ تم پر بڑا مہربان ہے[4] سورہ بنی اسرائیل رکوع ۷
"لوگو! اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا۔ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے اس نے کان دیئے۔ آنکھیں دیں۔ دل دیئے کہ تم اس کا شکر کرو۔ کیا لوگ پرندوں پر نظر نہیں کرتے کہ آسمان کے میدان میں وہ گھرے ہوئے ہیں۔ انکو اڑتے وقت خدا ہی سنبھالتا ہے اس میں بھی مومنوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ اللہ ہی نے تمہارے لئے گھروں کا ٹھکانا بنایا۔ چوپایوں کی کھالوں سے تمہارے لئے خیمے بنائے کوچ اور مقام کے وقت تم ان کو ہلکا پاتے ہو۔ چوپایوں کی اون روؤں اور بالوں سے اس نے بہت سے سامان ایک وقت تک بکار آمد چیزیں بنائی ہیں اللہ ہی نے تمہارے لئے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کے سایہ بنائے پہاڑوں میں تمہارے چھپ بیٹھنے کے لئے جگہیں بنائی ہیں۔ تمہارے لئے کرتے بنائے جو تم کو گرمی سے بچائیں اور زرہیں

---

[1] وہو الذی انزل من السماء ماءً فاخرجنا بہ نبات کل شیء فاخرجنا منہ خضرا نخرج منہ حبا متراکبا۔ ومن النخل من طلعہا قنوانٌ دانیۃ وجنت من اعناب والزیتون والرمان مشتبہا وغیر متشابہ انظروا الی ثمرہ اذا اثمر وینعہ ان فی ذلکم لایت لقوم یومنون۔

[2] ماتعبدون من دونہ الا اسماءً سمیتموہا انتم وآباءکم ما انزل اللہ بہا من سلطن۔

[3] تسبح لہ السموات السبع والارض ومن فیہن وان من شیءٍ الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقہون تسبیحہم۔

[4] ربکم الذی یزجی لکم الفلک فی البحر لتبتغوا من فضلہ انہ کان بکم رحیما۔

بنائیں جو آپس کی زد سے تمہیں بچائیں۔ یوں وہ اپنی نعمتیں تم پر پوری کرتا ہے کہ تم اس کے آگے جھکو[۱] سورہ النحل رکوع گیارہ۔

۔ لوگو! اگر تم کو پھر جی اٹھنے میں شبہ ہے تو یوں سمجھو کہ ہم نے تم کو یوں پیدا کیا ہے۔ کہ پہلے مٹی پھر نطفہ۔ پھر خون کا لوتھڑا۔ پھر پوری اور ادھوری بوٹی۔ تاکہ ہم تم پر اپنی قدرت ظاہر کریں۔ عورتوں کے پیٹ میں ایک وقت مقرر تک اپنی مرضی کے مطابق ہم نطفہ قائم رکھتے ہیں پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں۔ پھر تم کو بڑا کرتے ہیں۔ پھر تم میں سے کوئی مرجاتا ہے اور کوئی اخیر عمر تک پہنچتا ہے تاکہ اب تو کچھ سمجھے۔ تو زمین کو دیکھتا ہے کہ بے حس و حرکت پڑی ہے جب ہم پانی برساتے ہیں تو لہلہاتی ہے اور ابھرتی ہے اور ہر طرح کی خوشنما روئیدگی اگاتی ہے[۲] سورہ الحج رکوع ا۔

"ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا پھر اسکو حفاظت سے نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر نطفہ کو لوتھڑا بنایا۔ پھر لوتھڑے کی بندھی بوٹی بنائی۔ پھر بندھی بوٹی کی ہڈیاں بنائیں ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ایک دوسری صورت میں اسے مخلوق کیا۔ خدا بڑا ہی بابرکت ہے جو تمام بنانے والوں میں بہتر بنانے والا ہے۔ اس کے بعد تم سب کو مرنا ہے پھر قیامت کے دن تم اٹھا کر کھڑے کئے جاؤ گے۔ ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان بنائے ہیں اور پیدا کرنے کے ہنر میں ہم اناڑی نہیں تھے۔ ہم ایک اندازے کے ساتھ آسمان سے پانی برساتے ہیں۔ پھر اسکو

---

[۱] واللہ اخرجکم من بطون امہتکم لا تعلمون شیئاً وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ لعلکم تشکرون۔ الم یروا الی الطیر مسخرات فی جو السماء ما یمسکھن الا اللہ ان فی ذلک لآیت لقوم یومنون واللہ جعل لکم من بیوتکم سکناً وجعل لکم من جلود الانعام بیوتاً تستخفونہا یوم ظعنکم ویوم اقامتکم ومن اصوافہا واوبارہا واشعارہا اثاثاً ومتاعاً الی حین واللہ جعل لکم مما خلق ظلالاً وجعل لکم من الجبال اکناناً وجعل لکم سرابیل تقیکم الحر وسرابیل تقیکم باسکم کذلک یتم نعمتہ علیکم لعلکم تسلمون۔

[۲] یایہا الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقنکم من تراب ثم من نطفۃ ثم من علقۃ ثم من مضغۃ مخلقۃ وغیر مخلقۃ لنبین لکم ونقر فی الارحام ما نشاء الی اجل مسمی ثم نخرجکم طفلاً ثم لتبلغوا اشدکم ومنکم من یتوفی ومنکم من یرد الی ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شیئاً وتری الارض ہامدۃ فاذا انزلنا علیہا الماء اہتزت وربت وانبتت من کل زوج بہیج۔

زمین پر ٹھہراتے ہیں اور اس پانی کے اڑا لے جانے کی بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اس پانی سے ہم نے تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے باغ بنائے ہیں۔ تمہارے لئے میوے پیدا ہوتے ہیں اور تم کھاتے ہو ہم نے طور سینا میں زیتون کے درخت بکثرت پیدا کئے ہیں۔ کھانے والوں کے لئے اس میں دہنیت اور ذائقہ ہوتا ہے۔ چارپاؤں میں بھی عبرت کا مقام ہے کہ جو کچھ انکے پیٹوں میں بھرا ہے اسی میں سے ہم تم کو دودھ پلاتے ہیں اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ تم ان کو کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر چڑھے پھرتے ہو[1] سورہ المومنون رکوع ۱۔

• اللہ کے نور سے آسمان و زمین میں روشنی ہے۔ اس کے نور کو یوں سمجھو کہ ایک طاق ہے اور طاق میں ایک چراغ ہے اور چراغ ایک شیشہ کی قندیل میں ہے اور قندیل گویا موتی کی طرح چمکتا ہوا ایک ستارہ ہے اور زیتون کے ایک مبارک درخت کے تیل سے وہ روشن کیا جاتا ہے۔ نہ پورب ہے اور نہ پچھم ہے آگ نہ ہو جب بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی آپ جل اٹھے گا گویا نورٌ علیٰ نور ہے۔ اللہ اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ لوگوں کے سمجھانے کے لئے وہ مثالیں بیان کرتا ہے اور ہر چیز سے واقف ہے[2] سورہ نور رکوع ۵۔

• تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادل کو ہانکتا ہے۔ پھر اس کے ٹکڑوں کو آپس میں جوڑتا ہے اور پھر ان کو تہ بہ تہ رکھتا ہے۔ کیا تو نے بادل کے بیچ سے مینھ نکلتے نہیں دیکھا ہے آسمان میں اولوں کے پہاڑ یعنی جمے ہوئے بادل ہیں وہیں ان میں سے اولے برساتا ہے جس پر چاہتا ہے

---

[1] ولقد خلقنا الانسان من سلالة من طين۔ ثم جعلنا نطفة فی قرار مکین۔ ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظما فکسونا العظم لحما ثم انشانه خلقا اخر فتبرک اللہ احسن الخالقین ثم انکم بعد ذلک لمیتون۔ ثم انکم یوم القیمة تبعثون ولقد خلقنا فوقکم سبع طرائق وما کنا عن الخلق غفلین۔ وانزلنا من السماء ماء بقدر فاسکنه فی الارض وانا علی ذهاب به لقدرون فانشانا لکم به جنت من نخیل واعناب لکم فیها فواکه کثیرة ومنها تاکلون وشجرة تخرج من طور سیناء تنبت بالدهن وصبغ للاکلین وان لکم فی الانعام لعبرة نسقیکم مما فی بطونها ولکم فیها منافع کثیرة ومنها تاکلون وعلیها وعلی الفلک تحملون۔

[2] اللہ نور السموات والارض مثل نوره کمشکوة فیها مصباح المصباح فی زجاجة الزجاجة کانها کوکب دری یوقد من شجرة مبرکة زیتونة لا شرقیة ولا غربیة یکاد زیتها یضیء ولو لم تمسسه نار نور علی نور یهدی اللہ لنوره من یشاء ویضرب اللہ الامثال للناس واللہ بکل شیء علیم۔

برساتا ہے اور جس پر چاہتا ہے نہیں برساتا۔ بادل میں بجلی کی چمک ایسی ہے گویا آنکھوں کو چکا چوند ہو جاتا ہے۔ اللہ رات اور دن کا ردوبدل کرتا ہے۔ ارباب بصیرت کے لئے اسمیں عبرت ہے اللہ نے تمام جاندار پانی سے پیدا کئے۔ کوئی پیٹ کے بل چلتا ہے اور کوئی دو پاؤں سے چلتا ہے بعض پانچ پاؤں سے چلتے ہیں۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ ہر چیز پر اسکو قدرت ہے[۱]۔ سورہ نور رکوع ۶۔

خدا کی ذات بڑی بابرکت ذات ہے جس نے اپنے بندے محمدؐ پر قرآن اتارا تاکہ تمام جہان کے لوگوں کو ڈرانے والا ہو۔ وہی تو ہے جس کو آسمان و زمین کی سلطنت ہے۔ نہ اس کے کوئی فرزند ہے اور نہ سلطنت میں اس کا کوئی شریک رہا۔ اسی نے ہر چیز پیدا کی اور ہر ایک کے لئے ایک اندازہ ٹھہرا دیا۔ کفار نے اس کے سوا دوسرے معبود اختیار کر رکھے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے۔ بلکہ خود پیدا کئے گئے ہیں اور نہ وہ خود اپنے برے بھلے پر قادر ہیں اور نہ مرنا اور جینا اور نہ پھر اٹھنا ان کے اختیار میں ہے[۲] سورہ فرقان رکوع ۱۔

کتنے جانور ہیں جو اپنی روزی لادے ہوئے نہیں پھرتے اللہ ہی ان کو روزی پہنچاتا ہے۔ اور وہی تم کو بھی روزی پہنچاتا ہے۔ وہ سب کی سنتا ہے اور سب کچھ جانتا ہے[۳] عنکبوت رکوع ۶۔

اللہ مثالاً بیان کرتا ہے کہ ایک شخص غلام ہے۔ جس میں کئی ساجھی ہیں جو آپس میں بڑی کشمکش رکھتے ہیں اور ایک وہ غلام ہے جو تنہا ایک کی ملک ہے۔ کیا ان دونوں غلاموں کی حالت ایک ہو سکتی ہے۔ جواب میں کہا جائے گا کہ نہیں۔ پیغمبر تم کہو الحمد للہ مگر افسوس

---

[۱] الم تران اللہ یزجی سحابا ثم یولف بینہ ثم یجعلہ رکاما فتری الودق یخرج من خللہ وینزل من السماء من جبال فیہا من برد فیصیب بہ من یشاء ویصرفہ عن من یشاء یکاد سنا برقہ یذہب بالابصار یقلب اللہ الیل والنہار ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار واللہ خلق کل دابۃ من ماء فمنہم من یمشی علی رجلین ومنہم من یمشی علی اربع یخلق اللہ ما یشاء ان اللہ علی کل شئی قدیر۔

[۲] تبرک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعلمین نذیرا الذی لہ ملک السموات والارض ولم یتخذ ولدا ولم یکن لہ شریک فی الملک وخلق کل شئی فقدرہ تقدیرا واتخذوا من دونہ الہۃ لایخلقون شیئا وہم یخلقون ولا یملکون لانفسہم ضرا ولا نفعا ولا یملکون موتا ولا حیوۃ ولا نشورا۔

[۳] وکاین من دآبۃ لاتحمل رزقہا اللہ یرزقہا وآیاکم وہو السمیع العلیم۔

ہے کہ ان میں سے اکثر اتنا بھی نہیں سمجھتے۔[1] سورہ الزمر رکوع ۳۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ایک خدا کو مانتا ہے وہ اس غلام کی طرح ہے جس کا ایک مالک ہوتا ہے خوشی سے زندگی بسر کرتا ہے اور جو شخص سیکڑوں قوتوں کو خدا کا شریک مانتا ہے وہ اس غلام کی طرح ہے جو کئی ایک کے زیر حکومت رہ کر ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔

فصل نمبر ۴۸

حکمت و فلسفہ کے متعلق آیات قرآنی

دنیا میں دو قسم کے اسباب ہیں ایک ظاہر اور ایک پوشیدہ۔ جیسا کہ حقیقت اسلام و فصل ۴۶ میں بیان کیا گیا ہے۔ اسباب ظاہر کا سمجھنا انسان کی قوت مدرکہ پر موقوف ہے جتنا ہی غور کرے گا اتنا ہی اچھی طرح وہ ان کو سمجھ سکے گا لیکن اسباب مخفیہ کو سمجھنا عبث ہے کیونکہ وہ صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکتے۔ محض قیاسات سے لوگ کام لیتے ہیں۔ اور قیاس کرنے والے خود ہی حد درجہ یقین نہیں رکھتے۔ مثلاً اختلاف لیل و نہار کے اسباب کو خدا نے پوشیدہ رکھا ہے ہزاروں برس تک عقلائے زمانہ یہ سمجھتے رہے کہ آفتاب زمین کے گرد گھومتا ہے اور اب سیکڑوں برس سے یہ خیال ہے کہ زمین گھومتی ہے آفتاب ساکن ہے۔ اتنا تو لوگ سمجھے کہ زمین آفتاب سے روشنی حاصل کرتی ہے اور یہ بھی سمجھے کہ ماہتاب بھی آفتاب کی وجہ سے روشن دکھائی دیتا ہے لیکن یہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ آفتاب کیوں روشن ہے اور ممکن ہے کہ کل یہ رائے قائم ہو کہ چاند میں جو روشنی آتی ہے وہ سورج کی فیاضی کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا سبب کچھ اور ہے۔ غرض کہ اسباب مخفیہ پر سوال کرنا انسانی طبیعت کا مقتضا ہے اور اس پر کچھ نہ کچھ رائے قائم کر لینا اس کا خاصہ ہے اور یہ بھی اس کا خاصہ ہے کہ جب تک اس کی رائے میں تبدیلی نہیں ہوتی وہ اپنی رائے کو یقین کے درجے تک سمجھتا ہے۔

پیغمبرؐ خدا ضرور اپنے وقت کے حکیم تھے اور ہمارا تو یہ عقیدہ ہے کہ ان سے زیادہ عقل

والا آج تک کوئی دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ لوگ ان اسباب مخفیہ کی بابت پیغمبرؐ خدا سے سوالات کیا کرتے تھے اور آنحضرت اس کے جواب میں اختصار کو کام میں لاتے تھے اس اختصار کے دو وجوہ تھے اول یہ کہ آنحضرتؐ کو تمدن اور معاشرت کی اصلاح منظور تھی وہ لا طائل باتوں کی طرف توجہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ آنحضرت جانتے تھے کہ جب تک انسان اس عالم ناسوتی میں ہے وہ عالم ملکوتی کی باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ اپنے خیال کے مطابق وہ ہمیشہ نئے طور پر غور کرتا رہتا ہے اور اس کے متعلق نئی باتیں پیدا کرتا ہے لیکن حقیقت تک نہ وہ پہنچا اور نہ پہنچ سکتا ہے۔ پیغمبرؐ خدا کے منہ سے کسی بات کا نکلنا مذہب کو بازیچہ طفلان بنا دیتا۔ یہ بھی واضح رہے کہ جن باتوں کے بیان کرنے سے قرآن میں اغماض کیا گیا آج تک کسی شخص نے اس کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں کہی جو ہر زمانے کے عقلا کی تشفی کا سبب ہو۔

پیغمبرؐ خدا سے لوگوں نے چاند کی حقیقت اور اس کا گھٹنا بڑھنا پوچھا۔ اور ایک طور پر گویا تمام علم ہیئت کا سبق پڑھنا چاہا۔ پیغمبرؐ خدا اگر علم ہیئت قدیمہ کے مطابق اس کیلئے اظہار قابلیت کرنا چاہتے تو اس زمانے میں انکی رائے باطل سمجھی جاتی اور اگر علم جدیدہ کے مطابق ارشاد فرماتے تو اس وقت کے علماء ایمان نہ لاتے۔ اس لئے پیغمبرؐ نے کہا تمہیں ان جھگڑوں سے کیا مطلب۔ اتنا سمجھ لو کہ یہ معاملات اور عبادات کے لئے وقت بنایا گیا ہے سورہ بقر کے رکوع ۲۴ میں ہے[1]۔

"پیغمبر لوگ تم سے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ تم کہدو کہ چاند سے لوگوں کے معاملات اور عبادات مثلاً حج کے اوقات معلوم ہوتے ہیں"۔

حکمت کی کئی قسمیں ہیں۔ حسن تمدن اور حسن معاشرت بھی ایک حکمت ہے عقل سلیم اور رائے صائب سب سے بڑی حکمت ہے۔

سورۂ بقر کے رکوع ۲ میں خدا فرماتا ہے۔

"خدا جس کو چاہتا ہے حکمت (بات کی سمجھ) عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت یعنی بات کی سمجھ دی گئی اس نے بڑی ہی دولت پائی[2]"

---

[1] یسئلونک عن الاھلۃ قل ہی مواقیت للناس والحج۔

[2] یوتی الحکمۃ من یشاء ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا۔

دنیا ایک لفظ ہے جس کا ہم معنی لفظ مختلف زبانوں میں ہے اور زبان زد خلائق ہے۔ لیکن کہیں اسکی ٹھیک تعریف نہیں پائی جاتی۔

ہندوؤں میں اس کو 'مایا' یا 'مایا روپی' سے تعبیر کیا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے اچھا لفظ مل نہیں سکتا۔ لیکن ہمارے نزدیک قرآن میں جو لفظ اس کے لئے آیا ہے وہ اس سے بھی اچھا ہے۔

سورۂ آل عمران رکوع ۱۹[1] میں ہے :-

"دنیا کی زندگی صرف دھوکے کی پونجی ہے" دھوکے کی پونجی "مطاع غرور" کا ترجمہ ہے۔ لیکن مطاع غرور میں جو لطف ہے وہ ترجمہ میں ادا نہیں ہوا۔ جس طرح "مایا روپی" کا لفظ ہندی زبان کے اعتبار سے بہت اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح عربی زبان کے اعتبار سے "مطاع غرور" کا لفظ نہایت ہی مناسب ہے اور اس میں بے ثباتی دنیا کا جو مفہوم ادا ہوتا ہے وہ مایا روپی میں ادا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں جو لفظ مطاع غرور کا دنیا کے لئے استعمال کیا گیا ہے وہ بالکل انوکھا ہے انگریزی میں ایک لفظ ورلڈ فالی WORLD FAULY ہے۔ قرآن میں "مطاع غرور" ہے وہ "مایا روپی" یا "ورلڈ فالی" دونوں پر حاوی ہے۔

اس کے قریب قریب سورۂ توبہ رکوع ۶[2] میں نصیحت کے پیرائے میں مذکور ہے۔

"کیا تم آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی پر قناعت کر کے بیٹھے ہو۔ دنیا کی زندگی کے فائدے آخرت کے مقابلہ میں محض بے حقیقت ہیں"

قوم کا عروج اور زوال بھی دنیا کا ایک تماشا ہے۔ جب دن اچھے آتے ہیں تو غیب سے سامان ہو جاتا ہے اور جب زوال آتا ہے تو پھر کسی طرح کسی کے روکے نہیں رکتا۔ خدا تو ہر قوم کا پیدا کرنے والا ہے وہ ہر قوم کو باری باری سے گھٹاتا ہے۔

---

[1] وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور۔

[2] ارضیتم بالحیوۃ الدنیا من الآخرۃ فما متاع الحیوۃ الدنیا فی الآخرۃ الا قلیل۔

"تمام قوموں کے لئے مٹنے کا ایک وقت ہے۔ جب وہ وقت آگیا تو پھر نہ وہ ایک ساعت پیچھے رہ سکتی ہے اور نہ ایک ساعت آگے بڑھ سکتی ہے"۔

اسلام نے یہ تعلیم کی کہ اچھے اعمال کی جزا اچھی ملے گی اور برے اعمال کی جزا بری ملے گی اب سوال یہ ہوا کہ یہ جزا بعد مرنے کے کیونکر ملے گی۔ اس کا جواب صاف یہ ہے کہ روح کو جزائے اعمال بھگتنا ہوگی جو لوگ کہ ذی فہم ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ روح جب عالم غیر مادی میں ہوگی اسی کے موافق غیر مادی جزا اور سزا بھی ہوگی۔ لیکن سب تو حکمت و فلسفہ پڑھے ہوئے نہیں ہیں اس لئے مضمون کو عام فہم کرنے کیلئے لسان تمثیلی کی ضرورت ہوئی۔ لوگ اس پر استعجاب کرنے لگے تو یہ آیت[1] اتری۔

لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم گل سڑ کر ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو ہم از سر نو پیدا کئے جائیں گے اور اٹھائے جائیں گے۔ پیغمبر تو ان سے کہو۔ تم پتھر لوہا یا اپنے خیال کے مطابق اور بڑی چیز بن جاؤ گے جب بھی زندہ کئے جاؤ گے۔ اس پر لوگ پوچھیں گے کہ کون ہم کو زندہ کرے گا تو کہنا وہی جس نے اول بار تم کو پیدا کیا تھا۔ اس پر یہ لوگ تمہارے آگے سر جھکانے لگیں گے اور پوچھیں گے کہ کیا ایسا ہی ہوگا تو کہنا عجب نہیں کہ قریب ہی ایسا ہو۔ سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۵۔

دنیا میں سب سے بڑا اہم مسئلہ روح کا ہے۔ اس کے متعلق بیسیوں اقوال ہیں اور ہر ایک دوسرے سے الگ ہر مذہب اور ہر فرقے اور ہر ملک میں کچھ نہ کچھ رائیں اس کے متعلق ضرور ظاہر کی گئی ہیں۔ لیکن سب اپنی رایوں کی نسبت یہی کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اس کے خلاف ہو کوئی شخص اگر وہ مقلد نہیں ہے محض رائے زن ہے کسی طرح اپنی رائے پر یقین نہیں رکھتا اور حق یہ ہے کہ اس عالم میں جب تک ہم ہیں کسی طرح یہ نہیں سمجھ سکتے کہ روح کیا چیز ہے۔ اور کیونکر بنی۔ کہاں تھی۔ کہاں رہتی ہے۔ کہاں سے اور کیونکر آئی۔ کیوں آئی۔ کہاں گئی۔ کیسے گئی اور اگر وہ کوئی چیز نہیں ہے تو یہ کیا کہ اس کی وجہ سے سب کچھ تھا اور اس کے جانے سے سب کچھ جاتا رہا۔ یہی سوال پیغمبر خدا سے کیا گیا۔ جواب اتنا عمدہ ملا کہ ایسا جواب اس عالم ناسوتی میں ہو نہیں سکتا۔ سورۂ بنی اسرائیل رکوع[2] میں ہے "پیغمبر تم سے روح کی حقیقت دریافت کرتے ہیں تو کہو روح میرے پروردگار کا ایک حکم ہے اور تم کو تھوڑا ہی علم دیا گیا ہے"۔ یعنی تمہاری معلومات ایسی نہیں ہیں کہ تم سے روح کی حقیقت

---

[1] وقالوا ءاذا کنا عظاما ورفاتا ءانا لمبعوثون خلقا جدیدا قل کونوا حجارۃ او حدیدا او خلقا مما یکبر فی صدورکم فسیقولون من یعیدنا قل الذی فطرکم اول مرۃ فسینغضون الیک رءوسهم ویقولون متی ہو قل عسی ان یکون قریبا۔

[2] ویسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔

بیان کی جائے اور تم سمجھ سکو۔

افلاطون اس جزا و سزا کی نسبت لکھتا ہے کہ روح نے اگر اچھے اعمال کئے ہیں تو اسے مرنے پر خوشی ہوگی اور اگر برے اعمال کئے ہیں تو افسوس اور رنج ہوگا۔ اگر یہی خوشی اور رنج فلاسفہ کے سمجھانے کے لئے جنت اور دوزخ سے تعبیر کیا جائے تو ایمان میں فرق نہیں آتا بشرطیکہ خوشی تمام نعمائے دنیا سے بڑھ کر ہو اور رنج اس تکلیف سے بڑھ کر مانا جائے جو دنیا میں آگ سے جل کر محسوس ہوتی ہے۔

دنیا میں غیب کا علم کسی کو نہیں ہو سکتا۔ ابر آیا تو قیاس ہوا کہ پانی برسے گا۔ ذرا اور معلومات بڑھیں تو تار کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ خلیج بنگالہ سے ابر باراں چل چکا ہے۔ قیاس سے کہا گیا کہ آٹھ دس روز میں ممالک مغربی و شمالی میں بھی بارش ہوگی۔ تپ دق درجہ سوم پر پہنچ گئی تو طبیب نے کہا کہ اب مریض نہ بچے گا۔ ان تمام قیاسات میں غیب کا علم نہیں ہے اور جو قطعی طور پر حکم لگاتے ہیں کہ خواہ مخواہ فلاں بات فلاں دن ہوگی اور خود کو گویا عالم الغیب کہتے ہیں وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ رمل۔ جفر۔ علم نجوم۔ علم قیافہ تمام علم کوئی قطعی حکم نہیں دے سکتے یہ وسائل اور ذرائع ہیں قیاسات قائم کرنے کے لیکن قیاسات تجربہ سے ہر حالت میں صحیح نہیں پائے جاتے۔ اسلام نے ان باتوں پر پورا یقین کرنا منع کر دیا ہے کیونکہ انسان کو اس طرح دھوکہ ہوتا ہے۔ اس نے اس طرح کے علوم سیکھنے کو بیکار و بے سود ٹھہرایا ہے اور اس پر یقین کرنے کو معصیت قرار دیا ہے۔ یعنی یوں کہنا کہ خواہ مخواہ یوں ہی ہوگا کہ منجم نے ایسا ہی بتایا ہے داخل کفر ہے اور یہ خیال کرنا کہ منجم نے یوں کہا ہے ممکن ہے ایسا ہی ہو بے عقلی ہے عرب میں غیب کی خبر دینے والے کاہن کے نام سے مشہور تھے جیسا کہ یہاں رذیل قوموں میں سوکھے دغیب کی باتیں کرنے والے غیب داں کہلاتے ہیں وہ اپنی قوت نفس سے کچھ باتیں بتایا کرتے تھے اور ان میں کچھ باتیں صحیح ہوتی تھیں اور کچھ باتیں غلط ہوتی تھیں ان اوہام باطلہ سے انسان کو نجات دلانے کے لئے سورۂ لقمٰن رکوع ۴ میں محکوم ہوا۔

"بے شک اللہ ہی کو قیامت کا علم ہے۔ وہی مینھ برساتا ہے۔ وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹ میں کیا ہے۔ کوئی دوسرا نہیں جانتا کہ وہ خود کس زمین میں مرے گا۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ خود کل کیا کرے گا۔ ان سب باتوں کا علم اور خبر اللہ ہی کو ہے[1]"

انسان جس طرح بتدریج بڑھتا ہے اسی طرح وہ بتدریج گھٹتا ہے اگر کوئی شخص عمر طبعی تک پہنچ کر گھل گھل کر مرے تو اسکی کیفیت مثل نوزائدہ بچے کے ہو جائیگی ہڈیاں تو چھوٹی نہ ہوں گی مگر

---

[1] ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث ویعلم ما فی الارحام وما تدری نفس ماذا تکسب غداً وما تدری نفس بای ارض تموت ان اللہ علیم خبیر۔

تمام باتیں بچوں کی سی ہو جائیں گی۔ دانت گر جائیں گے سوائے کراہنے کے اور کوئی بات منہ سے نہ نکلے گی۔ بال کم ہو جائیں گے۔ سوائے دودھ کے دوسری غذا ہضم نہ ہو گی اور نہ بغیر دوسرے کے سہارے کے وہ کروٹ بدل سکے گا۔ یہی حالت سورہ لیٰسین کے رکوع پنجم میں ہے۔

"جسکی عمر ہم زیادہ کرتے ہیں اسے بناوٹ میں الٹا گھٹاتے جاتے ہیں"[1]

پہلے تو کفار عرب سوا کھانے پینے اور سونے کے کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ مار پیٹ لڑائی جھگڑے سے کام تھا وہ کسی سے ڈرتے نہ تھے اگر ڈرتے تھے تو صرف بتوں سے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ کیوں۔ اسلام نے ان کو بتایا کہ بتوں کے اختیارات کچھ بھی نہیں ہیں یہ ادنیٰ قسم کی مخلوق جمادات سے ہیں۔ اعلیٰ مخلوق عالم یعنی نوع انسانی سے بھی بڑھ کر ذات باری تعالیٰ ہے جس نے انسان کو اور دوسری تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد جو عربوں کی آنکھیں کھلیں تو دلوں میں سوالات بھی پیدا ہوئے اور سوالات ایسے کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے آج تک کسی عالم نے قابل تشفی جواب نہ دیا اور کوئی جواب دے بھی نہیں سکتا۔ اور نہ مخاطب کو سمجھا سکتا ہے جب تک متکلم اور مخاطب دونوں علم ناسوتی سے الگ نہ ہو جائیں یا انکی ارواح میں اتنی صفائی نہ آ جائے کہ اس عالم میں رہ کر دوسرے عالم کی باتیں سمجھ سکیں تب تک اس قسم کے مسائل کے مبادیات پر گفتگو بھی عبث ہے۔ قرآن میں اس کا جواب دیا گیا ہے لیکن نہایت ہی مختصر اور اتنا اچھا کہ اس سے اچھا جواب ہو نہیں سکتا۔ سورۂ مومن میں ساتویں رکوع میں ہے۔

"وہی جلاتا ہے وہی مارتا ہے۔ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو۔ اور وہ ہو جاتا ہے"[2]

"کہتا ہے" کے معنی ارادہ کرتا ہے۔ سمجھو تو مطلب صاف ہے۔

خلقت زمین و آسمان کے متعلق سورۂ حٰم کے رکوع ۲ میں ہے۔

"پیغمبر! لوگوں سے تم کہو۔ کیا تم اس (اللہ) سے انکار کرتے ہو۔ جس نے دو دن میں زمین پیدا کی اور اس کا ہمسر تم دوسرے کو ٹھہراتے ہو۔ وہی سارے جہان کا پروردگار ہے اور اسی نے زمین میں اوپر سے پہاڑ گاڑ دیئے ہیں اور اس میں برکت دی ہے اور اسی میں ایک اندازۂ مناسب کے

---

[1] ومن نعمرہ ننکسہ فی الخلق۔

[2] ھوالذی یحی ویمیت فاذا قضی امراً فانما یقول لہ کن فیکون۔

ساتھ اس کے باشندوں کے کھانے پینے کا بندوبست کر دیا ہے۔ سب کچھ چار دنوں میں سب مانگنے والوں کے لئے برابر۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت کہر کی طرح کا تھا تو اس کہر کو اور زمین کو حکم دیا کہ تم خوشی سے آؤ تو آؤ اور زبردستی آؤ تو آؤ۔ دونوں نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ اس کے بعد دو دن میں اس نے اس کہر کے سات آسمان بنائے اور ہر ایک آسمان میں انتظام کر دیا نیچے کے آسمان کو ہم نے قندیلوں سے سجایا اور حفاظت کے لئے بھی ایسا کیا۔ یہ اندازے اس کے باندھے ہوئے ہیں جو زبردست اور دانا ہے[1]"

یہ آیت ہیئت افلاک ظاہر کرنے کے لئے نہیں اتری ہے بلکہ خدا اپنی آفرینش یاد دلا کر کہتا ہے کہ جس طرح ہم نے یہ سب کچھ بنایا اسی طرح نافرمانوں کو ہم تباہ بھی کرتے ہیں اس کے بعد آیت یوں ہے۔

"اگر اس پر بھی کفار سرتابی کریں تو ان سے کہدو کہ جیسی کڑک عاد اور ثمود پر ہوئی تھی اسی طرح کی کڑک سے میں تم کو بھی ڈراتا ہوں[2]"

جب مقصود سمجھانا تھا تو مناسب یہی تھا کہ مخاطب کی سمجھ کے مطابق گفتگو کی جاتی اور اسی لئے خلقت ارض و سما کے متعلق یہودیوں میں جو باتیں مشہور تھیں وہی تحریر کی گئیں۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ یہ تحریر فلسفہ قدیم یا فلسفہ جدید کے مخالف نہیں ہے۔ مفصل بیان اس کا "آفرینش ارض وسما" فصل ۵۰ میں دیکھو۔

رزق کوشش پر رکھا گیا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باوجود کوشش کے رزق حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ رزق کسی قوم سے ناپید ہو جائے۔ رزق اگر مویشیوں کی طرح انسان کو ملا کرتا یعنی نباتات ارض سے انسانی خوراک بھی مہیا ہو جاتی تو انتظام عالم جہاں تک نوع انسانی سے تعلق ہے قائم نہ رہتا اسی مضمون کو خدا سورۂ شوریٰ رکوع ۳ میں سمجھاتا ہے۔

---

[1] قل ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین وتجعلون لہ انداداً ذالک رب العالمین وجعل فیھا رواسی من فوقھا وبرک فیھا وقدر فیھا اقواتھا فی اربعۃ ایام سواءً للسائلین ثم استویٰ الی السماء وھی دخان فقال لھا وللارض ائتیا طوعاً او کرھاً قالتا اتینا طائعین فقضٰھن سبع سمٰوات فی یومین واوحیٰ فی کل سماء امرھا وزینّا السماء الدنیا بمصابیح وحفظاً ذالک تقدیر العزیز العلیم۔

[2] فان اعرضوا فقل انذرتکم صٰعقۃً مثل صٰعقۃ عاد وثمود۔

۱۰اگر خدا اپنے بندوں کی روزی فراخ کر دے تو وہ ضرور ملک میں سرکشی کرنے لگیں۔ مگر خدا اپنے بندوں سے خبر دار ہے اور ان کا نگراں ہے۔ جتنی روزی چاہتا ہے بقدر مناسب دیتا ہے[۱]۔"

قرآن میں آنحضرتؐ کا معجزہ ایک بھی نہیں لکھا گیا ہے۔ بلکہ بار بار یہ لکھا گیا ہے کہ لوگ پیغمبرؐ سے یہ فرمائش کرتے تھے کہ کوئی بات خرق عادت کی دکھاؤ تو ہم تم کو سچا سمجھیں۔ اور پیغمبر کہتے تھے کہ اور پیغمبر دن کی امت نے معجزہ کا کیا اعتبار کیا تھا کہ میں تم کو دکھاؤں لیکن کتب سیر اور احادیث میں چند باتیں ضرور از قسم خرق عادات آنحضرت کی طرف منسوب کی جاتی ہیں جن میں واقع شق القمر بھی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ لوگوں نے آنحضرتؐ سے اصرار کیا کہ چاند کو دو ٹکڑے کر دو تو ہم تم کو سچا پیغمبرؐ سمجھیں۔ آنحضرتؐ نے جناب باری میں دعا کی اور چاند دو ٹکڑے نظر آیا۔ بعض کہتے ہیں کہ نہ پیغمبر میں چاند کو دو ٹکڑے کرنے کی طاقت تھی اور نہ خدا کو چاند کے تقسیم کرنے کی ضرورت تھی۔ خدا کو اتنا ہی اہتمام کرنا تھا تو بجائے قمر و نیم کرنے کے وہ کفار کا دل ہی نہ پھیر دیتا۔ خدا کو اسلام کا اسباب دنیا کے ساتھ جاری کرنا مقصود تھا۔ اسباب دنیا سے قطع کر کے اسلام کا جاری کرنا اس کو مقصود ہوتا تو تاریخی حالات اسلام کے وہ نہ ہوتے جو ہوئے۔ لیکن معجزہ شق القمر صحیح ہو تو اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے۔ جب پیغمبرؐ کو لوگوں نے بہت مجبور کیا تو انھوں نے اپنی قوت نفس کا اثر جو بلحاظ شان پیغمبری سب سے اعلیٰ درجہ پر آنحضرتؐ میں بھی تھا ان کفار پر بھی ڈالا اور ان کفار کو چاند دو ٹکڑے نظر آیا۔ جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کا عصا فرعونیوں کو سانپ نظر آیا تھا۔ دیکھو سحر (جادو) فصل ۱۵ میں لیکن جن مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ صرف چاند دو ٹکڑے دن میں نظر نہیں آیا بلکہ فی الواقع چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے وہ بھی دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہے کیونکہ ایسا خیال رکھنے والے یہ نہیں کہتے کہ پیغمبرؐ نے دو ٹکڑے کئے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ خدا نے دو ٹکڑے کئے اور خدا کے لئے دو ٹکڑے کیا دو کروڑ ٹکڑے کرنے بھی آسان تھے۔ شق قمر کا واقعہ جن کے نزدیک صحیح ہے۔ وہ مفصلہ ذیل آیت قرآن کو اسی واقعہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

"قیامت قریب آگئی اور چاند شق ہو گیا یہ لوگ کچھ ہی دیکھیں لیکن روگردانی کریں گے اور کہیں گے کہ یہ سحر ہے اور ایسا ہوتا چلا آیا ہے[۲]۔" سورۂ قمر رکوع اول۔

معجزۂ شق قمر کے نہ ماننے والے کہتے ہیں کہ یہ آیت قیامت کی علامات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس مضمون کو زائد وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے مضمون فصل ۱۵ دیکھئے۔

---

[۱] ولو بسط اللہ الرزق لعبادہ لبغوا فی الارض ولکن ینزل بقدر ما یشاء انہ بعبادہ خبیر بصیر۔

[۲] اقتربت الساعۃ وانشق القمر وان یروا اٰیۃ یعرضوا و یقولوا سحر مستمر۔

فصل نمبر ۴۹

اسلام اور فلسفہ

دنیا کے پچھلے حالات پر غور کیجئے تو عجائبات سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسلام یا عیسائیت کے ساتھ پچھلے زمانے کے قصص کو بھی تعلق ہے۔ چند قصے قرآن میں بھی مذکور ہیں ان سے یہود اور نصاریٰ کے پرانے قصص کی تائید ہوتی ہے اس لئے ہم کو اس کہنے کی جرأت ہو سکتی ہے کہ اہل اسلام جو پرانے قصے بیان کرتے ہیں وہ سب سے زیادہ صحیح سمجھے جاتے ہیں۔ یہودی، عیسائی اور اہل اسلام یہ تینوں مل کر یقیناً دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ پورا کرتے ہیں۔ شروع سے چلیے۔ حضرت آدمؑ کی پیدائش، شیطان کا حسد اور پھر اس کا راندۂ درگاہ ہونا۔ آدم کا دنیا میں آنا۔ حوّا کا ملنا لوح کے زمانے کے حالات۔ دنیا کا گویا پھر سے بننا۔ ابراہیمؑ کا آگ میں گر کر نہ جلنا۔ موسیٰؑ کا عصا اور پھر اس کے واقعات۔ عیسیٰؑ کا بے باپ کے پیدا ہونا۔ پیغمبر آخرالزماں کے وقت کے بعض معجزات۔ ہم نے تو بہت مختصر کہا۔ غور کیجئے تو کسی پیغمبر کا زمانہ ان معجزات سے خالی نہیں ہے۔ حضرت سلیمانؑ کو دیکھے کہ ہوا ان کے زیر فرمان تھی۔ دیو اور پری خادم تھے حیوانات کی بولی وہ سمجھتے تھے اگر ان باتوں کو جھوٹا سمجھیے تو پھر قصہ ہی ختم ہے اور اگر سچ سمجھیے تو پھر ہندو جو ہندوستان کے پچھلے حالات بیان کرتے ہیں ان کو بھی غیر ممکن یا محال ٹھہرانا آسان نہیں ہے۔ اگر ان عجوبہ باتوں کا تعلق پیغمبروں سے مختص سمجھا جائے جب بھی یہ کہنا کہ ہندوستان کی سرزمین پیغمبروں سے خالی رہی بہت بڑی زیادتی ہے اور فیضان الٰہی کو ارض روم کے ساتھ مختص سمجھ لینا بڑی بے امتیازی ہے کرشن جی کے حالات یا رام

چندر جی کے کوائف جو ہندو بیان کرتے ہیں مانا کہ ان کی نسبت مبالغہ کا احتمال ہے مگر شروع سے ان کو غلط یا غیر ممکن سمجھ لینا زیادتی ہے اور گویا درپردہ یہ کہنا ہے کہ "ہنو دیرا نہ مانو ہم اپنی کتابوں کے قصّوں کو بھی تو ایسا ہی لچر سمجھتے ہیں" ۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا کے کسی واقعے کو بے سمجھے بوجھے آسانی سے غلط یا غیر ممکن مان لینا صریح خدا کے قادر مطلق ہونے سے انکار کرنا ہے ۔

مذہبی خیال کو الگ کیجئے جب بھی تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ ابتدائے زمانہ میں بہت سی باتیں ایسی تھیں جو اس وقت عجائبات میں شامل کی جاتی ہیں اور چونکہ مختلف ملکوں کی تاریخیں انکی تائید کرتی ہیں اس لئے ان سے انکار کرنے کو ہرگز جی نہیں چاہتا ۔ مثلاً جس وقت، حالت یا کیفیت کو دیو پری سے یہود و نصاریٰ اہل اسلام تعبیر کرتے ہیں اس سے ایرانی تاریخ بھی تو متکیف ہے ۔ تاریخ ایران میں بادشاہوں کا دیووں سے جدال کرنا صاف درج ہے ہندوؤں کی کتابوں میں بھی ایسے عجیب الخلقت لوگوں کے تذکرے پائے جاتے ہیں کہ ان کو دیو سمجھیں تو بے جا نہیں ہے بہرحال یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ انتظام عالم کی جو کیفیت اب ہے پہلے اس کے خلاف تھی اور بارہا انقلاب نے ترقی اور تنزل کی حالتیں دکھلا دی ہیں ۔ چیزوں کے نام بدل گئے شہر کے نام بدل گئے جو قوتیں اور صنعتیں معدوم ہوگئیں ان کے بیانات اور تشریحات کے ذرائع بھی تو مفقود ہو گئے ۔ پہلے کچھ تھا اور نقل ہوتے ہوتے کچھ رہ گیا کوئی راز جب کہہ دیا گیا راز نہیں رہتا کوئی صنعت جب ایام گذر گئے صنعت کی مد میں شمار نہیں کی جاتی ایک شئے کو ہم بہت عظیم سمجھتے ہیں لیکن اس سے واقف ہوگئے تو دل سے اسکی عظمت جاتی رہی ۔ یہاں ہم بیٹھے ہوئے نیویارک کے باشندے سے تار کے ذریعہ سے گفتگو کر رہے ہیں ۔ دن چھپنے کے بعد ہم بانکی پور میں سوئے اور دن نکلنے سے پہلے ہم کلکتہ میں داخل ہو گئے ۔ زمانہ پلٹ جائے تار اور ریل معدوم ہو جائیں تو ان باتوں کو کتاب میں پڑھ کر لوگ کس طرح سمجھ سکیں گے ۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ پچھلی باتیں انھیں دو جملوں پر قیاس کر لی جائیں لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ سوچنے کے لئے یہ بھی ایک پہلو ہے ۔ ہاں خوب یاد آیا ابھی حال ہی میں افریقہ جنوبی کے وحشیوں کو انگریزوں سے مقابلہ کرنا پڑا ۔ جہالت کا اقتضاء ہے نخوت ۔ یہ وحشی (متابلی کہلاتے ہیں) تلوار لے کر توپ اور بندوق کے مورچے پر لوٹ پڑے ۔ چلے تو تھے یہ سمجھ کر کہ انگریزوں کا خاتمہ کر دیں گے اور انگریزوں کے پاس بھی نری تلواریں ہوتیں تو شاید ہوتا بھی ایسا ہی ۔ لیکن یہاں تو بندوق اور توپ تھی ۔ باڑھ جو داغی سب راستے ہی میں ختم ہو گئے انگریزی سپاہیوں کی صورتیں بھی ان بے چاروں کو دیکھنی نصیب نہ ہوئیں ان میں سے دو چار بچ

کر اپنی قوم کے پاس گئے تو کہنے لگے کہ انگریز بڑے جادوگر ہیں سحر سے یہ مار ڈالتے ہیں لڑائی کی نوبت آنے نہیں پاتی۔ یہ ایک ایسا طریقہ ہے کہ بہت سی مذہبی باتیں اس طور پر بھی سمجھائی جا سکتی ہیں۔
فلسفہ کی تعلیم اسباب پر غور کرنے کی عادت پیدا کر دیتی ہے اور پھر یہ بھی سکھاتی ہے کہ باپ دادا سے سنی سنائی باتوں پر بے سمجھے عمل کرنا دانشمندی نہیں ہے بس انھیں دو باتوں نے فلسفہ کو مذہب کے حق میں برا ثابت کر رکھا ہے۔ اب بعض تو فلسفہ پڑھنا ہی ناروا ٹھہراتے ہیں اور بعض یہ کوشش کرتے ہیں کہ فلسفہ پڑھایا جائے اور مذہبی امور میں تاویلیں کر لی جائیں تاکہ مذہبی باتیں کھیل نہ معلوم ہوں۔ یہ دونوں اپنے اپنے طور پر مذہب کے خیر خواہ ہیں۔ فلسفہ عقل کو بڑھانے کے لئے پڑھا جاتا ہے۔ اور مذہب اخلاق سکھانے کو۔ مذہب کو تو یہ دونوں مقدم سمجھے لیکن فرق اتنا رہا کہ ایک ایسی عقل کے بڑھنے سے باز آیا جس سے اخلاق بگڑ جائیں اور دوسرے نے یہ کوشش کی کہ عقل بھی بڑھتی رہے اور مذہبی اخلاق بھی قائم رہے لیکن ہمارے نزدیک ایک تیسری صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ سمجھنا کہ فلسفہ سے مذہب کو نقصان پہنچے گا بیجا ہے۔ فلسفہ ہرگز مذہب کا دشمن نہیں ہے۔ لیکن فلسفہ کیا ہے؟ یہی سمجھنے کی بات ہے۔ آگ کیونکر پیدا ہوئی۔ پانی کس طرح ہوا بن گیا۔ بخارات سے کس طرح بارش ہوتی ہے اور ایسے ہی انتظام عالم کے متعلق دو چار باتوں کا سمجھ لینا لوگ فلسفہ پڑھنا سمجھ لیتے ہیں۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فلسفہ کی اصل ماہیت سے بہت سے طلبا ناواقف ہیں اور یہی ناواقفیت تھوڑی استعداد والوں کو جاب بحر کی طرح ابھرنے پر مجبور کرتی ہے۔ خلقت عالم کی ماہیت سے پورے طور پر تو آج تک کوئی واقف نہیں ہوا اور نا واقف ہو سکتا ہے۔ اتنا ہی سمجھ سکتے ہیں کہ عالم کی خلقت جس کی طرف منسوب ہوتی ہے یا سلسلہ اسباب جہاں جا کر ختم ہو سکتا ہے اسی قوت کا نام خالق عالم ہے اور عالم کے حالات پر مختلف طور سے سوچنے کا نام فلسفہ ہے۔ جب یہ معلوم ہو چکا کہ ماہیت عالم سے واقفیت حاصل کرنا عملی طور پر غیر ممکن ہے تو اب بجز فکر کرنے کے جس کو معرفت کردگار کہہ سکتے ہیں۔ فلسفی کو یہ حق کہاں سے پیدا ہوا کہ وہ کسی شے کو ممکن الوقوع یا کسی شے کو غیر ممکن الوقوع قطعی طور پر مان لیں۔ ظاہر ہے کہ جب اصل شے یعنی خلقت عالم پر قطعی رائے دینے سے معذوری ہے تو اس کے فروعات کے متعلق کیونکر کوئی رائے مستحکم قائم ہو سکتی ہے۔ جس طرح خود بخود خالق مطلق کی خواہش سے عالم کا موجود ہونا مان لیا جاتا ہے ویسے ہی یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ دنیا کی تمام باتیں ہر وقت اور ہر لحاظ سے از سر نو پیدا ہو سکتی ہیں۔ آگ ٹھنڈی ہو سکتی ہے۔ پانی پتھر ہو سکتا ہے مردہ زندہ ہو سکتا ہے

حیوانات انسان کی بولی بول سکتے ہیں۔ اب اس کو غیر ممکن تو وہ کہے جو پہلے یہ بتائے کہ آگ گرم کیونکر ہوئی۔ پانی سیال کیوں ہوا۔ انسان کی پیدائش میں کیا کیا اسرار ہیں۔ مر کے جینا عملی طور پر کیوں محال ہے۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ اول انسان کس طرح پیدا ہوا۔ اجالے کے بعد اندھیرا ہوا یا اندھیرے کے بعد اجالا۔ پہلے دنیا میں سردی آئی یا گرمی یا خود دنیا ہی کو کوئی بتلائے کہ یہ کیا چیز ہے یہ عجب خیال ہے کہ جس نئی بات کو ہم آنکھ سے دیکھ لیں اس کے لئے تو ایک نہ ایک تاویل پیدا کئے بغیر نہ رہیں گے اور جسے آنکھ سے نہ دیکھیں کان سے سنیں اس پر بے تکلف اپنی رائے نفی میں قائم کر لیں اور رائے بھی ایسی کہ اپنی عقل کو کم سمجھنے میں ہمیں ہزار دقتیں پیش آئیں اور قادر مطلق کے اختیارات کے منتزع کر لینے میں ہمیں ذرا بھی تامل نہ رہے۔

اگر فلسفہ کا یہ مطلب ہے کہ خالق عالم نے تخلیق عالم کے بعد اپنے ہاتھ کٹا ڈالے دنیا کا گورکھ دھندا بنا کر وہ وجود معطل بن بیٹھا تو فلسفہ جہل مرکب ہے۔ اور اگر فلسفہ کا یہ مطلب ہے کہ خالق عالم نے دنیا کو دارالاسباب بنایا ہے اور عموماً ہر بات کے لئے اس نے سبب قرار دے رکھے ہیں۔ ان اسباب کا خواہ مخواہ سمجھ جانا گو ہماری قدرت سے باہر ہے لیکن ان پر غور کرنا ایک قسم کی عبادت ہے تو ہم نہایت خوشی سے کہیں گے کہ فلسفہ بہت ٹھیک ہے اور ہر سچے مذہب کا یہی دستور ہونا چاہیئے۔

مفصلہ بالا تحریر میں جو مختلف خیالات کی توضیح کی گئی ہے اسے ایک دوسرے طور پر یوں سمجھنا چاہیئے۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ پریاں تخت پر بٹھا کر ہوا میں آدمیوں کو اڑا سکتی ہیں تو موجودہ تجربہ کے بہ خلاف ہوگا۔ مگر اس سے مذہب اسلام میں کچھ فرق نہ آئے گا اور اگر کوئی کہے کہ نہیں پریوں میں ایسی قوت نہیں ہے اور نہ پریوں کا وجود ہے جب بھی اس سے اسلام میں فرق نہ آئے گا لیکن جو یہ سمجھے گا کہ پریاں خدا کے حکم سے باہر مطلق العنان قوتیں ہیں اور جو چاہتی ہیں کرتی ہیں تو بیشک وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ یہ خوب واضح رہے کہ مذہب اسلام فلسفہ سکھانے نہیں آیا تھا وہ صرف یہ بتانے آیا تھا کہ بجز ایک ذات باری تعالےٰ کے اور کسی کو قادر مطلق نہ مانو کیونکہ حسن معاشرت سکھانے کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ ہنود کہتے ہیں کہ ان کا مذہب عین فلسفہ ہے ہے ممکن ہے کہ ایسا ہو۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا عین فلسفہ ہونا کوئی وصف نہیں ہے۔ مذہب کا کام ہے حسن معاشرت کا سکھانا۔ عقلی تکے لگانے سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مذہب اسلام فلسفہ کے خلاف ہے یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ عین

فلسفہ ہونا اور فلسفہ کے مخالف نہ ہونا ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اسلام ہرگز فلسفہ کے مخالف نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یقینی ہے کہ اسلام نے فلسفہ کی پرواہ نہیں کی۔ اگر کوئی خاص فلسفہ مذہب اسلام اختیار کرتا۔ تو مذہب کی اصلی . . . . غرض حسن معاشرت کے نظر انداز ہونے کے علاوہ یہ نقص بھی پیدا ہوتا کہ یہ مذہب تمام دنیا کا مذہب اور ہر زمانے کا مذہب نہ رہتا۔ فلسفہ گویا نتیجہ فکر کی ایک قسم ہے اور فکر انسانی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اگر اسلام کوئی فلسفہ خاص اختیار کرتا تو ایک زمانے میں وہ جھوٹا سمجھا جاتا اور دوسرے زمانے میں سچا سمجھا جاتا یا ایک ہی زمانے میں بعضوں کے نزدیک صحیح اور بعضوں کے نزدیک غلط ہوتا۔ اسلام کی خاص حکمت ہے کہ وہ ہر زمانے کے فلسفہ کے مطابق ہے۔ جاہل سے جاہل قوم کی بھی تشفی کر سکتا ہے اور بڑے سے بڑے عقلائے زمانہ کو بھی وہ سمجھا سکتا ہے۔ اس مضمون کو وضاحت سے سمجھنے کے لئے "حکمت اور فلسفہ کے متعلق آیات قرآنی" فصل ۴۸۔ اور قصص قرآنی فصل ۵۳ "شیطان اور جن" فصل ۵۴ "سحر (جادو)" فصل ۵۱۔ آفرینش ارض وسما فصل ۵۰ پڑھنا چاہیئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ فلسفہ مذہب اسلام کے خلاف نہیں ہے اور نہ اس کے پڑھنے سے آدمی گمراہ ہو جاتا ہے۔ قرآن کو جو کوئی محدود حالت میں مانتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ فلسفہ سے اسلام جاتا رہے گا وہ اسلام کی اعلیٰ عظمت سے واقف نہیں ہے۔ اس باب پنجم میں زیادہ تر مضامین اسی قسم کے لکھے جائیں گے جن سے فلسفہ جدید پڑھنے والوں پر یہ ثابت کیا جائے کہ قرآن صرف جہلا کی ہدایت کے لئے نہیں ہے بلکہ عقلا کی ہدایت کے لئے بھی ہے اور ان کا بھی تشفی کرنے والا ہے۔

بعض مسلمانوں نے مجھ سے کہا کہ فلسفہ پڑھنے سے ان کے ایمان میں فرق آ گیا ہے اور اب خدا کو وہ ویسا نہیں سمجھتے جیسا کہ پہلے سمجھتے تھے۔ میں نے اس کے جواب میں کہا کہ بچے اور بڑے خدا کی نسبت یکساں خیال نہیں رکھ سکتے اور نہ علماء اور جہلا ایک سا خیال رکھ سکتے ہیں۔ جو چیز دیکھنے کی نہیں ہے وہ تصور کرنے کی ہے اس کی حالت تصور کے ساتھ بدلتی رہے گی مگر یہ تبدیلی ایمان میں کچھ فرق نہ ڈالے گی۔ حضرت موسیٰؑ اور گڈریے کا قصہ مثنوی مولانا روم میں یوں مذکور ہے کہ گڈریا خدا سے ملنے کی تمنا ظاہر کرتا تھا اور کہتا تھا کہ خدا ملتا تو وہ اسے بھیڑ کا دودھ پلاتا اور بڑی خاطر کرتا۔ حضرت موسیٰؑ نے اسے ڈانٹا لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ گڈریا اپنے پندار کے مطابق خدا کا خیال رکھے گا اور حضرت موسیٰ اپنی دانش کے مطابق

خدا کا تصور کریں گے نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ لیکن اصل میں دونوں متحد ہیں۔ اصل ایمان ہے۔ صرف ایک ہی ذات کو خدا سمجھنا اور اس کو سب پر بالا جاننا اور اس میں دونوں متفق ہیں ایک سرگزشت میں اپنے متعلق بیان کرنا باعث دلچسپی سمجھتا ہوں۔ مجھے صغر سنی میں عبادت کا بڑا شوق تھا اور خدا سے بے حد محبت تھی۔ خدا کا وجود میں جب بھی مانتا تھا اور اب بھی مانتا ہوں۔ لیکن نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ خدا کے ہاتھ آدمی کے ہاتھ کی طرح ہیں اور وہ اپنے ہاتھوں سے چیزوں کو اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھتا ہے۔ گجرات کا سفر مجھے پیش آیا اور میرا اونٹ مال اور اسباب لے کر بھاگ گیا۔ قصہ بہت طول طویل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مجھے اس بے گانی جگہ جب بھوک نے ستایا تو میں نے مسجد میں جاکر نماز پڑھی اور سر سجدہ میں رکھ دیا اور خدا سے درخواست کی کہ اے رزاق مطلق فلاں طاق پر کوئی چیز کھانے کی رکھدے۔ تین مرتبہ میں نے سجدہ سے سر اٹھا کر طاق کو دیکھا کوئی چیز نظر نہ آئی مجھے وثوق کامل تھا کہ کوئی چیز ضرور مل جائے گی۔ گھنٹہ بھر میں اسی حالت میں مبتلا رہا۔ اب جب کبھی میں یاد کرتا ہوں تو اپنی حرکت پر مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے یہ نہایت ہی صغر سنی کا واقعہ ہے اس کے بعد جب ذرا اور میں سن شعور کو پہنچا تو میرا یہ خیال ہوا کہ اپنے ہاتھوں سے چیزوں کا رکھنا اٹھانا خدائی کام نہیں ہے بلکہ اپنے کام میں اس نے تاثیر دے رکھی ہے۔ دعا مانگنے کے بعد اپنے موقع اور محل سے وہ کام خود ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد چند آیات قرآنی ایک دعا کی کتاب سے میں نے یاد کرلیں۔ اور جب کبھی ضرورت ہوتی تو میں پڑھتا تھا اور وہ کام ہو جاتا تھا۔ سات آٹھ مرتبہ کامیاب رہ کر میں نے یہ خیال کیا کہ یہ دعا تیر بہدف ہے اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک مرتبہ نہایت ہی اہم کام کے لئے میں نے چلہ کیا لیکن میرا وہ کام نہ بنا۔ مجھ کو نہایت بے دلی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی خدا کی طرف سے میرے دل میں ناامیدی (نعوذ باللہ من ذلک) پیدا ہوئی اور یہ خیال گزرا کہ میں نے التجا سے مانگا وہ کیسا خدا ہے کہ اس نے دینے میں بخل سے کام لیا۔ اب میری عمر قریب بلوغ کے تھی وہ صغر سنی کی حالت نہ تھی کہ اتنی بڑی مایوسی کے بعد مجھ کو ملال نہ ہوتا۔ اس ناکامی پر مجھے سخت رنج ہوا۔ کچھ عرصہ بعد جب میری معلومات بڑھیں تو میں اپنے خیال پر بہت نادم ہوا اور نئے سرے سے گویا مسلمان ہوا۔

اب میرے خیالات یہ ہیں کہ خدا مسبب الاسباب ہے۔ اسباب ظاہری میں اس نے اپنے بندوں کو اپنے فعل کا مختار بنا دیا ہے اور رہنمائی کے لئے عقل دے دی ہے لیکن اسباب خفیہ

کو نہ کوئی جانتا ہے اور نہ کسی کو سوائے ذات باری تعالےٰ کے اس میں دخل ہے خدا جو کچھ کرتا ہے اچھا کرتا ہے اور وہی اپنے افعال کی مصلحت کو جانتا ہے۔ بندہ لاکھ چاہے لیکن خدا وہی کرتا ہے جو اس کے نزدیک مناسب ہے اس کے افعال جو اسباب خفیہ کے ذریعہ سے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ محرکات انسانی سے باہر ہیں۔ ان پر غور کرنا عبادت ہے لیکن اس کے پیچھے پڑنا گمراہی ہے۔ اب میں سوچتا ہوں تو اپنے اسلام کو بہ نسبت سابق کے کہیں اچھا پاتا ہوں۔ اسی کو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔ بیت

کہ بے علم نتواں خدارا شناخت

فصل نمبر ۵

آفرینش ارض وسما

خلقت ارض وسما کے متعلق گو کوئی قطعی رائے قائم نہیں ہوئی ہے لیکن لوگوں کا خیال ہے اور توارت موجودہ سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے کہ پہلے پانی ہی پانی تھا۔ خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے اس میں حرارت پیدا کی تو پانی پر جھاگ آگیا اور بخارات اڑے۔ جھاگ سخت ہو کر زمین بن گئی اور بخارات سے آسمان بنے۔ آسمان کیا ہیں اور کیونکر بنے اس کی توضیح آئندہ کی جائے گی اس وقت صرف یہ کہنا ہے کہ اگر خلقت ارض وسما کی یہی صورت مانی جائے تو قرآن سے اس کی نفی نہیں ہوتی بلکہ کچھ تائید ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے۔

"پھر آسمان بنایا اور وہ گہر تھا" [1] سورہ حم رکوع ۲

اور دوسری جگہ ہے۔

"اسی نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن میں اور تھا اس کا تخت زمین پر" [2] سورہ ہود رکوع ۹۔

"چھ دن" کا لفظ اس وقت موضوع بحث نہیں ہے اور "تخت" کا لفظ مجازاً آگیا ہے خدا

---

[1] ثم استوی الی السماء وہی دخان۔

[2] وہو الذی خلق السموات والارض فی ستۃ الایام وکان عرشہ علی الماء۔

کے لئے کسی مکان کا مختص ہونا تمام مسلمانوں میں مسلم ہے اور باقی آیت کے معنی صاف ہیں۔ غیر یہ تو اہم مسئلہ نہیں ہے۔ اس کے متعلق کوئی رائے یقینی کسی نے قائم نہیں کی اور نہ مذہب نے کوئی صاف بات بتائی اس لئے اس کو جس طرح چاہیں فرض کر سکتے ہیں بشرطیکہ احکام قرآن سے مخالفت نہ ہو۔ لیکن بحث طلب صرف یہ امر ہے کہ علم ہیئت کے متعلق جو کچھ قرآن میں بیان کیا گیا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔ جب تک یونانی زبان کے علوم عربی میں ترجمہ نہیں ہوئے تھے اس کی طرف مسلمانوں کو توجہ نہیں ہوئی اور اگر کچھ توجہ ہوئی تھی تو جو ہیئت یہودیوں کے نزدیک آسمان اور زمین کی تھی اسی کے مطابق لوگ آیات قرآنی سمجھتے رہے۔ بعد ازاں جب یونانی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں تو علمائے اسلام نے قرآن کی تفسیر میں یونانی علم ہیئت کی جو یہودیوں کی معلومات سے زائد تر متاثر نہ تھی اتباع کی۔ مثلاً قرآن میں سبع سماوات (سات آسمان) مذکور ہے اور یونانیوں نے آسمان نو قرار دیئے تھے علمائے اسلام نے "کرسیہا السموات والارض" اور "وہو رب العرش العظیم" پر لحاظ کر کے سات آسمان کے ساتھ کرسی اور عرش شامل کر دیئے اور اس طرح نو آسمانوں کو قرآن سے ثابت کر دیا اور قرآن کے اس معجزے کو کہ وہ ہر طبقہ کے انسان کا تشفی کرنے والا ہے سچا ثابت کر دکھایا۔ مرور زمانہ نے ادھر بہت سی تفسیریں قرآن کی پیدا کیں اور ہر ایک میں ہیئت یونانی کی تقلید کی گئی اور قرآن کو اس ہیئت سے الگ کر کے سمجھنا گویا جمہور مفسرین سے اختلاف کرنا سمجھا جاتا ہے۔ اب وقت یہ آپڑی کہ انیسویں صدی میں نظام شمسی کے ماننے والے اتنے بڑھے کہ ہیئت یونانی ایک دم سے باطل ہو گئی۔ اب اگر قرآن ہیئت یونانی کا تابع سمجھا جائے تو قرآن کا بھی بطلان لازم آتا ہے۔ ہم قرآن کے اس معجزے کو سچا سمجھتے ہیں کہ وہ ہر ایک شخص کی تسکین کرتا ہے اور اسلام کے اس دعوے کو بھی ہم سچا سمجھتے ہیں کہ وہ ہر حالت اور ہر موقع کے مناسب ہے اس لئے ہم کو جرات ہوئی اس امر کی طرف کہ اگر تحقیقات جدیدہ کو ہم باطل نہیں کر سکتے تو یہ ضرور ثابت کر سکیں گے کہ قرآن موجودہ علم ہیئت کے منافی نہیں ہے۔

ایک صورت یہ بھی ہے کہ ہم تحقیقات قدیمہ کو صحیح اور تحقیقات جدیدہ کو غلط کہیں اور اس لئے موجودہ تفاسیر سے ہم کو اختلاف نہ کرنا پڑے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تحقیقات جدیدہ میں بہت سی باتیں ایسی پائی گئی ہیں جو بدیہات میں داخل ہو جاتی ہیں۔ دوربین نے بہت سی چیزیں ہمیں آنکھوں سے دکھا دی ہیں۔ اگر ہم آگ کے روشن ہونے سے انکار نہیں کر سکتے تو تحقیقات جدیدہ کے صحیح ہونے سے بھی انکار نہیں کر سکتے مسلمانوں کا یہ کوشش

کرنا کہ تحقیقات جدیدہ غلط ہیں ان پر ایک دوسرا الزام جہالت کا عائد کرے گا - علوم کے تمام باریک مسائل کا لکھنا اس کتاب کے موضوع سے الگ ہو جاتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس طرح مضمون عام فہم نہ رہے - اس لئے چند موٹی موٹی باتیں ہم درج کرتے ہیں - جن کو تھوڑے سے علم ہیئت جاننے والے بھی سمجھ سکیں - اور جو حضرات اسقدر بھی نہیں سمجھ سکتے ان کے لئے موجودہ تفسیر قرآن کی کافی ہے - کیونکہ نہ ان کے دل میں کبھی خدشات پیدا ہوں گے اور نہ مخالفین ان سے کبھی مباحثہ کریں گے

۱:- یونانیوں نے صرف سات سیارے دریافت کئے تھے اور اس لئے ان کے لئے سات آسمانوں کی ضرورت تھی - اب دوربین سے زمین چھوڑ کر دس سیارے ثابت ہوئے ہیں - پہلے مسلمانوں نے سبعہ سماوات کا ترجمہ سات آسمان کیا - اب اس کا ترجمہ گیارہ سماوات ہونا چاہیئے لیکن ممکن ہے کہ کوئی اور تیز دربین نکلے اور چند سیارے اور نظر آئیں اس لئے سبعہ کے معنی متعدد ہوں تو اچھا ہے - ہم آگے دکھائیں گے کہ "سبعہ" کے معنی "متعدد" ہیں اور یہ معنی اس وقت کہے گئے تھے جب سات آسمانوں سے زیادہ دریافت نہیں ہوئے تھے -

۲:- آسمان کو پیاز کے چھلکے کی طرح تہ بہ تہ یونانیوں نے اجسام مانے ہیں اور مفسرین نے بھی اس کا تتبع کیا ہے - اب یہ وقت ہے کہ دوربین سے بعض سیاروں کے گرد قمر نظر آتے ہیں - مثلاً مشتری کے گرد چار قمر ہیں - اگر سیاروں کا مدار خلا میں یا کسی لطیف جسم میں نہ ہو اجسام ہیں ہو تو ان قمروں کی گردش متعذر ہو جائے یا یہ اجسام کو چکنا چور کر ڈالیں -

۳:- اگلے زمانے میں یونانی حکما دُمدار ستاروں کو سمجھتے تھے کہ آسمان اور زمین کے بیچ میں پیدا ہوتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں - اب دوربین سے معلوم ہوا کہ یہ مستقل ستارے ہیں اور تمام سیاروں کے اوپر نکل جاتے ہیں - یونانیوں نے جس طرح کا جسم آسمان کا مانا ہے وہی ہوتا تو وہ دُمدار ستاروں کو روکتا یا دمدار ستاروں کی وجہ سے تمام آسمان شیشہ کی طرح چکنا چور ہو جاتے

۴:- حکماء یونانی شمس کو زمین کے گرد گھومنے والا مانتے ہیں - لیکن اگر ان کے ساتھ دوربین ہوتی اور وہ زہرہ وغیرہ سیاروں کا بدر و ہلال ہونا دیکھتے تو سمجھتے کہ آفتاب کے گھومنے سے یہ بات پیدا نہیں ہو سکتی - بلکہ زمین مع تمام سیاروں کے آفتاب کے گرد گھومے جب ہی پیدا ہو سکتی ہے

۵:- دوربین سے کبھی عطارد و زہرہ آفتاب سے نیچے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی آفتاب کے اوپر اگر یونانیوں کی طرح فلک اول پر زہرہ - دوم پر عطارد - سوم پر شمس مانا جائے تو یہ صورت پیدا نہیں ہو سکتی یہ صورت جب ہی پیدا ہو سکتی ہے کہ شمس کے گرد عطارد - عطارد کے بعد زہرہ زہرہ کے بعد

زمین چکر لگاتے ہے۔

غرض کہ یونانیوں کا یہ قول کہ آسمان شیشہ کا سا ایک جسم ہے اور پیاز کے چھلکے کی طرح تہ بہ تہ جما ہوا ہے اور اس میں سیارے جن میں شمس بھی داخل ہے جڑے ہوئے ہیں۔ آسمان زمین کے گرد گھومتے ہیں اور ان کے ساتھ سیارے بھی گھومتے ہیں اتنا غلط ثابت ہوا کہ بدیہات میں داخل ہو گیا ہے۔ نظام بطلیموسی (یونانی) کے صحیح ماننے میں ایک یہ بھی برائی ہے کہ خدا کی قدرت محدود ہو جاتی ہے اور نظام شمسی ماننے میں خدا کی قدرت کاملہ جو مثل اس کے بے انتہا ہے۔ غیر محدود معلوم ہوتی ہے ہمارے اس مقولے کو وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے جو نظام شمسی کو پورے طور پر جانتا ہے۔

ہم اپنے مضمون کے سمجھانے میں اگر تمام آیتوں سے بحث کریں تو مضمون بے وجہ طول ہو جائیگا لیکن ان تمام اہم آیتوں سے ہم ضرور بحث کرنا چاہتے ہیں جنکے سمجھنے کے بعد پھر تمام قرآن کا نظام شمسی کے مخالف نہ ہونا بخوبی سمجھ میں آجائے گا۔

قرآن میں سماء کا لفظ عموماً بولا گیا ہے۔ سما کے معنی لغوی پہلے سمجھنا چاہیئے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ "السماء معروف" یعنی آسمان وہی ہے جسے سب جانتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ سب کیسے آسمان جانتے ہیں۔ ہندوستان میں جسے لوگ آسمان سمجھتے ہیں اسی کو عرب بھی جنکی زبان میں قرآن اترا تھا آسمان سمجھتے ہیں اور اسی کو تمام دنیا کے لوگ اپنے دل میں آسمان سمجھتے ہیں۔ یعنی زمین کے گرد نیلی یا سبز چیز جو چاروں طرف سے زمین کو گھیرے ہوئے ہے وہی سماء ہے اور یہ علم ہیئت کے آسمان سے الگ ہے۔ نظام بطلیموسی کی رو سے بھی یہ وہ شیشہ والا آسمان نہیں ہے جس میں کواکب جڑے ہوئے ہیں یا تیر رہے ہیں اور نہ نظام شمسی والا یہ خلائے محض ہے جس پر سیاروں کا مدار ہے بلکہ یہ ایک دوسری شے ہے۔ تمام حکماء قائل ہیں کہ زمین کے اوپر طبقہ ہوائی ہے۔ اس طبقہ ہوائی میں آفتاب کی کرنیں منعکس ہو کر یہ رنگ پیدا کرتی ہیں جو سب کو نظر آتا ہے۔ تو گویا یہ آسمان جو ہم کو دکھائی دیتا ہے اسی زمین کا ایک جزو ہے اور ممکن ہے کہ اور سیاروں میں بھی ایسے ہی آسمان ہوں۔ سورۂ حم میں اس آسمان کو "سماء دنیا" لکھا ہے۔ کتنا پر معنی لفظ ہے۔ غرض کہ اصلی معنی آسمان کے ہیں یہی نیلی چھت جو اوپر نظر آتی ہے۔ لیکن مجازاً اس کو ہر چیز پر بول سکتے ہیں جو اوپر ہے۔

اسی لحاظ سے سماء کا لفظ قرآن میں چار معنی میں بولا گیا ہے۔

۱:- کہیں اس نیلی چیز پر بولا گیا ہے جو دکھائی دیتی ہے۔

۲:- کبھی صرف فضائے محیط پر بولا گیا ہے۔

۳:- ابر اور بادل کے معنی میں بھی بولا گیا ہے۔

۴:- ستاروں کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔

قسم اول یعنی نیلی چھت کے معنی میں جہاں سما کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہاں زائد مخاطب کا لحاظ کیا گیا ہے۔ یعنی عرب کے لوگ اس نیلی چھت کو جس طرح کی سمجھتے تھے کہیں کہیں انھیں کے پندار کے موافق ان سے گفتگو کی گئی ہے۔ قرآن میں جہاں آیا ہے کہ آسمان کو دیکھو۔ وہاں اکثر آسمان سے نیلی چھت مراد ہے۔ کیونکہ وہی دیکھنے کی چیز ہے۔ ان تمام آیتوں کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے جس میں کسی قسم کی بحث پیدا نہیں ہوتی لیکن وہ آیتیں جن میں شبہات پیدا ہو سکتے ہیں ضرور قابل تذکرہ ہیں۔

"اگر ہم کھول دیں ان پر دروازے آسمان کے اور وہ ایسے ہو جائیں کہ وہ تمام دن اس میں چڑھتے رہیں جب بھی کہیں گے کہ ہماری ڈھیٹھ بندھی ہوئی ہے۔ یا ہم پر جادو ہوا ہے[1]"

اس میں جو لفظ دروازہ کا آیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آسمان میں دروازے ہیں بلکہ ایک غیر ممکن بات فرض کر کے کہی جاتی ہے کہ آسمان میں دروازے ہو جائیں اور کفار چڑھنے لگیں جب بھی وہ ایمان نہ لائیں گے اور کہیں گے کہ ہم پر جادو کیا گیا ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر ایسی ہی غیر ممکن بات کو مثالاً بیان کر کے اس معنی کی اور توضیح کی گئی ہے۔

"ہماری نشانیاں جنھوں نے جھٹلائیں اور اظہار تکبر کیا ان کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھلیں گے (یعنی ان کے حق میں خیر و برکت نہ ہوگی) اور نہ وہ بہشت میں جائیں گے۔ جب تک سوئی کے ناکے میں اونٹ نہ گھسے[2]"

یعنی اونٹ کا سوئی کے ناکے میں گھسنا جس طرح محال ہے اسی طرح ان کا بہشت میں جانا محال ہے۔ اسی طرح سورۂ اوّل کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ جس طرح آسمان میں دروازوں کا ہونا محال ہے اسی طرح یہ بھی محال ہے کہ جن کے لئے ایمان لانا بدا نہیں ہے وہ ایمان لائیں۔ اسی مقام

---

[1] ولو فتحنا علیهم باباً من السماء فظلوا فیه یعرجون لقالوا انما سكرت ابصارنا بل نحن قوم مسحورون

[2] ان الذین كذبوا بآیاتنا واستكبروا عنها لا تفتح لهم ابواب السماء ولا یدخلون الجنة حتی یلج الجمل فی سم الخیاط۔

پر تفسیر کبیر میں جو کچھ لکھا ہے اس کے ایک جزو کا ہم ترجمہ کرتے ہیں۔

"ماحصل یہ ہے کہ جب اہل عرب نے رسول اللہ پر ایمان لانا آسمان سے فرشتوں کے اترنے پر مشروط کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا کہ اگر بر تقدیر ایسا ہو جب بھی منکرین کہیں گے کہ یہ جادو ہے اور جو چیزیں ہم کو دکھائی دیتی ہیں فی الواقع ہم ان کو نہیں دیکھتے"۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ جب آسمان میں فرشتوں کے اترنے اور کافروں کے چڑھنے کے لئے دروازہ رکھا گیا ہے تو آسمان کو ٹھوس ہونا چاہیئے نہ کہ ہوائی۔ تو ہم کہیں گے کہ بیشک جن لوگوں سے گفتگو کی گئی تھی وہ آسمان کو ٹھوس ہی سمجھتے تھے اور انھیں کے خیال کے مطابق ان سے گفتگو کی گئی۔ اس سے یہ نہیں نکلتا کہ خدا نے اس نیلی چھت کو اینٹ پتھر شیشہ یا کسی اور ٹھوس چیز کی بنی ہوئی بتائی ہے۔ محض بندوں کے خیالی جسم پر بندوں کے محاورے کے موافق دروازہ کھولنے کا اطلاق ہوا ہے نہ کہ بطور اصل حقیقت کے۔

ایک جگہ ہے۔

"آسمان کو ہم نے محفوظ چھت بنائی"[1]۔

اور دوسری جگہ ہے:۔

"قسم ہے اونچی چھت کی"[2]۔

ان دونوں مقاموں پر سقف محفوظ (محفوظ چھت) اور سقف مرفوع (اونچی چھت) میں سقف (چھت) سے یہی نیلی چیز مراد ہے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ آسمان کو چھت اس لئے کہا کہ وہ زمین کے لئے ایسا ہی ہے جیسے کہ گھر کے لئے چھت۔ اس میں جو لفظ مرفوع آیا ہے۔ وہ بھی کچھ بے موقع نہیں ہے۔ بے شک یہ نیلی چھت مرفوع نظر آتی ہے۔ لیکن مرفوع ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ڈاٹ لگا کر گنبد بنایا گیا ہے۔

"کیا وہ اپنے آگے پیچھے آسمان و زمین نہیں دیکھتے۔ اگر ہم چاہیں تو ان کو زمین میں دھنسا دیں یا چاہیں تو ان پر آسمان سے کوئی ٹکڑا ڈالیں"[3]۔

---

[1] وجعلنا السماء سقفاً محفوظاً۔ الانبیا آیۃ ۳۲ [2] والسقف المرفوع۔ الطور آیۃ ۵۔

[3] افلم یروا الی ما بین ایدیھم۔ وما خلفھم من السماء والارض ان نشاء نخسف بھم الارض ونسقط علیھم کسفا من السماء۔ سبا آیۃ ۹۔

کفار کہا کرتے تھے کہ اگر ہم خدا کا کہنا نہیں مانتے تو خدا ہم پر آسمان کیوں نہیں گرا دیتا کہ ہم دب کر مرجائیں کفار اپنی پندار میں سمجھتے تھے کہ نیلی چھت ایسی ٹھوس ہے کہ اس کے گرنے سے لوگ دب جائیں گے۔ان کفار کے پندار کے موافق آیت اتری کہ زمین و آسمان سب ہی خدا کا بنایا ہوا ہے جیساکہ کفار دیکھتے ہیں۔پھر خدا کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ زمین میں کفار کو دھنسا دے یا آسمان کا ٹکڑا کفار پر گرا دے۔یہاں ٹکڑا زیر بحث نہیں ہے بلکہ خدا کی قدرت زیر بحث تھی۔مخاطب عرب تھے اس لئے انھیں کی سمجھ کے موافق اور انھیں کے محاورات کے مطابق ٹکڑے کا لفظ بولا گیا۔یہ معنی زیادہ تر صاف ہو جاتے ہیں۔دوسری آیت کے پڑھنے سے کافروں نے پیغمبرؐ سے کہا " تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا ٹکڑا گرا[1]" پھر اس کے جواب میں اگر کہا جائے کہ خدا ٹکڑا گرانے پر قادر ہے تو بلحاظ مخاطب کے خیال کے کیا بیجا ہوگا اور ممکن ہے کہ سمارسے بادل مراد ہو جیساکہ آگے بیان کیا جائے گا۔تو پھر مطلب اور بھی صاف ہو جاتا ہے کہ زمین اور بادل انسان کے لئے مفید ہیں مگر ان کو خدا اس طرح مضر کر سکتا ہے کہ زمین کو دھنسا دے اور بتدریج پانی برسنے کے عیوض ایک دم سے ابر کو گرا دے کہ شدت بارش باعث ہلاکت ہو۔اسی کے قریب قریب امام فخرالدین رازی لکھتے ہیں" خدا نے اس سے کافروں کی تہدید کی ہے کہ ہم چاہیں تو زمین کو دھنسا دیں یا آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔جو چیز تمہارے فائدہ کی ہے اسے مضر کر دیں دھنسا کر یا ٹکڑے ٹکڑے کر کے۔"

"جس دن ہم لپیٹ لیں گے آسمان جیسے لپٹتے ہیں طومار میں کاغذ[2]" آثار قیامت اور قدرت خدا کا ذکر ہے کہ جس طرح خدا نے آسمان پیدا کیا اسی طرح اس کو نیست بھی کر دیگا یعنی جس طرح پھیلایا اسی طرح سمیٹ بھی لے گا۔اس سے آسمان کا ٹھوس ہونا معلوم نہیں ہوتا۔بلکہ اس کی نفی ہوتی ہے۔اگر وہ ٹھوس ہوتا تو کاغذ کی طرح لپٹتا کیونکر۔لیکن واضح رہے کہ اس سے کاغذ کی طرح ہونا بھی نہیں پایا جاتا۔یہ بھی ایک طرز ہے بیان کا اس سے مقصود صرف معدوم کرنے کا بیان کرنا ہے۔جیساکہ مابعد عبارت سے ظاہر ہے" جیساکہ ہم نے پہلے پہل پیدا کیا تھا ویسا ہی پھر کریں گے" (کما بدانا اول خلق نعیدہ) اس کا مطلب یہ ہے

---

[1] فاسقط علینا کسفاً من السمار ان کنت من الصادقین۔الشعرار آیۃ ۱۸۷۔

[2] یوم نطوی السمار کطی السجل للکتب۔انبیار آیہ ۱۰۴۔

کہ زمین و آسمان کو نیست کر کے پھر ہم پیدا کریں گے۔ قرآن میں ایک دوسری جگہ پر ہے کہ:۔

"آسمان اللہ کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہیں" (والسموات مطویات بیمینہ)

صاحب کشف نے اس موقع پر لکھا ہے کہ "مٹھی سے ملک خدا مراد ہے اور دائیں ہاتھ سے اسکی قدرت مراد ہے اور اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹنے سے مراد ہے فنا ہونے والا"

عرب سمجھتے تھے کہ مثل زمین کے آسمان ایک ٹھوس چیز ہے اور وہ زمین کے اوپر اس طرح سے ہے جس طرح رکابی کے اوپر سرپوش رکھا جاتا ہے۔ خدا نے عربوں کی سمجھ کے مطابق اگر یہ کہا کہ یہ گنبد چرخ اتنا پرانا ہے۔ لیکن ہنوز قائم ہے زمین پر گرنے نہیں پاتا تو آخر کسی قوت نے اسکو سنبھال رکھا ہے اور وہی خدا ہے "وہی تھام رکھتا ہے آسمان کو زمین پر گرنے سے[1]" تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن میں یہ نیلا آسمان ٹھوس مانا گیا ہے اور اگر آسمان سے کواکب مراد لئے جائیں۔ جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا تو تاویل کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ عرب جیسے آسمان سمجھتے تھے اور جیسے وہ ٹھوس سمجھتے تھے اسی کا بیان ہے۔ اور انھیں کی سمجھ کے موافق الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

"جب آسمان پھٹے گا تو گلابی تیلیاں ہو جائے گا[2]" اسی طرح اور بھی چند آیتیں جن میں آسمان کا پھٹنا۔ چرنا۔ کھلنا۔ ٹکڑے ٹکڑے ہونا بیان کیا گیا ہے اور زیادہ تر آثار قیامت کے متعلق یہ بیانات ہیں۔ مقصود ان سب سے آسمان کا فنا ہونا ہے۔ عربوں کے خیال کے مطابق فنا ہونے کی صورت بیان کی گئی ہے تاکہ ان کو سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ سکھانا تھا اخلاق اور سکھایا جاتا علم ہیئت تو مطلب فوت ہوتا۔ اس لئے انکے پندار کے موافق الفاظ اختیار کئے گئے اسی مضمون کو شاہ ولی اللہ صاحب نے فوز الکبیر میں لکھا ہے "پس اگر برخلاف طور ایشان (عرب اول) گفتہ شود بحیرت درمانند وچیزے ناآشنا بگوش ایشان رسد وفہم ایشان رامشوش سازد" اب اگر یہ کہا جائے کہ قرآن تو صرف عربوں کے لئے نہ تھا۔ تمام جہان کے لئے تھا دوسرے کیونکر سمجھیں تو کہا جا سکتا ہے کہ اول مقصود عرب کو سمجھانا تھا اور اس لئے صرف عربی زبان میں قرآن اترا۔ دنیا کی سب زبانوں میں نہیں اترا۔ اور عربوں کے ذریعہ سے پھر تمام دنیا میں پھیلانا مقصود تھا اب جہاں قرآن جائے گا وہاں کے لوگ سمجھ جائیں گے کہ قرآن میں بہت سی باتیں مخاطب یعنی

---

[1] ویمسک السماء ان تقع علی الارض۔ النجم آیۃ ۶۴۔

[2] فاذا انشقت السماء فکانت وردۃ کالدہان۔ رحمٰن ۳۷۔

عربوں کے پندار کے موافق کہی گئی ہیں۔ اگر کسی کی متعدد بیویاں ہوں اور اس سے کہا جائے کہ تم بیویوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہو یہ عیب ہے تو جتنے سننے والے ہیں سبق حاصل کریں گے اور سمجھیں گے کہ بیوی کی بدسلوکی بری شے ہے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نصیحت صرف اس کے لئے تھی جبکی متعدد بیویاں ہوں میرے تو صرف ایک بیوی ہے میرے لئے بدسلوکی بری نہیں۔

قرآن کی سورہ نازعات ہیں "انتم اشد خلقاً ام السماء" تم خلقت میں زیادہ مضبوط ہو یا آسمان۔ مضبوط ہونے سے ٹھوس ہونا مراد نہیں ہے۔ بلکہ کمال قدرت کا اظہار مراد ہے۔ خدا کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی تمام سرسبزی آسمان سے متعلق ہے۔ دھوپ نہ ہو۔ مینھ نہ برسے تو دنیا کا خاتمہ ہو جائے اور یہ دونوں چیزیں آسمان سے آتی ہیں یعنی نیلی چھت کی طرف سے۔ تو جس خدا نے آسمان بنا ڈالا پھر اسے انسان کا بنانا اس کا مارنا اور پھر بنانا عذاب و ثواب دینے کے لئے کیا مشکل ہے۔

سورۂ بقر کی آیتہ ۲۰ ہے "الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناءً" اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو محل بنایا۔ آسمان بمقابلہ زمین کے ضرور محل کی صورت میں ہے۔ گنبد نیلگوں معلوم ہوتا ہے۔ آفتاب ماہتاب ستارے قندیلوں کی طرح لٹکے ہوئے ہیں محل سے یہ مراد لینا کہ وہ کسی سخت چیز سے ڈاٹ لگا کر جوڑا گیا ہے۔ اینٹ پتھر یا شیشہ کا بنا ہوا ہے قرآن کا مفہوم نہیں ہے۔

دوسرے معنی سماء کے فضائے محیط کے ہیں اور جو آیتیں اس قسم کی ہیں ان میں زائد بحثیں نہیں ہیں۔

فصلت ۱۱-۱۲ میں ہے "پیدا کیا بلندی کو اور وہ دھواں دھار یعنی تاریک تھی اور کہا اس کو اور زمین کو حکم مانو خوشی سے یا ناخوشی سے دونوں نے کہا ہم نے حکم مانا خوشی سے پھر کر دیئے سات یا متعدد آسمان دو دن میں اور ڈال دیا ہر آسمان میں ان کا کام[ل]"

دخان کا ترجمہ کسی نے کہر کیا ہے۔ کسی نے دھواں دھار کیا ہے اور کسی نے تاریک کیا ہے اور یہ سب معنی علمائے حال کے بھی خیالات کے موافق ہیں۔ فضائے محیط میں کواکب

[ل] ثم استویٰ الی السماء وہی دخان فقال لہا وللارض ائتیا طوعاً وکرہاً قالتا اتینا طائعین فقضاہن سبع سموات فی یومین واوحیٰ فی کل سماء امرہا۔

کی روشنی کے قبل تاریکی تھی۔ اس فضائے محیط میں سیارے گھومتے ہیں۔ ان کے گھومنے کی حدیں مقرر ہیں۔ ہر ایک حد کو ایک جداگانہ آسمان علمی قاعدہ سے کہہ سکتے ہیں۔ خدا نے کواکب بنا کر گردش دی اور ہر ایک کے مقام گردش کو ایک جدا آسمان قرار دیا۔ یہ علمائے حال کی رائیں ہیں اور قرآن اس کے خلاف معلوم نہیں ہوتا۔ فضائے محیط کا خلائے محض ہونا یا اجزائے لطیف سے پر ہونا علماء میں متنازعہ فیہ ہے۔ لیکن مذہب اسلام کو اس سے بحث نہیں ہے کہ وہ خلائے محض ہے یا وہاں کوئی شے ہے لیکن ایسی لطیف کہ گردش کواکب میں مزاحم نہیں ہوتی۔ ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ ایک ٹھوس جسم میں کواکب کا جڑا ہونا اور مع کواکب کے اس کا گھومنا جیسا کہ یونانی کہتے تھے اور جو اب تحقیقات جدید سے باطل ثابت ہوا ہے قرآن میں مذکور نہیں ہے اس آیت میں استویٰ کے معنی ہم نے لکھے ہیں پیدا کیا اور اکثر مفسرین یہی معنی لیتے ہیں۔ ایک اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے خلاء ایک شے معدوم ہے تو اس سے خدا نے خطاب کیونکر کیا۔ لیکن یہ محض لفظی تکرار ہے۔ جو شے مقام گردش کواکب ہے اسے معدوم کس طرح کہہ سکتے ہیں وہ ضرور موجود مانی جائے گی۔ چاہے وہ خالی ہو یا بھری ہوئی ہو۔ اس قسم کی آیات میں بروج کا لفظ بھی آیا ہے۔ مثلاً۔

"بڑی برکت ہے اسکی جس نے آسمان میں بروج بنائے اور اس میں چراغ اور چاند روشن کئے[1]"

بروج کے معنی بعضوں نے کوکب کہے ہیں اور بروج والے آسمان کو لکھا ہے کواکب والا آسمان۔ اور بعضوں نے بروج سے منازل قمر اور منازل سیارات مراد لئے ہیں۔ اسی کے قریب قریب معنوں میں بارہ برج اہل تنجیم میں مشہور ہیں۔ بروج سے منارے اور طاق کسی طرح مراد نہیں ہو سکتے۔ اس قسم کی آیات میں کہیں کہیں آسمان کے دروازے بھی مذکور ہوئے ہیں۔ مثلاً۔

"نہ کھلیں گے ان پر دروازے آسمان[2] کے"

یہاں دروازے سے مراد برکت آسمانی تفسیر کبیر میں لکھا ہوا ہے ان پر دروازے نہ کھلنے

---

[1] تبارک الذی جعل فی السماء بروجا وجعل فیھا سراجا وقمرا منیرا۔ الفرقان آیۃ ۶۲۔

[2] لا تفتح لھم ابواب السماء۔ اعراف ۳۸۔

کے یہ معنی ہیں کہ ان پر یعنی کافروں پر خیر و برکت نازل نہ ہوگی۔"

تیسرے قسم کی وہ آیتیں ہیں جن میں آسمان ابر کے معنی میں بولا گیا ہے۔ مثلاً

"بھیجا ہم نے بادل کو دھڑلے سے برستا ہوا[۱]۔"

اس قسم کی آیتوں میں کوئی آیت قابل بحث نہیں ہے۔ صرف ایک جگہ "والسماء ذات الرجع" ہے جس کا ترجمہ آسمان صاحب رجعت کر کے شاید آسمان کے گھومنے کا خیال بعضوں نے پیدا کیا ہے اور یونانیوں کا آسمان سمجھا ہے۔ لیکن اس بارے میں مفسرین بہت صاف ہیں۔ تفسیر کبیر میں رجع کے معنی مینھ کے ہیں اور اس لئے عبارت مذکورہ بالا کا ترجمہ یہ ہوگا "مینھ والا بادل" علاوہ اس کے اور کئی معنی مفسروں نے لکھے ہیں لیکن یونانیوں کا آسمان کسی معنی سے ثابت نہیں ہوتا۔

چوتھی قسم کی وہ آیتیں ہیں۔ جن میں سماء کی جمع سماوات مستعمل ہوئی ہے اس کے معنی کواکب کے ہیں۔ عرب کے محاورے میں ظرف سے مظروف مراد لینا بہت عام ہے۔ فضائے محیط میں کواکب پھرتے ہیں اس لئے فضائے محیط آسمان یا سماء بول کر اس سے کواکب مراد لئے جا سکتے ہیں۔ ان آیتوں سے ہم کو یہ دکھانا ہے کہ قرینہ بھی ایسے ہی امکان کا مقتضی ہے۔

سورۂ ملک آیۃ ۳ میں ہے "الذی خلق سبع سموات طباقاً" ترجمہ:- جس نے پیدا کیا سات یا متعدد آسمانوں کو یا کوکب کو تلے اوپر" اس میں ہر ایک لفظ بحث طلب ہے۔ آسمانوں سے مراد کیا ہے۔ سات سے مراد کیا ہے اور تلے اوپر سے کیا مراد ہے۔ پہلے ہم یہ طے کرنا چاہتے ہیں کہ آسمانوں سے کواکب مراد ہیں کیونکہ اس کے بعد کی آیتیں اسی معنی کی موید ہیں۔ اس کے بعد مذکور ہے۔

"خدا پیدا کرنے میں تو تفاوت نہیں دیکھے گا[۲]۔"

پھر خدا کہتا ہے:-

"پھیرا اپنی نگاہیں کہیں کچھ خرابی تجھے دکھائی دیتی ہے[۳]۔"

---

[۱] وارسلنا السماء علیہم مدراراً۔ انعام ۶-

[۲] ماتری فی خلق الرحمٰن من تفاوت۔

[۳] فارجع البصر ہل تری من فطور۔

پھر خدا کہتا ہے۔

"پھر پھیر اپنی نگاہ دوبارہ تیری نگاہ عاجز ہو کر اور تھک کر الٹ آئے گی[1]"

ان آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ جن آسمانوں کا ذکر خدا نے پہلی آیت میں کیا ہے وہ انسان کے دیکھنے کی چیز ہے اور انسان کو صرف کواکب نظر آتے ہیں اور کواکب کے گھومنے کی جگہیں وہ شیشہ کی سی ہوں یا ہوا اور پانی کی سی ہوں یا خلائے محض ہوں کسی حالت میں انسان کے دیکھنے کی چیزیں نہیں۔ اس آیت میں تلے اوپر کا لفظ بھی زیر بحث ہے لبعض اس کے معنی یونانی آسمان کی رعایت سے پیاز کے چھلکے کی طرح تہہ بہ تہہ سمجھتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ طباقاً یعنی اوپر تلے سے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ چمٹے ہوئے ہوں بلکہ یہ مطلب ہے کہ باہم متوازی ہوں۔ یعنی حالت حرکت میں ایک دوسرے سے ٹکرانہ جائیں۔ اب لفظ "سات" کا رہا۔ دیکھنے میں صرف سات ہی سیارے نظر آتے ہیں اور یہی زیادہ اہم بھی ہیں۔ اس لئے انھیں سات کا ذکر کیا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سات سے زائد نہیں ہیں۔ اور محاورہ کے مطابق لفظ سبعہ جسکا ترجمہ سات ہے بمعنی متعدد بھی آتا ہے اگر اس آیت میں یہی ترجمہ اختیار کیا جائے تو پھر کوئی بحث پیدا نہیں ہوتی۔

سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۰۱ میں ہے۔

"کیا نہیں دیکھا تم نے کہ جس اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ طاقت رکھتا ہے کہ ایسے ہی اور پیدا کرے[2]"

اور دوسری جگہ سورۂ لقمان آیت ۹ میں ہے۔

پیدا کیا اللہ نے آسمانوں کو بغیر ستون کے کہ تم دیکھو ان کو[3]"

ان میں تو صریح دیکھنے کا لفظ آسمانوں کے ساتھ ہے اور سوائے کواکب کے جو دکھائی دیتے ہیں دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے اور اگر یہ کہا جائے کہ نیلی چھت جو دکھائی دیتی ہے اس کی طرف اشارہ ہے جب بھی ہمارا مقصد حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ مقصود

---

[1] ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئاً وھو حسیر۔

[2] اولم یروا ان اللہ الذی خلق السموات والارض قادر علی ان یخلق مثلھم۔

[3] خلق السموات بغیر عمد ترونھا۔

تو ہمارا صرف یہ ہے کہ یونانیوں کا آسمان خواہ مخواہ قرآن سے ثابت نہیں ہوتا۔

سورہ نوح آیت ۱۵-۱۶ میں تو گویا صاف طور پر آسمان کے معنی کواکب کے بتائے گئے۔

خدا کہتا ہے کہ :-

"تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے سات یا متعدد آسمانوں کو کس طرح تلے اوپر پیدا کیا ہے اور ان میں سے چاند کو نور اور سورج کو چراغ روشن بنایا ہے[1]"

"ان میں سے" صریح ظاہر ہے کہ چاند اور سورج بھی سموات میں داخل ہیں جس طرح دوسرے مقام پر خدا حضرت ابراہیم کی دعا کا ذکر کرتا ہے۔

"اے ہمارے پروردگار اٹھا ان میں ایک رسول انھیں میں سے[2]"

یعنی ان ہی کی قوم میں سے ایک کو رسول بنا۔

واضح رہے کہ کہیں کہیں قرآن میں سموات صیغۂ جمع کو مفرد کے معنی میں بھی بولتے ہیں اخفش کا قول ہے کہ سموات جنس ہے اور بمعنی مفرد بھی مستعمل ہوتا ہے۔ آیہ کریمہ "اولم یرالذی کفروان السموات والارض کانتا رتقا ففتقنھما" انبیاء آیۃ ۳۰۔ کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب نے یوں کیا ہے

"آیا ندیدند کافران کہ آسمانہا و زمین بستہ بودند پس واکردیم اینہارا"

اور حاشیہ پر لکھا ہے۔

"واکردن آسمانہا نازل کردن مطر است و واکردن زمین رویانیدن گیاہ ازدے"

اور شاہ عبدالقادر نے اس کا ترجمہ یہ لکھا ہے۔

"کیا نہیں دیکھا ان منکروں نے کہ آسمان و زمین منہ بند تھے۔ پھر ہم نے ان کو کھولا"

اور حاشیہ پر لکھا ہے :-

"منہ بند تھے یعنی ایک چیز تھی۔ زمین سے کانیں اور نہریں اور سبزے بھانت بھانت نکلے آسمان سے کئی ستارے ہر ایک کا گھر جدا اور چال جدی"

---

[1] الم ترکیف خلق اللہ سبع سموات طباقا وجعل القمر فیھن نورا وجعل الشمس سراجا۔

[2] ربنا وابعث فیھم رسولا منھم۔

اس سے ظاہر ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے آسمانوں کو بہ صیغۂ واحد لیا اور اس کے معنی مینہ کے قرار دیئے اور مولوی عبدالقادر نے جمع کے معنی میں رکھے اور ان سے ستارے مراد لئے۔ جمع کے معنی لینے میں بھی بادل کے معنی پیدا ہو سکتے ہیں کیونکہ بادل مختلف اقسام کے ہوتے ہیں اور ان کے ٹکڑے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ بہر حال ابر کے معنی زیادہ چسپاں ہیں کہ زمین کی روئیدگی اور آسمان کی بارش کا ساتھ ہے اور اسی پر دنیا کے تمام کارخانے مبنی ہیں خدا انھیں کو دکھا کر اپنی قدرت یاد دلاتا ہے۔ اس آیۃ میں بند رہنے اور کھولنے یعنی رتق و فتق کا جو لفظ آیا ہے اس سے آسمان کا ٹھوس ہونا کسی طرح ضروری نہیں معلوم ہوتا۔

فصل نمبر ۵۱

سحر (جادو)

ایک یورپین جج کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا جس میں ایک رزیل قوم کے دو شخص باہم لڑتے تھے۔ ایک کو دوسرے سے یہ شکایت تھی کہ اس نے اپنے گھر کا بھوت اس کے یہاں بھیج دیا ہے۔ جج نے پوچھا کہ بھوت کس ذریعہ سے گیا ہے۔ کہا گیا کہ ارد کے دانے پر جادو کے ذریعے سے بھوت مسلط کیا گیا اور وہ دانہ بھیجا گیا۔ ارد کا دانہ بھی پیش کیا گیا تھا۔ جج وہ دانہ منہ میں رکھ کر نگل گیا اور کہنے لگا تم لوگ جاؤ۔ بھوت کو ہم نگل گئے۔ پھر دونوں مخاصمین مطمئن ہو کر چلے گئے۔

یہ حکایت ہم نے اپنے ایک بوڑھے دوست سے سنی اور سننے کے بعد صرف اتنی ترمیم ذہن میں آئی کہ جج نے وہ دانہ فی الواقع کھایا نہ ہوگا۔ مخاصمین کو اپنا نگل جانا باور کرا دیا ہوگا اور نظر بچا کر دانہ کو پھینک دیا ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی معاً یہ خیال گزرا کہ کیا ایسے اوہام باطل مسلمانوں کے یہاں مانے جا سکتے ہیں؟ ایک طرف تو یہ خیال تھا کہ جو قوم اعلیٰ درجہ کی تہذیب کے ساتھ تمام عالم پر صدیوں تک حکمران رہ چکی ہے اس کے خیالات ایسے بودے ہرگز نہ ہوں گے۔ اور دوسری طرف یہ خیال کہ مسلمانوں میں جادو کا برحق ہونا مشہور ہے اور قرآن میں بھی سحر کا لفظ جا بجا آیا ہے یہ کیا راز ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال گزرا کہ اگر خدا نے جادوگروں کو سب کچھ قدرت دے دی ہے تو پھر وہ قادر مطلق کہاں رہا۔ ان خیالات

نے مجھے تحقیق حق کی طرف مائل کیا اور بعد تحقیق کے جو کچھ میری سمجھ میں آیا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے سحر کے معنی کی میں نے تحقیق کی۔ عام طور پر جو کچھ اس کا مفہوم عوام میں سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اس پر غور کیا اور اس کے علاوہ جتنی صورتیں قیاسات سے پیدا ہوسکتی ہیں سب پر نظر کی تو آٹھ صورتوں سے زیادہ پیدا نہیں ہوتیں ان میں سے بعض کا مانا جانا کچھ مضائقہ نہیں رکھتا اور بعض کا ماننا دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کا حکم رکھتا ہے۔

اول خود قوت نفس انسانی کبھی کبھی عجائبات دکھاتی ہے اور لوگ اسے جادو سمجھتے ہیں۔!

نفس انسانی کی قوت کو مشق اور مجاہدات سے بڑھا لینا ہر مذہب اور ہر قوم میں پایا جاتا ہے۔ اس قوت کے ذریعہ سے ایک شخص دوسرے پر اپنا اثر ڈال سکتا ہے اور دوسرے کے واہمہ کی مغلوبی اس اثر کو اس طرح قبول کرتی ہے کہ غیر موجودہ شے اسے موجود معلوم ہوتی ہے اس قسم کے اثر سے صحیح آدمی بیمار ہو جاتا ہے اور بیمار آدمی صحیح ہو جاتا ہے خواب مقناطیسی جس کو مسمریزم کہتے ہیں اور آجکل بہت دکھایا جاتا ہے اس کی شاخ ہے حکمائے یونان کا علم اشراق بھی اسی قبیل سے تھا۔

دوم۔ حس یا نظر کی غلطی عجائبات روزگار سامنے پیش کی جاتی ہے۔

اس قسم کی غلطیاں بہت ہو جاتی ہیں۔ رات کو ایک چیز دیو نظر آئی۔ آنکھ کان اور ناک دکھائی دیئے بڑے بڑے دانت کھولے ہوئے وہ شے ہم پر جھپٹی اور ہم سہم گئے۔ لیکن جب قریب سے ٹٹولا تو دو ہاتھ کی لکڑی کونے میں کھڑی ہوئی نظر آئی۔ کبھی کبھی دن کو بھی ایک چیز ہمارے واہمہ میں گزری لیکن فی الواقع وہ کوئی شے نہ تھی ہماری نظر کی غلطی تھی۔ علم مناظر میں آنکھ کا غلطی کرنا بہت اچھی طرح سے عالموں نے بیان کیا ہے اسی نظر کی غلطی سے فائدہ اٹھانے کے لئے بھانمتی کا تماشا کرنے والے گولیاں اڑاتے ہیں کوئی سے ایک بٹہ میں رکھی اور دوسرے بٹے سے نکال دی اور جب کبھی وہ قوت نفس بھی صرف کر سکے اور اس دوسری قسم کے ساتھ پہلی قسم بھی مل گئی تو نہایت کامیابی سے ان کا تماشا ہوتا ہے۔

سوم۔ علم وفن کی کاریگریاں بھی ناواقفوں کے لئے جادو ہوتی ہیں۔

علم وفن کے ذریعہ سے ہر قرن میں کچھ نہ کچھ باتیں ایجاد ہوئی ہیں اور ہر ایک ایجاد ناواقفوں

کے لئے شروع شروع جادو ضرور تھی۔ جن لوگوں نے یورپ کی صناعیاں نہیں دیکھیں اگر جنوبی امریکہ یا وسط افریقہ سے لاکر لندن کے بازار میں کھڑے کر دیئے جائیں تو گھڑی کا بجنا۔ خود بخود برقی روشنی کا ہو جانا۔ دیا سلائی سے سگرٹ جلانا۔ بائیسکل پر لوگوں کا بھاگتے ہوئے چلے جانا۔ بھاپ سے زمین کے اندر ہی اندر ریل کا دوڑنا یہ سب باتیں ان کے نزدیک اسی طرح جادو سمجھی جائیں گی جس طرح رابنسن کروسو کا بندوق سے شکار کرنا فرائیڈے نے جادو سے مارنا سمجھا تھا۔ آجکل یورپ میں لڑکوں کے کھلونے اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ وحشی انسانوں میں اچانک رکھ دیئے جائیں تو وہ ان کو جادو کا پتلا سمجھیں گے۔

چہارم۔ خاصیت اشیاء کی ناواقفیت سے بھی بہت سی چیزیں جادو معلوم ہوتی ہیں۔

خاصیت اشیاء جاننے سے بھی بہت سے عجائبات معلوم ہوتے ہیں اور یہ ایک طور پر چوتھی قسم میں بھی داخل ہو سکتا ہے کیونکہ خاصیت اشیاء کا جاننا علم پر موقوف ہے مثلاً اگر دو قسم کی ہوائیں، الگ الگ بوتلوں میں بھر کر ان بوتلوں کے منہ ملا دیئے جائیں تو اس زمانے کے بڑے بڑے ہوشیار شخص جو کیمسٹری نہیں جانتے ان بوتلوں سے پانی گرنے کو جادو سمجھیں گے۔

پنجم زبان میں بھی جادو ہے۔

جھوٹ سچ ادھر کی ادھر لگا دی۔ دو شخصوں میں لڑائی ہونے لگی۔ جن کو اس میں مشاقی ہے ان کے نزدیک زن و شو میں لڑائی کرا دینا۔ بھائیوں میں نفاق ڈال دینا باپ بیٹوں میں دشمنی کرا دینا کوئی بات نہیں ہے۔

ششم۔ ستاروں کی تسخیر کا عمل جاننا۔

بعضوں کا خیال ہے کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں وہ ستاروں کے اثر سے قائم ہیں ان میں سے کوئی ستاروں کو واجب الوجود جانتا ہے اور کوئی زمین اور واجب الوجود کے درمیان میں ستاروں کو واسطہ سمجھتا ہے اور کسی کا یہ خیال ہے کہ مثل انسان کے افلاک بھی خود مختار جاندار ہیں اور دنیا پر ان کو پورا قابو ہے ان تینوں قسم کے عقیدے والے کواکب کی تسخیر کے عمل پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں اور وہ نہیں تو ان کے معتقدین ضرور سمجھتے ہیں کہ جب انھوں نے کسی طرف اشارہ کر کے مثلاً "اقتل یا مریخ" کہا تو مریخ اسے ضرور قتل کر ڈالے گا۔

ہفتم ارواح کا قابو میں رکھنا۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دنیا میں اچھی اور بری روحیں پھرا کرتی ہیں اور کبھی کبھی

مرے ہوئے انسانوں کی روحیں بھی ان میں شامل ہو جاتی ہیں۔ جن، پری، بھوت، چڑیل، پریت سب ان میں شامل ہیں۔ اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ان روحوں کو مختلف اشکال کے قبول کرنے کی قوت ہے اور ان روحوں کو پڑھنت کے ذریعہ سے قابو میں کر لینا ایک قسم کی جادوگری ہے۔ مشہور ہے کہ ان روحوں کو علوی یا سفلی عملوں کے ذریعہ تابع کرنے والے ان سے اپنی مرضی کے موافق اچھے برے کام لے سکتے ہیں۔

ہشتم۔ تاثیر اسمار۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسمار پر موکل مقرر ہیں۔ اسمار کا عمل جاننے والے موکلوں پر قابو پا لیتے ہیں اور پھر تمام مشکل باتیں ان کے لئے آسان ہو جاتی ہیں۔ اسمار کچھ اچھے ہیں اور کچھ برے ہیں اور ان کے جاننے والے بھی علوی یا سفلی عاملوں کی طرح گروہوں پر منقسم ہیں یہ آٹھ قسمیں جادو کی ہوئیں۔ ان میں سے اول پانچ کے برحق ہونے کا عقیدہ ہر سمجھدار آدمی کو رکھنا چاہیئے۔ باقی رہیں تین قسمیں یعنی کواکب، ارواح یا اسمار کی تسخیر سے عجائبات کا کرشمہ دکھانا یہ کسی ذی علم اور مہذب قوم کے نزدیک کبھی صحیح نہیں سمجھا گیا اور نہ اب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے تذکرے تمام دنیا میں ہیں۔ ہر قوم میں زمانہ نامعلوم سے اس کا چرچا چلا آتا ہے اور اب بھی اس کا وجود ہے لیکن ہمیشہ جہلا میں یہ باتیں زیادہ تر مقبول ہوئی ہیں۔ اور قوم مغلوب میں زیادہ تر اس کا چرچا سنا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں بھی مثل دیگر اقوام کے اب اس کا چرچا ہے۔ لیکن ابتدائے اسلام میں ہرگز یہ اعتقادات مسلمانوں میں نہ تھے اور نہ زمانہ مابعد کے مستند علما کی کتابوں میں کہیں اس کا پتہ چلتا ہے۔

اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ قرآن میں ان تینوں اقسام کے جادو کی نسبت کیا ہے۔ تمام قرآن کی آیتوں پر بہ غور نظر ڈالنے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں اگر کوئی جادو صحیح مانا گیا ہے تو وہ پہلی قسم کے جادو سے تعلق رکھتا ہے اور اس لئے قرآن کی آیتوں سے بحث کرنے سے قبل پہلے قسم کے جادو کی مزید توضیح ضروری ہے۔

نفس انسانی میں ایک ایسی قوت برقی اور مقناطیسی موجود ہے جو خود اس پر اور اسکے خیال پر اور نیز دوسروں کے خیال پر اثر کرتی ہے۔ یہ اثر بہت معمولی ہے۔ کسی کو رنج پہنچا وہ پژمردہ ہو گیا۔ بیمار ہو گیا یا مر گیا یا کوئی خوش ہوا امر واقعی کی وجہ سے ہو یا غیر واقعی کی وجہ سے ہو تو فوراً بشاش ہو گیا اور بدن میں توانائی آ گئی۔ یہ قوت نفس ہی کا اثر ہے کہ خود اپنا اثر اپنے

اپنے اوپر پڑتا ہے اور جاگنے ہی میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ سونے میں اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے جب نیند نے قوائے جسمانی کو کمزور کیا تو قوت نفس کا اثر اور زیادہ ہو گیا اچھے اور برے خواب نظر آنے لگے۔ اچھے خواب سے آدمی خوش ہوتا ہے اور برے خواب سے رنجیدہ ہوتا ہے۔ خواب میں آدمی عجائبات کی سیر کرتا ہے۔ روتا ہے۔ ہنستا ہے کبھی کبھی خواب میں سمجھتا ہے کہ اس پر برسیں گزر گئیں اور حالانکہ وہ گھنٹہ بھر بھی نہیں سویا۔ خواب میں سفر کرتا ہے لڑائی لڑتا ہے۔ پانی میں تیرتا ہے چارپائی پر پڑا ہوا منہ سے چادر لپیٹے ہوئے یہ سب کچھ کرآتا ہے۔ یہ سب نتیجہ ہے اس کا کہ قوت نفس خود اپنے آپ پر اثر ڈالتی ہے اور اسی وجہ سے کبھی کبھی انسان سچے خواب بھی دیکھتا ہے اور خود میں جتنی ہی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے اتنے ہی زیادہ سچے خواب نظر آتے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک کی قوت نفس کا دوسرے پر اثر پڑتا ہے۔ ایسا بھی بہت ہوتا ہے۔ کسی کو تیور بدل کر دیکھو تو وہ رنجیدہ ہو جائے گا۔ ادب سے اس کے سامنے کھڑے ہو کر اظہار تعظیم کرو تو وہ خوش ہو جائے گا کسی کی طرف لکڑی اٹھا کر دوڑو تو وہ ڈر کر بھاگ جائے گا یا غصہ سے اس کا منہ سرخ ہو جائے گا۔ چمکارنے سے بچے خوش ہو کر دوڑے ہوئے چلے آتے ہیں۔ ڈانٹنے سے بھاگ جاتے ہیں حتیٰ کہ جانوروں پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے کوئی اپنے کتے کے سامنے سیٹی بجائے تو کتا دم اٹھا کر کودنے لگتا ہے یہ سب مثالیں ہیں ایک قوت نفس کی دوسرے پر اثر کرنے کی۔

علاوہ ان معمولی باتوں کے چند غیر معمولی صورتیں بھی قوت نفس کی ہیں جب کسی میں قوت نفس خلقتاً زیادہ مخلوق ہوتی ہے یا مجاہدات اور ریاضت سے بڑھ جاتی ہے تو غیر معمولی باتیں اس سے ظہور میں آتی ہیں اور لوگوں کو تعجب میں ڈالتی ہیں۔ مشہور ہے کہ یونان کے اشراقین ایک جگہ بیٹھے ہوئے دور دور کا حال معلوم کر لیتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو اور خود انکی قوت نفس ان پر اثر ڈالتی ہو۔ صوفیان کرام کا مراقبہ بھی اس کے قریب قریب ہوتا ہے ممکن کا لفظ ہم اس لئے کہتے ہیں کہ نہ ہمیں یہ کمال ہے اور نہ قرآن میں اس کے باور کرنے کی ہدایت ہوئی ہے۔ لیکن بار بار ایسا سنا جاتا ہے اور عقل کے خلاف معلوم نہیں ہوتا . . . . آج کل مسمریزم کا چرچا بہت ہے معمول پر اپنی قوت نفس کا اثر عامل ڈال دیتا ہے اور معمول تمام باتیں جو عامل چاہتا ہے بولتا چلا جاتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو عامل کہتا ہے وہی

معمول کو نظر آتا ہے۔ خود اپنے آپ پر اپنی قوت نفس کا اثر ہونا حالت شوق یا خوف میں بارہا دیکھا گیا ہے جب کسی شے کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں تو بارہا اس شے کی صورت سامنے آجاتی ہے اور پھر غائب ہوجاتی ہے۔ عید کا چاند دیکھنے والوں کو اس کا تجربہ بہت دفعہ ہوچکا ہوگا۔ رات کو اور کبھی کبھی دن کو بھی اس جگہ پر جو ارواح خبیثہ کا مسکن سمجھا جاتا ہے ڈراونی صورتیں ضعیف الاعتقادوں کے سامنے آکھڑی ہوتی ہیں جن کو وہ بھوت پریت سمجھتے ہیں۔ لیکن علمار کے نزدیک وہ نظر کے دھوکے سے زیادہ اور کوئی شے نہیں ہے اور نظر کا دھوکہ ان حالتوں میں ایک شاخ ہے خود اپنے آپ پر قوت نفس کا اثر ہونے کی۔

قرآن میں دو مقام پر سحر کا ذکر آیا ہے ایک تو وہاں جہاں فرعون کے ساحروں سے حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ ہوا۔ اور دوسری جگہ ہاروت وماروت کے سحر کا ذکر ہے اور تیسرا موقع یہ ہے کہ کفار جب پیغمبروں سے کوئی بات عجیب دیکھتے تھے تو پیغمبروں کو کہا کرتے تھے کہ یہ ساحر ہیں۔ یہ تیسری صورت بہت صاف ہے۔ پیغمبروں کو کفار ساحر اور مسحور کہتے تھے۔ مسلمان ایسا نہیں کہتے تھے اور نہ خدا کہتا ہے۔ ساحر سے کفار مراد لیتے تھے نظر بند کرنے والے جس طرح یہاں مداری تماشا کرتے ہیں اور ایک شے کی گولی دوسرے میں دکھاتے ہیں عوام میں انکی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ محض وہ تماشہ گر سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح مصر اور شام میں بہت سے لوگ پہلے سے تھے۔ پیغمبر کی عمدہ باتوں کے سمجھنے کی تو کفار میں شروع شروع قابلیت نہیں ہوتی تھی یا ہوتی تھی تو وہ دھیان نہیں کرتے تھے اور جب کبھی کوئی عجیب بات دیکھنے میں آتی تو کہتے تھے کہ یہ جادوگر ہے۔ مثلاً سورۂ اسرا میں ہے: "کافر آپس میں کہتے ہیں کہ تم محمد کی پیروی کرتے ہو جو جادو کیا ہوا آدمی ہے۔" اور دوسری جگہ اسی سورہ میں ہے: "فرعون نے موسیٰ سے کہا کہ موسیٰ میں پوچھتا ہوں کہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے۔"

زیادہ وضاحت کے لئے قصص قرآنی فصل ۵۳ پڑھیئے۔

اب حضرت موسیٰ اور فرعون کے معرکوں میں جو لفظ سحر (جادو) کا استعمال کیا گیا ہے اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ فرعون کے ساحروں سے حضرت موسیٰ کا مقابلہ کئی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ سورہ طٰہٰ میں بیان ہے کہ حضرت موسیٰ جب آگ کے پاس گئے تو وہ پکارے گئے اور ایک خدائے واحد کی عبادت کا ان کو حکم ملا اور وحی سے القا ہوا کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے۔ موسیٰ نے کہا کہ میری لاٹھی ہے جسکو ٹیک لیتا ہوں اور بھیڑوں کو بھی اس سے ہنکاتا ہوں اور دوسرے کاموں میں بھی لاتا ہوں۔ پھر وحی سے القا ہوا کہ موسیٰ اس کو پھینک دے۔ پھر موسیٰ نے اسے

پھینک دیا تو وہ دفعتاً چلتا ہوا سانپ تھا پھر وحی سے القا ہوا اسے پکڑ لے نہ ڈر ہم پھر اسے پہلے ہی سا کر دیں گے۔

سورۂ نمل میں مذکور ہے کہ جب موسیٰ آگ کے پاس پہنچے تو ان سے کہا گیا کہ جو کچھ آگ میں اور آگ کے گرد ہے ہم نے اس کو برکت دی ہے۔ اللہ پاک تمام عالموں کا پروردگار ہے اے موسیٰ بے شک میں خدا ہوں سب پر غالب حکمت والا اس کے بعد وحی سے موسیٰ کو القا ہوا کہ اپنی لاٹھی پھینک دے۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ وہ سانپ کی طرح ہلتی ہے تو پیٹھ پھیر کر پیچھے پلٹے اور پھر پلٹ کر رخ نہ کیا۔ القا ہوا۔ موسیٰ نہ ڈر میرے پاس پیغمبر نہیں ڈرتے۔

ان آیتوں پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ لاٹھی سانپ نہیں ہو گئی تھی۔ بلکہ وہ سانپ دکھائی دی تھی۔ ان آیات میں "پھر پہلے سا کر دیں گے" (سعید ہا سیرتہا الاولی) اور "سانپ کی طرح سے" (کانہا جان) ظاہر کرتا ہے کہ لکڑی کی ماہیت نہیں بدلی تھی بلکہ لکڑی اپنی اصلی حالت پر تھی اور اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ حضرت موسیٰ پر جو کیفیت طاری ہوئی وہ اسی قوت نفس انسانی کا ظہور تھا جس کا اثر خود انپر ہوا۔

اس کے بعد کے حالات میں دکھایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کی قوت نفس کا اثر دوسروں پر پڑا حضرت موسیٰ اپنی لاٹھی لئے ہوئے فرعون کے پاس آئے اور فرعون کو حضرت موسیٰ کی لاٹھی، سانپ معلوم ہوئی۔ لیکن فرعون کے دل میں کچھ عظمت حضرت موسیٰ کی قائم نہیں ہوئی وہ حضرت موسیٰ کو ساحر سمجھا اور دوسرے ساحروں کو جن کو ہم اپنے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ ڈھٹ بند تھے اس نے طلب کیا۔ ان ساحروں نے جب اپنی قوت نفس کا اثر ڈالا تو انکی لاٹھیاں اور رسیاں سب کو سانپ نظر آئیں۔ پھر حضرت موسیٰ نے جو اپنی لاٹھی ڈالی تو لوگوں کو ایسا معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ کی لاٹھی اژدھا بن کر ان سانپوں کو کھا گئی اس پر بھی فرعون ایمان نہ لایا بلکہ اس نے حضرت موسیٰ کو تمام جادوگروں کا استاد یعنی ایک بڑا جادوگر قرار دیا۔ قرآن میں جا بجا ان واقعات کے بیان کرنے کا صرف یہ مطلب ہے کہ لوگ معجزات کی فرمائش آنحضرتؐ سے نہ کریں بلکہ آنحضرت کے اقوال اور افعال کی خوبیاں سمجھ کر ایمان لائیں۔ لوگ آنحضرتؐ سے معجزات کی فرمائش کرتے تھے اس کے جواب میں یہ ارشاد ہوتا تھا کہ گذشتہ پیغمبروں کے معجزے دیکھ کر کب انکی امتیں ان کو رسول خدا سمجھی تھیں کہ آنحضرت محمدؐ انکی تقلید کریں۔

حضرت موسیٰ اور ساحران فرعون کا ذکر سورۂ یونس میں ہے۔

"جب فرعون کے ساحر آگئے تو حضرت موسیٰ نے ان سے کہا کہ ڈالو تم کیا ڈالتے ہو تب انھوں نے ڈال دیا۔ تب موسیٰ نے کہا جو کچھ تم نے کیا جادو ہے اللہ ابھی اس کو جھوٹ کر دے گا اللہ مفسدوں کا کام درست نہیں رکھتا[1]"

پھر سورہ شعرا میں مذکور ہے۔

"موسیٰ نے فرعون کے ساحروں سے کہا کہ ڈالو تم کیا ڈالتے ہو پھر انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈال دیں اور پکار اٹھے کہ فرعون کی جے ہم ہی موسیٰ پر غالب ہوں گے پھر حضرت موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈالی تو وہ یکایک ان سب کو نگلنے لگی جن کو فرعون کے ساحروں نے دھوکا بنایا تھا[2]"

سورۂ اعراف میں یوں مذکور ہے۔

فرعون کے ساحروں نے کہا کہ موسیٰ تم ڈالو یا ہم ڈالیں۔ موسیٰ نے کہا کہ تم ڈالو پھر جب انھوں نے ڈالا تو جادو کر دیا انھوں نے لوگوں کی آنکھوں پر اور ڈرا دیا لوگوں کو اور بڑا جادو کیا۔ القا کیا ہم نے موسیٰ کو کہا کہ تو بھی ڈال دے اپنی لاٹھی پھر یکایک وہ نگلنے لگی اس دھوکے کو جو انھوں نے بنایا تھا[3]"

سورۂ طٰہٰ میں یوں مذکور ہے۔

فرعون کے ساحروں نے کہا کہ موسیٰ تم ڈالو نہیں تو ہم ڈالتے ہیں۔ موسیٰ نے کہا کہ وہاں تم ڈالو۔ پھر یکایک ان کی رسیوں اور انکی لاٹھیوں کی طرف موسیٰ نے خیال کیا کہ ان کے جادو کے سبب سے چلتی ہیں پھر موسیٰ کے جی میں ڈر سا ہوا تو ہم نے القا کیا کہ مت ڈر تو ہی ان پر غالب ہے اور ڈال دے جو تیرے داہنے ہاتھ میں ہے تاکہ نگل جاوے جو کچھ

---

[1] فلما جاء السحرۃ قال لہم موسیٰ القوا ما انتم ملقون فلما القوا قال موسیٰ ما جئتم بہ السحر ان اللہ سیبطلہ ان اللہ لا یصلح عمل المفسدین۔

[2] قال لہم موسیٰ القوا ما انتم ملقون فالقوا حبالہم وعصیہم وقالوا بعزۃ فرعون انا لنحن الغالبون فالقی موسیٰ عصاہ فاذا ہی تلقف ما یافکون۔

[3] قالوا یا موسیٰ اما ان تلقی واما ان نکون نحن الملقین قال القوا فلما القوا سحروا اعین الناس واسترہبوہم وجاؤ بسحر عظیم واوحینا الی موسیٰ ان الق عصاک فاذا ہی تلقف ما یافکون۔

کہ انھوں نے بنایا ہے کہ وہ جادوگروں کا مکر ہے اور جادوگر کو فلاح نہیں ہے جہاں جاوے۔

سورۂ اعراف میں جو عبارت ہے "جادوگر دیا لوگوں کی آنکھوں پر" وہ ترجمہ ہے "سحروا اعین الناس کا" اس کا ترجمہ بجائے آنکھوں پر جادو کرنے کے ڈھٹ بند کرنا کیا جائے تو محاورہ اور صورت واقعہ کے بالکل موافق ہوگا اور اسی ایک لفظ سے وہ تمام باتیں سمجھ میں آجائیں گی جن کو ہم شروع سے لکھتے چلے آتے ہیں اسی سے یہ بھی قرینہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی لاٹھی بھی دوسروں کو سانپ معلوم ہوئی تھی وہ فی الواقع سانپ نہیں ہو جاتی تھی کیونکہ جب وہ لاٹھی اٹھالی جاتی تھی تو پھر لاٹھی کی لاٹھی رہ جاتی تھی۔ جب تک کسی کی تمام قوتیں غیر معمولی طور پر درجہ کمال کو نہ پہنچیں وہ پیغمبر نہیں ہو سکتا اس لیے حضرت موسیٰ کی قوت نفس ساحروں کی قوت نفس سے بہت زیادہ قوی تھی اور جب حضرت موسیٰ نے اس سے کام لیا تو ساحروں کی قوت نفس ہوا ہو گئی۔

دوسرا قصہ جس میں ہاروت و ماروت کے سحر کا بیان ہے وہ سورہ بقر میں ہے خدا تعالیٰ یہودیوں کی بے اعتقادیاں اور خرابیاں بیان کر کے اُسے ذیل میں فرماتا ہے۔

• جب ان کے پاس خدا کی طرف سے رسول آیا اور اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے تصدیق بھی کرتا ہے تو اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے خدا کی کتاب توراۃ اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دی ہے کہ گویا وہ اسے جانتے ہی نہیں اور ان ڈھکوسلوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں جنکو شیطان یعنی کفار حضرت سلیمانؑ کے وقت میں پڑھا پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمان سے کفر کی حرکت سرزد نہیں ہوئی شیطان یعنی کافروں نے کفر کیا تھا کہ لوگوں کو سحر سکھاتے تھے اور اسی گروہ نے اس چیز کی پیروی کی جسکو وہ اپنے زعم میں سمجھتے تھے کہ وہ دو فرشتوں پر جن کا نام ہاروت اور ماروت ہے اتاری گئی ہے بابل میں۔ اور وہ فرشتے کسی کو کچھ بتاتے نہ تھے جب تک کہ اس سے یہ نہ کہہ لیتے تھے کہ ہم تو فتنہ ہیں تم کہیں کافر نہ ہو جانا۔ اس پر بھی ان سے لوگ ایسی باتیں سیکھتے تھے جن کی وجہ سے میاں بیوی میں جدائی کرا دیں۔ حالانکہ بے حکم خدا کے وہ ان باتوں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے غرض کہ یہ لوگ ان سے ایسی باتیں سیکھتے تھے جن سے خود انھیں کو نقصان پہنچتا تھا اور کسی طرح فائدہ نہیں پہنچتا تھا[1]

---

[1] ولما جاءہم رسول من عند اللہ مصدق لما معہم نبذ فریق من الذین اوتوا الکتب کتب اللہ وراء ظہورہم کانہم لا یعلمون واتبعوا ما تتلوا الشیطین علی ملک سلیمن وما کفر سلیمن ولکن الشیطین کفروا یعلمون الناس السحر وما انزل علی الملکین ببابل ہاروت وماروت وما یعلمن من احد حتی یقولا انما نحن فتنۃ فلا تکفر (باقی صفحہ ۱۸۶ پر)

اس آیتہ میں بے شک بقیہ تین اقسام کے جادو کا ذکر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو اس کے معتقد ہونے سے ممانعت کی گئی ہے۔ اس آیت کا مطلب بیان کرنے سے قبل ہم شان نزول اور حالت ملک بیان کرتے ہیں۔ ایک زمانہ بنی اسرائیل کا ایسا تھا کہ تمام دنیا میں وہ علم و فضل اور قوت کے اعتبار سے بڑے سمجھے جاتے تھے اور اسی زمانے میں حضرت سلیمان پیغمبر مبعوث ہوئے جو پیغمبر بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل گرتے گئے اور بالآخر پیغمبر خدا محمدؐ کے زمانے میں انکی وہی حالت تھی جو ہندوستان میں مسلمانوں کی تیرہ صدی میں تھی اور اب بھی ہے کہ ان میں اچھی باتیں بہت کم ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی طرح بعثت رسول کے زمانے کے یہودی فالنامے، تعبیر نامے۔ تعویذ۔ گنڈے۔ فلیتے۔ نقش۔ عملیات اور حاضرات کے ناجائز ڈھکوسلے بہت سے کرتے تھے۔ جب کسی قوم میں عروج کے بعد زوال آتا ہے تو انکی حالت آخری ایسی ہی ہوتی ہے جس طرح ہندوستان کے مسلمان قرآن کے احکام کی پیروی نہیں کرتے اور لغویات میں بہت جی لگاتے ہیں۔ اسی طرح یہودیوں نے توراۃ کو کپڑے میں باندھ کر کنارے رکھ دی تھی اور لغویات میں پھنسے تھے اور ان لغویات کو کہتے تھے کہ حضرت سلیمان نے لوگوں کو تعلیم کیا ہے۔ جیساکہ اس زمانے میں لوگ بہت سے عملیات کو صحابہؓ اور پیغمبرؐ خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ بعد حضرت سلیمان کے جب قوم پر نکبت آئی اور تمام ملک میں نکبت پھیلی اس زمانے میں دو شخص ہاروت و ماروت غالباً عراق عجم کی طرف ایسے ہوئے جیسے ہندوستان میں آجکل پیرجی جابجا پھرتے ہیں لوگ ان کو باعتبار انکی کم سخنی اور تواضع اور انکسار کے فرشتہ خصلت کہتے تھے۔ دعا۔ تعویذ۔ فالنامہ پر ان کا گزر ہوتا ہے نیکی کی وجہ سے وہ مرجع خلائق ہوتے ہیں اور ان بزرگوں کی یہ کیفیت ہے کہ باوجود اس ظاہری زہد و تقویٰ کے چور کو چوری کے لئے بھی ساعت اچھی بتا دیتے ہیں۔ اس وقت بڑے سے بڑے بزرگ کے پاس جائیے اور دو روپے سامنے رکھ کر ہاتھ جوڑیے اور کہئے شاہ جی حب کا تعویذ لکھ دیجئے تو وہ فوراً قلم اور دوات اٹھا کر لکھ دیں گے اور ذرا تاخیر نہ کریں گے اگر تاخیر کریں گے تو روپے کے ساتھ مرغ کا گوشت بھی کھانا چاہیں گے اور کہیں گے کہ مرغ کا خون ہوتا تو اسکی تحریر زیادہ موثر

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) فیتعلمون منہما مایفرقون بہ بین المرء و زوجہ۔ وماہم بضارین بہ من احد الا باذن اللّٰہ ویتعلمون مایضرہم ولاینفعہم۔

ہوتی۔ اب شاہ صاحب مذہبی تقدس سے کچھ کہیں گے تو دبی زبان سے صرف یہی کہیں گے کہ بھائی عذاب وثواب تمہاری گردن پر ہے میں لکھے دیتا ہوں۔ مگر کھل کر کبھی انکار نہ کریں گے اور نہ ڈانٹ کر یہ کہیں گے کہ "دوسروں کی بہو بیٹی نکلوانے کے لئے میں کتنا نہیں ہوں کہ تعویذ لکھوں۔ جادو رہو"۔ ممکن ہے کہ اسی قسم کے دو مشہور پیرزادے ہاروت اور ماروت اگلے زمانے میں گزرے ہوں اور یہودی اپنے افعال کی سند میں حضرت سلیمان ہاروت وماروت کا نام لیتے ہوں۔ جب یہودیوں نے پیغمبرؐ خدا کا کہنا نہیں سنا اور پیغمبرؐ خدا نے توریت کا حوالہ دیا تو اس پر بھی دھیان نہیں کیا اور اپنے ڈھکوسلوں کے سامنے اس کو بھی بے وقعت قرار دیا۔ اس وقت یہ آیت اتری۔ اب آیت کے معنی بہت صاف سمجھ میں آ جائیں گے۔ یعنی جب ان یہودیوں کی طرف خدا کے رسول آنحضرت محمدؐ آئے جو تورات کی بھی تصدیق کرتے ہیں تو بعض اہل کتاب نے تورات سے آنکھیں بند کر کے قرآن کی تکذیب کی۔ اگر وہ تورات کو دیکھتے تو جانتے کہ قرآن میں وہی باتیں نصیحت اور پند کی ہیں جو تورات میں ہیں۔ لیکن وہ تو بجائے تورات دیکھنے کے وہ چیز دیکھتے ہیں جو کفار دیکھتے تھے یعنی عملیات اور حاضرات وغیرہ اور کہتے ہیں کہ سلیمانؑ نے یہ چیزیں بنائی ہیں۔ حالانکہ سلیمان کو ان چیزوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ سلیمان کے وقت کے کفار البتہ ان لغویات کے عامل تھے اور لوگوں کو یہ لغویات سکھاتے تھے اور یہود کہتے ہیں کہ یہ عملیات تو ہاروت ماروت جیسے فرشتہ خصلت انسانوں کے بھی زیر عمل تھی اس میں شبہ نہیں کہ ہاروت وماروت ایسا کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ یہ برا کام ہے اور ہم برا کرتے ہیں بے شک لوگ ان دونوں سے یہ برائیاں سیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ برائیاں کچھ کارآمد ہیں یعنی اگر چاہیں گے تو میاں بیوی میں اس کے ذریعے سے لڑائی کرا دیں گے یا اور خرابیاں اپنی خواہش کے مطابق پیدا کر سکیں گے لیکن وہ بھی خرابی پیدا نہیں کر سکتے تھے اگر کچھ ہو جاتا تھا تو خدا کے حکم سے ہوتا تھا۔ اگر کوئی عمل کیا جائے تو خواہ مخواہ عمل کرنے والے کے موافق ہو گا یا مخالف ہو گا دو ہی صورتیں ہیں اگر موافق ہوا تو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس عمل کی تاثیر سے ہوا بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ عمل نہ پڑھا جاتا جب بھی ایسا ہی ہوتا۔ اب ناظرین خود سمجھ لیں کہ قرآن میں سحر کی تکذیب کی گئی ہے یا تائید کی گئی ہے۔

اس میں چند باتیں غور طلب ہیں ایک یہ کہ قرآن میں لفظ شیاطین کا ہے جس کے معنی بعضوں نے شیطان کو بمعنی شیطان لیا ہے اور یہ معنی سمجھتے ہیں کہ جنات شیطان۔ دیو۔ پری جادو

کے سکھانے والے ہیں۔ جس طرح پیغمبر توحید سکھاتے پھرتے ہیں ویسے ہی شیطان آدمی کا بھیس بدل کر جادو سکھاتے پھرتے ہیں۔ ان معنوں میں ذرا سا فرق ہے اگر یہ معنی لیں کہ انسان شیطانی حرکات اختیار کر کے جادو سکھاتے ہیں تو ٹھیک ہے اور اسی رعایت سے ہم نے شیاطین کا ترجمہ کفار کیا ہے۔ دوسرا لفظ "ملکین" کا قرآن میں ہے جن کے معنی ہیں دو فرشتے اور ہم نے اس مراد لئے ہیں دو فرشتہ خصلت انسان اور فرشتہ خصلت بھی واقعی طور پر نہیں بلکہ اس وقت کے لوگوں کے خیال کے مطابق یہ معنی اچھے معلوم ہوتے ہیں ورنہ ہمارا مطلب یوں بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ لام کو زیر کے ساتھ پڑھیں (ملکین) اور اس وقت اس کے معنی ہو جائیں کے "دو بادشاہ" بہت سے قرار ایسا ہی پڑھتے ہیں اور اس قرت پر بہت سے مفکرین نے ہاروت و ماروت کو دو بادشاہ مانا ہے۔ واللہ عالم بالصواب۔

قرآن میں سورہ فلق میں ہے "گرہوں میں پھونکنے والی عورتوں کی برائی سے" ومن شر النفاثات فی العقد۔ یہاں گرہوں میں پھونکنے والی عورتیں ان پچھلے اقسام میں داخل نہیں ہیں جن کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ ایسے با اقتدار لوگوں کا وجود قرآن سے ثابت نہیں ہوتا۔ جس طرح انسان میں ایسی عورتیں ہیں جنکی نظریں بد ہیں۔ میلی کچیلی کثیف حالت میں رہتی ہیں اور کبھی کبھی وہ اس امر کا بھی غلط دعوئی کرتی ہیں کہ ان کے پھونکنے یا پڑھنے سے کشود کار ہوتا ہے۔ یا بھلائی برائی وقوع میں آجاتی ہے۔ ان کے پیچھے پیچھے جاہل عورتوں کا غول ہوتا ہے سب سمجھتی ہیں کہ تمام زمین و آسمان کے اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہیں اور اس لئے اس کے اقتدار بڑھنے سے طرح طرح کے فسادات پیدا ہوتے ہیں۔ خدا نے کہا کہ ان کے شر سے خدا کی پناہ مانگو یعنی ان کو قابل نفرت سمجھو۔ اسلام پھیلنے پر ایام جہالت کی یہ تمام لغویات قابل لحاظ نہیں رہیں۔

فصل نمبر ۵۲

مسئلہ جبر و اختیار (قضا و قدر)

جب انسان عالم کی خلقت پر غور کرتا ہے تو وہ ایک کو دوسرے کا سبب پاتا ہے۔ اور اخیر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی ترکیب چھوٹے چھوٹے ذروں سے ہے جس کو ہیولا، یا مادہ کہتے ہیں۔ لیکن یہ معلوم کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے کہ وہ مادہ از خود موجود تھا یا کسی موجود نے اس کو پیدا کیا تھا اور مختلف اجناس اور انواع و اقسام اشکال میں ان مادوں کے مرکب ہونے کا کیا سبب ہے۔ یہ خاصیتیں اور قوتیں خود ان میں موجود تھیں یا کسی موجود کی ودیعت کی گئی تھیں۔ موجودات میں موجود و محسوس کے سوا انسان کو کچھ نظر نہیں آتا۔ یعنی انسانی قوی میں عالم مادیات سے آگے متجاوز ہونے کی قوت نہیں ہے اسی نہیں سے فلاسفہ طبیعی اور فلاسفہ الہیین جدا ہوتے ہیں فلاسفہ طبیعی تو یہیں تک پہنچ کر رہ جاتے ہیں اور نیچر کا لقب پاتے ہیں۔ کیونکہ نیچر کو ہی وہ خالق کائنات مانتے ہیں مگر فلاسفہ الہیین یقین کرتے ہیں کہ اس کا پیدا کرنے والا وہی خالق ازلی ابدی ہے۔ جسکو یہاں کے لوگ خدا اور عرب کے لوگ اللہ اور یورپ کے لوگ گاڈ اور فلاسفہ الہیین علتہ العلل کہتے ہیں۔ خلاصہ اس تقریر کا یہ ہے کہ خدا دنیا کے پیدا کرنے کا سبب ہے۔ جو طریقہ آفرینش کا اس نے پیدا کر دیا ہے اسی پر لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ کمہار کے آنوے سے مختلف رنگ اور مختلف وضع کے برتن نکلتے ہیں کوئی ٹیڑھا ہو گیا کوئی سیاہ ہو گیا۔ کمہار کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ کسی کو ٹیڑھا یا سیاہ

بنائے لیکن سب کا بنانے والا کمہار ہی سمجھا جاتا ہے اور اسی طرح خدا کی قائم کی ہوئی فطرت سے مختلف شکل، مختلف صورت مختلف قد اور مختلف رنگ کے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ فطرت انسانی خدا کی بنائی ہوئی ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ اچھے اور برے نیک اور بد ہر طرح کے انسان خدا نے پیدا کئے ہیں۔ علۃ العلل ہونے کی حیثیت سے خدا کو قادر مطلق مانتے ہیں۔ لیکن انسان اپنے فعل کا پورا مختار ہے اس لئے اچھے اور برے افعال کا مرتکب خود اسی کو قرار دیتے ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ خدا چور کو چوری کرنے کے لئے اٹھاتا ہے اور پھر کوتوال شہر کو خبردار کر دیتا ہے کہ چور کو پکڑے اور سزا دے۔

ایران کے زرتشتوں کا یہ مسلک تھا کہ خالق خیر یزداں ہے اور خالق شر اہرمن ہے۔ عیسائیوں کے تین خدا تو فرضی ہیں۔ لیکن زرتشتوں نے واقعی طور پر الوہیت کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا تھا عرب کے ریگستان میں بھی یہی خیالات پھیلے ہوئے تھے۔ اسلام کا بڑا کام جہالت کا رفع کرنا ہے اس لئے قرآن میں جا بجا یہ فرمایا گیا ہے کہ علۃ العلل ہونے کی حیثیت سے شر اور خیر دونوں کی نسبت ایک ہی ذات کی طرف کی جا سکتی ہے۔ اور وہ ذات واحد ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ یعنی اس کی قدرت کامل ہے اور ادھوری نہیں ہے قرآن عام فہم لفظوں میں ہے اس میں نتیجہ سے اور تمثیلی زبان سے بحث کی گئی ہے تاکہ چھوٹی سمجھ والے اور بڑی سمجھ والے دونوں اس کو سمجھ سکیں علۃ العلل کا سا موٹا لفظ اس میں رکھا جاتا تو اس وقت کے عرب عموماً سمجھنے سے قاصر رہتے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ترقی علوم کے بعد اب بھی اسی طرح سمجھیں جس طرح ریگستان کے بدو سمجھتے تھے۔

یہ عالم ناسوتی ہے۔ بیان کے جتنے ذریعے ہیں وہ سب اس عالم ناسوتی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں کوئی بیان عالم غیر مادی یا معاد کا عام فہم استعارات یا تشبیہات سے خالی ہو تو عوام اسکو نہیں سمجھ سکتے۔ تمثیلی زبان سے کتب سماوی میں بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ جن لوگوں میں روحانی قوتیں خلقتاً یا بذریعہ اکتساب کے زیادہ ہیں وہ عالم مادی اور غیر مادی کے تعلقات کو زیادہ تر سمجھتے ہیں اور اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی حقیقت صوفیائے کرام عمدہ طور پر سمجھتے ہیں۔ بشرطیکہ ٹھگنے کے لئے صوفی نہ بنے ہوں۔ لیکن جو لوگ صوفی نہیں ہیں اور علوم جدیدہ یا قدیمہ کی تحصیل سے قانون فطرت پر غور کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ ان کو بے شک یہ حق ہے کہ کتب سماوی کے سمجھنے میں ان کا مذاق جداگانہ ہو اور اس سے انکار کرنا بڑی غلطی ہے۔

کلام الٰہی یعنی قرآن اور فعل الٰہی یعنی موجودات عالم میں فرق نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان کے سمجھنے کا جو طریقہ اختیار کیا جائے وہ البتہ غلط ہو سکتا ہے۔ خدا نے جس عالم میں ہم کو پیدا کیا اور جس عالم کی مناسبت سے ہم کو قویٰ دیئے اس عالم کی پوری ماہیت دریافت کرنے کے بعد کلام الٰہی کو اس سے منطبق کرنا یہ ہمارے اختیار کی بات ہے اور اسی طریقہ سے موجودات عالم کے ماہر کلام الٰہی پر پورا الیقین بھی کر سکتے ہیں اور یہ غلطی ہے کہ کلام الٰہی کے سمجھنے کا جو ذریعہ ہے اس کو ہم کلام الٰہی میں ڈھونڈیں۔

الحاصل جب خدا جمیع کائنات کا علۃ العلل ہے تو تمام حوادث، واقعات اور افعال مخلوقات اس کی طرف منسوب ہو سکتے ہیں اور وہ علۃ العلل (یعنی ذات باری) اپنی معلولات کا علم واقعی رکھتی ہے اور علم باری ہی کا نام اگر تقدیر رکھا جائے تو زیادہ تر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ انسان سے اچھے اور برے افعال زیادہ تر اس کے اعضا کی ترکیب سے سرزد ہوتے ہیں یعنی جس طرح ایک ہی اسٹیم (بھاپ) مشین کے مختلف پرزوں میں پہنچ کر مختلف کام کرتی ہے اسی طرح نفوس انسانی مختلف قسم کے دل و دماغ اور اعضا میں مختلف کام دیتے ہیں۔ اس لئے جسم کی فطرتی بناوٹ اور خلق کے لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ اچھے یا برے انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں حال کی تحقیقات بھی بالکل اسی خیال کے موید ہے اور انسانی تجربہ بھی یہی کہتا ہے۔ آثار میں یہی سائنس تیرہ سو برس پہلے یوں بیان کی گئی ہے۔

السعید من سعد فی بطن امہ

والشقی من شقی فی بطن امہ

نیک ماں کے پیٹ سے نیک پیدا ہوتا ہے اور بد ماں کے پیٹ سے بد پیدا ہوتا ہے۔

انسان کو اس اعتبار سے کہ اچھا یا برا وہ پیدا ہوتا ہے غیر مکلّف ہونا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ ہی عقل بھی لگی رہتی ہے جو اچھے اور برے میں اسے تمیز سکھاتی ہے اس لئے اسے مکلّف کہتے ہیں۔ جب صریح دیکھتے ہیں کہ وہ متحرک بالارادہ ہے کچھ کرنا چاہتا ہے تو کسی کے روکنے سے بھی نہیں مانتا اور جب نہیں کرنا چاہتا تو مارنے پر بھی نہیں کرتا تو پھر کیونکر اسے غیر ذی اختیار سمجھیں غرض کہ انسان کو پورا اختیار اچھے یا برے افعال کے ارتکاب کا دیا گیا ہے جسم کی بناوٹ سے جو فطرتی میلان طبع کا ہوتا ہے اس کی اصلاح تعقل۔ رسم و رواج یا مذہب سے ہو سکتی ہے۔ انسان کا کام ہے کہ عقل سے ہر وقت سوچتا رہے۔ سوسائٹی کے اچھے برے رسم و

رواج میں امتیاز کرے اور یہی قوت امتیاز یہ تحرک بالارادہ کے ساتھ مل کر انسان کو مکلف بناتی ہے۔

خیر یہ سمجھنا تو مشکل نہیں ہے کہ انسان اپنے فعل کا مختار ہے اور علۃ العلل ہونے کی حیثیت سے اللہ قادر مطلق ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا کلام اللہ سے اور بزرگان دین کے اقوال سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے یا نہیں۔

یہیں یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ علم الہٰی کا نام بعضوں کے نزدیک تقدیر ہے مثلاً کوئی نجومی کسی کی نسبت یہ بیان کرے کہ وہ آگ میں جل کر مرے گا تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرنے والے کی موت کا علم اس نجومی کو تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہنا صحیح نہ ہو گا کہ نجومی نے اس کو آگ میں کود پڑنے پر مجبور کیا تھا۔ علۃ العلل ہونے کی حیثیت سے خدا کو علم ہے کہ کون بندہ کیونکر دنیا میں گزران کرے گا اور اس طرح ہر شخص کی آئندہ زندگی کی حالت جو خدا کے علم میں ہے وہ تقدیر کہی جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ نہیں کہا جائے گا کہ خدا نے اپنے کسی بندے کو کسی خاص فعل یا ترک فعل کے لئے مجبور کیا۔ پہلے چند باتیں بطور مقدمہ کے سمجھ لینا چاہیئے تاکہ کلام اللہ کی آیتوں کا سمجھنا آسان ہو جائے۔

۱:۔ تمام موجودات عالم کو اور تمام انسانوں کو مع ان کے تمام قویٰ کے اس نے پیدا کیا جسکو ہم خدا یا علۃ العلل کہتے ہیں۔

۲:۔ اس نے تمام انسانوں اور حیوانوں کو اپنی مشیت سے ایک فطرت پر پیدا کیا اور اس فطرت میں وہ تغیر و تبدل نہیں کرتا۔ اسی فطرت کے مطابق انسان سے افعال صادر ہوتے ہیں اختیاری ہوں یا اضطراری، دونوں حالتوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشیت الہٰی سے وہ افعال صادر ہوتے ہیں۔

۳:۔ انسان میں دو متضاد قوتیں موجود ہیں ایک کسی کام کے کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور دوسری اسے کام کرنے سے روکتی ہے۔

۴:۔ انسان ان تمام قویٰ کو جو اس میں ودیعت رکھے گئے ہیں اپنی فطرت کی حد تک کام میں لانے کا مختار ہے۔

۵:۔ انسان اپنے فعل کا مختار ہے اس لئے مکلف ہے۔

۶:۔ موجودات عالم کے حالات و افعال کا علم اس علۃ العلل کو ہے جس نے اس عالم کو بنایا یا پیدا کیا ہے۔

۷:۔ تمام افعال جو انسان سے صادر ہوتے ہیں انکی نسبت تمام وسایط کو حذف کرکے کہہ سکتے ہیں کہ علۃ العلل سے صادر ہوئے۔

۸:۔ انسان اپنے تمام افعال کو علۃ العلل یعنی خدا کی طرف منسوب کر سکتے ہیں کیونکہ وہی ان قوتوں کا خالق ہے جس سے وہ افعال ظاہر ہوئے۔

۹:۔ امورات شرعیہ کے بجا لانے میں قوت فعل کو کام میں لانا اور منہیات شرعیہ سے بچنے میں قوت ترک فعل کو کام میں لانا اس علۃ العلل کی مرضی کے موافق ہے اور باعث درجات ہے۔

۱۰:۔ برخلاف اس کے منہیات شرعیہ میں قوت فعل کو کام میں لانا اور قوت ترک فعل کو کام میں نہ لانا اس علۃ العلل کی مرضی کے موافق نہیں ہے اور باعث درکات ہے۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بغیر مشیت الٰہی نہ کچھ ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ لیکن مشیت الٰہی کیا چیز ہے اسی کا سمجھنا اصل امر ہے۔ مشیت الٰہی کا ظہور اس فطرت میں ہوتا ہے جس پر انسان اور کل مخلوقات پیدا کئے گئے ہیں۔ آگ کی فطرت میں جلانے کی قوت رکھی گئی ہے جب کوئی چیز جلنے کے لائق اس میں ڈالی جائے گی تو ضرور جل جائے گی۔ یہ کہا جائے گا کہ مشیت الٰہی یہی ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ آگ میں جلانے کی قوت خدا نے پیدا نہیں کی ہے۔ جب کوئی جلنے والی چیز اس میں پڑتی ہے خدا عادتاً اس میں قوت احتراق پیدا کر دیتا ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔

اب ان اصول عشرہ کے مطابق ہم ان آیتوں کی تفسیر بیان کریں گے کہ ان آیتوں سے انسان ان قویٰ کے کام میں لانے سے مجبور نہیں۔ ہے جو اس کو عطا ہوئے ہیں اور اسی لئے وہ مکلف ہے۔ جنکو بعض مفسروں نے بیان کیا ہے۔

مثلاً خدا نے فرمایا کہ: "تم میں سے جو سیدھی راہ پر چلتا ہے اس کے لئے قرآن نصیحت ہے" اس میں تو انسان کا مختار ہونا ظاہر ہے۔ دوسری جگہ ہے "تم کچھ نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ، پروردگار عالم چاہے" مقدمہ دوم کا اصول یہاں متعلق کیجئے۔ سلب اختیار انسان جبکہ وہ فطرت ذی اختیار پر پیدا کیا گیا ہے اس سے لازم نہیں آتا۔

"خدا گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت کرتا ہے جسکو چاہتا ہے" وہ علۃ العلل ہے اس لئے بندوں کے تمام افعال کو وسایط درمیانی حذف کرکے اپنی طرف منسوب کر سکتا ہے (دیکھو مقدمہ ہفتم) انسان جو فطرتاً ذی اختیار پیدا کیا گیا ہے اس کی برأت لازم نہیں آتی۔

"اگر تیرا پروردگار چاہتا تو ایمان لاتے وہ سب جو زمین پر ہیں" یعنی وہ چاہتا تو انسان

کو فطرتاً ذی اختیار پیدا نہ کرتا۔

"ممکن نہیں کہ کوئی شخص بے اذن خدا کے ایمان لائے" اذن خدا کیا ہے؟ ذی اختیار ہونے کی فطرت یا خدا کا علم اذن ہے۔ تو معنی یہ ہوئے کہ کوئی شخص اپنی فطرت کے خلاف ایمان نہیں لا سکتا یا یہ معنی ہوئے کہ جو ایمان لائے گا اس کا علم خدا کو ہے (دیکھو مقدمہ ششم) قرآن میں اذن خدا اور مشیت خدا کا لفظ بطور استثنار کے بولا گیا ہے مثلاً "کوئی شفاعت نہیں کر سکتا جب تک کہ خدا کا اذن نہ ہو" اور "تم نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ خدا چاہے" لیکن ان دونوں مقامات پر کسی امر مستثنار کا واقع ہونا مراد نہیں ہے بلکہ خدا کو اپنی عظمت جبروت اور قدرت کاملہ کا اظہار مقصود ہے یا جملہ ماقبل کی توثیق مراد ہے۔

"ہم ان کو چھوڑ دیں گے انکی گمراہی میں بھٹکتے ہوئے۔ وہ ایمان نہیں لانے کے مگر جب خدا چاہے" گمراہی میں چھوڑ دینے کے معنی یہ ہیں کہ جس فطرت پر وہ پیدا کئے گئے۔ اسی فطرت پر وہ رہیں گے (دیکھو مقدمہ دوم) خدا کا یہ کہنا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اصول ششم پر متفرع ہے یعنی خدا کو اپنے علم سے معلوم تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہوں گے۔

"قرآن کے سمجھنے سے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ان کے کانوں کو بہرا کر دیا ہے۔ یعنی گو خدا نے ان کو فطرتاً مختار پیدا کیا تھا لیکن خدا کے علم میں یہ تھا کہ وہ راستے پر نہ آئیں گے۔ اصول ہفتم پر بہ سبب علۃ العلل ہونے کے افعال عباد کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

"لیکن وہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے" یہ جملہ اسی علم الہی پر مبنی ہے جس کا ذکر مقدمہ ششم میں کیا گیا اور پھر مقدمہ ہفتم کے اعتبار پر اپنی ذات کی طرف تمام وسایط کو حذف کر کے منسوب کیا ہے "اگر خدا چاہتا تو خدا کی نشانیاں نازل ہونے کے بعد وہ آپس میں نہ لڑتے لیکن اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ خدا جس شخص کو فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے تو تو خدا سے اسکو ہرگز بچا نہیں سکتا" بالکل سچ ہے خدا کا ارادہ قانون فطرت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس فطرت ذی اختیار پر خدا نے جس کو پیدا کیا ہے اس کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو خدا نے فتنہ میں پڑنے پر مجبور کر دیا تھا "خدا نے ان کے ہاتھوں کو تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے باز رکھا ہے" اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جو فطرتی اسباب غالب اور مغلوب ہونے کے یا شکست پانے یا کامیاب ہونے کے بنائے اسی پر تمام حالات یا واقعات موقوف ہیں۔

اسی طرح ان تمام آیتوں کو سمجھنا چاہیئے جن سے بادی النظر میں انسان کے مختار ہونے کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ انسان نے مختار ہونے کی جو آیتیں قرآن میں ہیں ان سے بھی ہمارے معنوں کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً فمن شیاء فلیومن ومن شاء فلیکفر۔ جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ ما ظلمہم اللہ ولکن انفسہم یظلمون۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا تھا۔ بلکہ انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ ماحصل اس کا یہ ہے کہ خدا نے انسان کو ایک حد تک ذی اختیار پیدا کیا ہے اور اپنے حد اختیار میں جو فعل انسان کرتا ہے وہ اس کا ذمہ دار اور جوابدہ ہے۔ گو علۃ العلل ہونے کے سبب سے وہ خدا کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ فی الواقع بندہ کا اختیاری فعل ہے۔

مفصلہ بالا تحریر ان لوگوں کو تشفی دینے والی ہے جن کے دل میں تو ہمات پیدا ہو کر اسلام کی طرف ان کو راغب نہیں ہونے دیتے۔ ورنہ اس مضمون کے لکھنے والے کا یہ مذہب نہیں ہے۔ خدا کے ساتھ جو خلوص اور اعتقاد اس کو ہے وہ اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ خدا کے اختیارات کو کسی طرح پر محدود کرے لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے تمام برے افعال کا وبال بھی اپنی ہی گردن پر وہ لینے کو تیار ہے۔ خدا سے اس کو یہ عشق ہے اور اس لئے اپنے معشوق کی کسی ادا کا وہ شاکی نہیں ہے اور نہ ایسے باریک مسئلہ پر سوچنا یا سمجھنا وہ ضروری سمجھتا ہے اور نہ اس اہم مسئلے کو طے کئے بغیر کہیں سے اس کا ایمان ڈانوا ڈول ہوتا ہے۔ اس کا یہ ایمان ہے کہ خدا کے جتنے اسماء صفات ہیں وہ سب صحیح ہیں۔ لیکن اس عالم کے تعلقات سے کیونکر انکو وابستگی ہے اسکی چھان بین کی انسان کو ضرورت نہیں ہے اور چھان بین کی بھی جائے تو جب تک روح اس عالم ناسوتی سے تعلق رکھتی ہے وہ ان باتوں کے ادراک کامل سے یقیناً قاصر ہے۔ وسط سمندر میں کوئی پھینک دیا جائے اور وہ ہاتھ پاؤں مار کر ساحل تک پہنچنے کی کوشش کرے تو فعل عبث ہے۔

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار
کہ پیدا نہ شد تختہ بر کنار

انسان کا دائرۂ معلومات تنگ اور محدود۔ فکر انسانی ہمیشہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی ایسی حالت میں روح معاد یا خلقت عالم پر اپنی عقل سے کوئی رائے قائم کر لینا سب سے بڑی جہالت ہے۔ خدا کی نسبت یہ سمجھنا کہ وہ دنیا کا گورکھ دھندا بنا کر خود وجود معطل

ہوگیا بڑی گستاخی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو حجتی طبیعت رکھتے اور قرآن کو اس لئے غلط سمجھتے ہیں کہ وہ فطرت انسانی کے خلاف ہے اور خدا کو اس لئے عادل نہیں سمجھتے کہ بندہ مجبور ہے اور خدا ہی خیر و شر کا خالق ہے ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ یہ مضمون پڑھیں اور سوچیں کہ اگر فطرت موجودات کا علم ان کا بہت ہی کامل ہے تو کلام اللہ بھی اس کے خلاف نہیں ہے۔ کلام اللہ انسان کی ہدایت کے لئے ہے۔ انسان کے خیالات مختلف ہیں تو قرآن کا بھی یہ اعجاز ہے کہ مختلف پیرائے کے لوگ اس سے مختلف پیرائے میں تشفی حاصل کر سکتے ہیں یعنی قرآن اس طور پر لکھا گیا ہے کہ ہر استعداد اور ہر مذاق کا آدمی اپنے مذاق کے موافق اس سے تسکین حاصل کر سکتا ہے آسمان زمین، دعا، سحر، جن، ملائکہ، قصہ آدم، خلقت عالم، عذاب و ثواب دوزخ و بہشت، یہ تمام چیزیں قرآن میں اس طرح مذکور ہیں کہ عرب کے بدوؤں کو بھی اس کے پڑھنے سے تشفی ہوئی اور یونانی فلسفہ جب مسلمانوں میں پھیلا تو متکلمین نے بڑے بڑے دہریوں کی تسکین کر دی۔ اور زمانہ حال کی سائنس اور ہیئت سے بھی وہ کلام پورے طور پر مطابق پایا جاتا ہے۔ کیوں نہ ہو یہ کلام ربانی ہے ہر فرقہ ہر قوم اور ہر قرن کے مناسب حال بنایا گیا ہے۔

اکابر اسلام کے بھی چند اقوال نقل کئے جاتے ہیں تاکہ ان کے خیالات اس مسئلہ کے متعلق معلوم ہوں۔

حضرت علیؓ نے جنگ صفین سے واپس آنے پر ایک شخص کے سوال کے جواب میں جو فرمایا اس کو امام احمد زیدی نے لکھا ہے۔ جا بجا سے ان کے فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں "دانے کے پھوڑنے والے اور جان کے پیدا کرنے والے کی قسم ہے کہ کسی وادی میں نہ اترے اور نہ کسی ٹیلہ پر چڑھے مگر قضا و قدر کے موافق"۔ پھر شیخ نے پوچھا تو کیا ہمارے لئے خدا کے نزدیک کچھ ثواب نہیں ہے۔ کیونکہ قضا و قدر نے ہم کو چلایا اور اسی سے ہمارا سفر ہوا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "شاید تو اس کو قضاء یقینی اور قدر قطعی خیال کرتا ہے۔ ایسا ہوتا تو عذاب اور ثواب کے وعدے سب بیکار ہو جاتے۔ خدا نے ہم کو مختار بنا کر حکم دیا ہے مجبور بنا کر مکلف نہیں کیا ہے اور ایسا خیال کافروں کا ہے"۔

حضرت امام حسنؓ نے اہل بصرہ کو خط لکھا جس کے چند فقرے یہ ہیں "جو خدا پر اور اس کے قضا و قدر پر ایمان نہیں لایا وہ کافر ہوا۔ اور جس نے اپنے گناہوں کو خدا کی طرف منسوب کیا وہ گنہگار ہوا۔ اگر خدا کی عبادت کریں تو خدا انکے اور ان کے عمل کے درمیان حائل نہیں ہوتا۔ اور اگر گناہ کریں

تو خدا نے کچھ گناہ پر مجبور نہیں کیا ہے۔

حسن بصری نے حجاج کے خط کے جواب میں مسئلہ قدر کی حقیقت یوں بیان کی ہے۔ جہلا کہتے ہیں کہ خدا جس کو چاہے ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہے ہے راہ دکھاتا ہے اگر وہ آیت کے ماقبل اور مابعد پر نظر ڈالتے تو انکو معلوم ہو جاتا کہ خدا گمراہ نہیں کرتا مگر کفر اور گناہ کے تقدم کی وجہ سے جیسا کہ اس کا قول ہے کہ اللہ ظالموں کو گمراہ کرتا ہے۔

امام احمد بن یحییٰ المرتضیٰ زیدی نے لکھا ہے عبداللہ عمر سے ایک شخص نے کہا اے ابو عبدالرحمٰن بعض قوموں کے لوگ زنا کرتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ چوری کرتے ہیں اور لوگوں کو قتل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے علم میں تھا ہم کو کوئی چارہ نہیں ہے۔ عبداللہ بن عمر غصہ ہوئے اور کہا سبحان اللہ۔ بیشک اللہ کے علم میں تھا کہ وہ لوگ ایسے کام کریں گے۔ مگر خدا کے علم نے ان کو ان کاموں کے کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ مجھ سے میرے باپ عمر بن خطاب نے ذکر کیا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا کہ علم الٰہی کی مثال تم میں مثل آسمان کے ہے جس نے تم پر سایہ کر رکھا ہے اور مانند زمین کے ہے جس نے تم کو اٹھا رکھا ہے۔ جس طرح تم آسمان وزمین سے باہر نہیں جا سکتے اسی طرح تم خدا کے علم سے باہر نہیں ہو سکتے اور جس طرح آسمان وزمین تم کو گناہوں پر مائل نہیں کر سکتے اسی طرح خدا کا علم بھی تم کو ان گناہوں پر مجبور نہیں کرتا۔

فصل نمبر ۵۳

قصص قرآنی

قرآن میں جہاں امر اور نہی کے احکام ہیں یا اخلاق حسنہ کی تعلیم کی گئی ہے وہاں پرانے زمانے کے قصے بھی مجملاً مذکور ہیں جن سے محض اخلاق اور حکمت کا سکھانا مقصود ہے۔ ان میں زیادہ تر وہی باتیں ہیں جو عرب۔ اور شام میں جزوی اختلافات کے ساتھ پہلے سے مشہور تھیں۔ ابتدائے اسلام میں مناسب معلوم ہوا کہ ان قصوں کے واقعات یاد دلا کر خیر کی طرف طبیعتیں متوجہ کی جائیں اور اس پیرائے میں عقائد اسلام تعلیم کئے جائیں۔ عبارت قرآنی کی خوبی تو عربی جانے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی رہا طرز بیان وہ بھی زائد تر اسی وقت کے حسب حال تھا کہ لوگوں کو باتیں پہلے سے معلوم تھیں پورا قصہ لکھنے کی ضرورت نہ تھی صرف ایک اشارہ کافی اور با اثر ہوتا تھا۔ الکنایۃ ابلغ من الصراحۃ۔

سب کو معلوم ہے کہ قرآن ایک دم سے نازل نہیں ہوا۔ ضرورت کے وقت آیتیں یا سورتیں نازل ہوتی تھیں اس لئے ایسا بھی ہے کہ مختلف اوقات اور مختلف مواقع پر ایک ہی بات بار بار کہی گئی ہے۔ گو طرز بیان ہر جگہ پر جداگانہ ہے اور باعتبار بلاغت کے نہایت ہی دلچسپ ہے لیکن غیر زبان میں ترجمہ ہونے کے بعد اور شان نزول پر نظر نہ ہونے کی حالت میں قصہ کا لطف بہ حیثیت قصہ ہونے کے ضرور کم ہو جاتا ہے مگر وہ باتیں جو ان قصوں سے پیدا ہوتی ہیں بجائے خود نہایت مفید اور بکار آمد ہیں اور ہر وقت اور ہر موقع کے مناسب ہیں۔ ہم اس وقت صرف

انھیں فوائد سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن میں جابجا یہ بتایا گیا ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنے کو خراب نہیں کرتی خدا بھی اس کو خراب نہیں کرتا۔ جب کوئی خود کو بھول جاتا ہے تو خدا بھی اس کو بھول جاتا ہے اس کو یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ کسی قوم کو عروج ہوتا ہے تو وہ محنت۔ جانفشانی۔ شکرگزاری وغیرہ سب اسباب ترقی چھوڑ کر خود فراموشی اختیار کرتی ہے جسکا دوسرا نام ہے خدا فراموشی۔ نتیجہ خدا فراموشی کا ہے کثرت معاصی اور اس کا نتیجہ لازمی ہے تباہی اور بربادی۔ ایک قوم کے برباد ہونے پر دوسری قوم محنت اور شکرگزاری کے راستہ پر چلتی ہے اور جب اسکو بھی عروج ہوجاتا ہے تو خدا فراموشی کے ساتھ زوال شروع ہوجاتا ہے اور زوال شروع ہونے کے وقت اپنے ناصحوں یعنی پیغمبروں کا کہنا نہ ماننا لازمی ہے۔ جب تک نصیحت سننے کیلئے کان کھلے رہتے ہیں خدا فراموشی نہیں ہوتی اور نہ زوال آتا۔ خدا اسی قومی ترقی وزوال کو کہتا ہے کہ " تلک الایام نداولہا بین الناس " دلوں کو ہم آدمیوں میں پھیرتے رہتے ہیں۔ خدا نے بہت سی امتوں کا عروج وزوال قرآن میں دکھایا ہے۔ زوال کے لئے عذاب کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ عذاب کی غایت قوموں کی بربادی ہے اور عذابوں کے مختلف طریقے لکھے گئے ہیں اگر لسان تمثیلی سمجھی جائے تو مطلب صاف ہے اور اگر فی الواقعی طوفان کا آنا زلزلہ کا محسوس ہونا۔ پتھر برسنا وغیرہ وغیرہ آفات ارضی وسماوی کا واقع ہونا اصلی معنوں میں سمجھا جائے جب بھی سمجھ داروں کے نزدیک کوئی بات انوکھی پیدا نہیں ہوتی۔

مختلف مقامات پر مختلف پیرائے سے قصے بیان کئے گئے ہیں اور کہیں کہیں مجمل طور پر بہت سے واقعات کی طرف ایک ساتھ اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ عنکبوت رکوع ۴ میں قوم لوح۔ قوم لوط۔ سکان مدین (یعنی قوم شعیب) قوم عاد (جس میں حضرت ہود پیغمبر مبعوث ہوئے) قوم ثمود (جس میں حضرت صالح پیغمبر مبعوث ہوئے تھے) قارون۔ فرعون۔ ہامان کی تباہیوں کا بالاجمال ذکر کرکے خدا فرماتا ہے کہ " خدا ان پر ظلم نہ کرتا لیکن یہ تو خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔ کہ اللہ کے سوا دوسروں کو کارساز سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کی مثال مکڑی کی سی تھی کہ وہ بھی ایک گھر بنا لیتی ہے اور اسے اپنے پندار میں بڑا مضبوط جانتی ہے حالانکہ وہ سب کے گھروں سے بودا ہے۔ کاش یہ اتنا ہی سمجھتے " وماکان اللہ لیظلمہم ولکن کانوا انفسہم یظلمون مثل الذین اتخذو من دون اللہ اولیاء کمثل العنکبوت اتخذت بیتاً وان اوہن البیوت لبیت العنکبوت

لو کانوا یعلمون۔

ہم چاہتے ہیں کہ چند بڑے بڑے قصے جو قرآن میں کسی قدر صراحت کے ساتھ مذکور ہیں یہاں بیان کریں۔ لیکن قصہ شروع کرنے سے قبل یہ کہنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ یہ قصے ناول نہیں ہیں کہ شروع سے اخیر تک ایک بات واقعہ کے مطابق نہ ہو مگر قوم کے موجودہ مزاج سے اس درجہ قریب ہو کہ کسی طرح کذب کا گمان بھی نہ ہو سکے۔ بلکہ یہ قرآن پاک کے قصے ہیں جن میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں ہے۔ مگر واقعات اتنے پرانے ہیں کہ ہماری تاریخی معلومات سے انکی تائید نہیں ہو سکتی بلکہ بعض بعض قصہ تو اس زمانے کے ہیں جب معاشرت انسانی اپنی نوعیت میں موجودہ معاشرت سے بالکل علیحٰدہ تھی اور اس وقت کے قانون قدرت سمجھنے کے لئے ہماری عقلیں اسی طرح ناکافی ہیں جس طرح اور بہت سے راز فطرت کے سمجھنے سے ہم قاصر ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ لاتبدیل فی فطرت اللہ" قانون قدرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی ہو جب بھی ہم کسی امر کو موجودہ حالت پر نظر کر کے مافوق العادۃ نہیں کہہ سکتے۔ وہی آفتاب جو صبح کو اپنی دھیمی حرارت سے لطف بخشتا ہے دوپہر کو اسکی گرمی دماغ پریشان کر دیتی ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ بدر خلقت آدم میں بہت سی باتیں فطرتاً مطابق عادت ہوں اور اب مافوق العادۃ ہو گئی ہوں اور وجود کے سمجھنے سے ہماری قوت مدرکہ اور متخیلہ اس وقت قاصر ہو۔

حضرت آدمؑ کی پیدائش پر غور کیجئے۔ آج کوئی عالم یا کوئی حکیم علوم جدید یا علوم قدیمہ کی برکت سے ایسا ذی وقوف نہیں ہے جو یقینی طور پر کسی کو یہ سمجھا دے کہ انسانی سلسلہ توالد و تناسل پیدا ہونے کے قبل ایک مرد اور ایک عورت کا جوڑا کیسے بن گیا۔ جب قطعی طور پر کوئی دوسری صورت بیان نہیں کی جا سکتی تو کیوں ہم قصہ قرآنی کو گو وہ کیسا ہی مافوق العادۃ ہو باور نہ کریں۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ تمام آسمانی کتابیں ایسا ہی کہتی چلی آئی ہیں۔ اب جب آدم کی پیدائش کو ہم اپنے موجودہ علم کے ذریعہ سے معلوم نہ کر سکے تو آدم کے زمانے میں یا انکے قریب زمانے کی باتیں جو مافوق العادۃ بیان کی جاتی ہیں ان کو ہم کیوں غلط مانیں۔ مثلاً حضرت سلیمانؑ کی نسبت مذکور ہے کہ وہ جانوروں کی بولی سمجھتے تھے۔ کیا بعید ہے کہ اس وقت انسان میں جانوروں کی بولی سمجھنے کی قوت موجود ہو اور حضرت سلیمانؑ میں وہ قوت نسبتہً زیادہ ہے اور اب بھی تو یہ قوت انسان میں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ ایک کتے کو دیکھ کر دوسرا کتا بھونکتا ہے یا گھوڑا دانے کے وقت بولتا ہے۔ بلی کھانے کے سامنے بیٹھ کر میاؤں میاؤں کرتی ہے اور

انسان سمجھ جاتا ہے کہ کس غرض سے یہ آواز جانور کے منہ سے نکلی۔ بطور مذاق کے کہا جاسکتا ہے کہ ڈارون تھیوری کے مطابق جب رفتہ رفتہ بندر سے آدمی بنا ہے تو بندر کی خو بو بھی رفتہ رفتہ بدل گئی۔ ممکن ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے وقت تک جانور کی بولی سمجھنے کی قابلیت جو بوجہ ہم جنسی کے شروع شروع انسان میں تھی اس میں زائد تر تغیر نہ آیا ہو۔ بہرحال جتنے قصے قرآن کے ہیں وہ سب سچ ہیں۔ زیادہ آسانی تو اس میں ہے کہ اس وقت کا طرز معاشرت جداگانہ مان لیا جائے یا فطرت کی جانب سے زائد تر دست اندازی اسوقت کی ماندوبود میں ضروری سمجھی جائے یا اگر کسی طرح موجودہ فلسفہ سے الگ ہونا گوارا نہ ہو تو لسان تمثیلی سے مدد لی جائے خدا کو صرف فلاسفہ کے لئے قرآن کا نازل کرنا مقصود نہ تھا۔ کل عالم کے لئے اسکو اترنا تھا جس میں عرب کے بدو ایسے ناتربیت یافتہ لوگ زائد تر تھے۔ دو قرآن ایک عالم کے لئے اور ایک جاہل کے لئے ہوتا تو غرض فوت ہوتی اس لئے ایک ہی کتاب سے دونوں کو سمجھانا مناسب تھا۔ فلاسفہ کے لئے جو قرآن اترتا اسکو جہلا کبھی نہ سمجھتے۔ لیکن جہلا کے لئے جو اترا وہ عقلا بھی سمجھ سکتے ہیں اور اس لئے یہ پرداز اختیار کیا گیا جواب ہے۔ آنکھوں میں بصارت اور کانوں میں سماعت ہو تو ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے قرآن چراغ ہدایت ہو سکتا ہے۔ تربیت یافتہ کی بھی تشفی کرتا ہے اور ناتربیت یافتہ بھی اس سے ہدایت پاتے ہیں۔

ابوالبشر آدم

حضرت آدم کا ذکر قرآن میں کئی جگہ پر ہے۔ از قسم انسان سب سے پہلے یہی دنیا میں آئے اور ان کے بعد حوا ان کی بیوی آئیں۔ خلقت انسان انھیں دونوں سے شروع ہوئی۔ تعلیم جو اس قصہ سے کی گئی ہے اپنی نوعیت میں وہ لاجواب ہے۔

۱۔ عزازیل ایسا مقرب فرشتہ اپنی نخوت کی وجہ سے شیطان ہو کر مارا مارا پھرتا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ نخوت کو بری بلا سمجھے۔

۲۔ شیطان موروثی دشمن انسان کا ہے اس کے ورغلانے سے برے افعال کرنا بے دانشی ہے۔ نفس امارہ کو دشمن موروثی قرار دینا اور یوں اس سے ڈرنا نہایت اچھا طرز بیان کا ہے۔

بعض ایسے گمراہ حضرات ہیں جو سائنس کی چند جھوٹی سچی کتاب پڑھ کر اپنی معلومات کو قرآن سے زائد باوقعت سمجھتے ہیں۔ گمراہ کا لفظ ہم نے بہت برے معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے ہمارے

نزدیک وہ حضرات گمراہ کہے جانے کے مزور سزاوار ہیں جو راز فطرت کے دریافت کرنے میں اپنا عزیز وقت ضائع کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے حواس اس کام کے لئے نہیں بنائے گئے ہیں ہمارے نزدیک تو فطرت انسانی نے جن اسرار کو ہم سے پوشیدہ رکھا ہے انکی نسبت عقلی گھوڑے دوڑانے میں قانون فطرت کے ساتھ بے ادبی لازم آتی ہے۔ خدا کہتا ہے کہ ہم تم سے چھپائیں گے اور تم کہتے ہو کہ ہم خواہ مخواہ دریافت کریں گے آج تک ایک نے بھی قابل اطمینان کامیابی حاصل نہیں کی لیکن پھر بھی تم ضد پر قائم ہو تو یہ کیا حرکت ہے اچھا بے ادبی نہ سہی مالیخولیا تو مزور ہے گمراہی نہیں تو گمراہی کا مقدمہ تو ہے۔ حافظ شیرازی نے کیا خوب لکھا ہے۔

حدیث از مطرب و می گو و راز دہر کمتر جو !

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمار

بہر حال ہم کہتے ہیں کہ ان گمراہوں کی تسکین خاطر بھی قرآن سے ہو سکتی ہے اور ہم اس کو بھی قرآن کا ایک معجزہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہر درجہ کے لوگوں کی سمجھ کے مطابق ہیں۔

قصہ جو قرآن میں متعدد مقامات پر درج ہے یوں مسلسل بیان کیا جاتا ہے۔

خدا نے سڑی ہوئی کیچڑ سے جو گویا آگ میں پکی ہوئی کے مثل گرم ہو رہی تھی۔ آدم کو اور اس کی ساتھی حوا کو پیدا کیا۔ پھر ان کو اس صورت موجودہ پر بنایا۔ فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو سب نے سجدہ کیا مگر شیطان نے سرکشی کی خدا کے حکم کو نہ مانا اور سجدہ نہ کیا۔ خدا نے اس سے پوچھا کہ تو نے سجدہ کیوں نہ کیا۔ اس نے کہا کہ میں آدم سے افضل ہوں تو نے مجھے آگ سے بنایا ہے اور آدم کو مٹی سے بنایا ہے۔ خدا نے کہا جا دور ہو تو فرشتوں میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اس نے کہا مجھے قیامت تک ایسا ہی رہنے دو۔ تمہیں نے مجھے بہکایا ہے میں بھی انسان کو بہکاتا رہوں گا۔ خدا نے کہا دور ہو اے مردود جو لوگ تیری تبعیت کریں گے میں ان سے دوزخ بھر دوں گا۔ خدا نے آدم کو سمجھایا کہ شیطان تمہارا پکا دشمن ہے اس سے خبردار رہنا۔ پھر ان کو بہشت میں رکھا جہاں کہ ان کو بھوک تھی نہ پیاس تھی نہ دھوپ لگتی تھی اور نہ کپڑے کی حاجت تھی۔ خدا نے کہا جو کچھ چاہو کھاؤ مگر فلاں درخت کے پاس نہ جانا اگر جاؤ گے تو آپ اپنے لئے برا کرو گے۔ شیطان نے ان کو بہکایا اور کہا کہ میں تم کو ہمیشگی کا اور ہمیشہ رہنے والی بادشاہت کا درخت بتاتا ہوں اور پھر وہی درخت بتایا جس سے خدا نے منع کیا تھا اور کہا کہ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ تم اس سے اس لئے منع کئے گئے ہو کہ تم فرشتہ اور ہمیشہ

رہنے والے نہ ہو جاؤ۔ شیطان کے بہکانے میں وہ آ گئے اور درخت ممنوعہ میں سے کچھ کھا لیا اس کے کھانے سے جو نادانی کا پردہ تھا ان پر سے اٹھ گیا۔ عیب و ثواب معلوم ہونے لگا انکی برہنگی ان کو شرمانے لگی اور درخت کے پتوں سے وہ اپنی شرمگاہیں چھپانے لگے۔ خدا نے کہا کہ اس درخت کے کھانے سے میں نے تم کو منع کر دیا تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا پکا دشمن ہے چلو یہاں سے جاؤ۔ تم اب جہاں رہو گے ایک دوسرے کے دشمن ہو کر رہو گے کچھ مدت تک زمین پر رہو گے وہیں مرو گے اور وہیں سے نکلو گے۔ آدم نے خدا کی ہدایت کے موافق اپنے قصور کی معافی اس طرح چاہی کہ "اے ہمارے خدا ہم نے خود پر ظلم کیا اگر تو معاف نہ کرے گا اور رحم نہ کرے گا تو ہم آفت میں رہیں گے" خدا نے معاف کر دیا اور یہ بتایا کہ تمہارے پاس میری ہدایت آئے گی جو کوئی اسے مانے گا وہ بے خوف ہو گا اور جو کوئی نہ مانے گا دوزخ میں جائے گا اور ہمیشہ اسی میں رہے گا۔ خدا نے آدم کو زمین پر اپنا نائب بنایا۔ فرشتوں نے کہا کہ ایسے شخص کو تو نیابت دیتا ہے جو فساد کریں گے اور خون بہائیں گے۔ ہم پاکیزگی کے ساتھ تجھے یاد کرتے ہیں اور تیری تعریف کرتے ہیں۔ خدا نے کہا میں سب کچھ جانتا ہوں۔ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ پھر خدا نے آدم کو سب چیزوں کے نام بتائے اور فرشتوں کے سامنے کیا اور کہا کہ تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا کہ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہم کو بتایا ہے اس سے زیادہ نہیں جانتے پھر خدا نے آدم سے پوچھا۔ آدم نے سب کچھ بتا دیا۔

ضرورت سے زیادہ عقل رکھنے والوں کے سمجھانے کے لئے مفصلہ ذیل سطریں لکھی جاتی ہیں۔

خدا نے اس تمام قصے میں یہ نہیں بتایا ہے کہ سڑی ہوئی گرم کیچڑ سے خدا نے آدم اور حوا کو کیونکر پیدا کیا ایک دم سے پیدا کیا یا بتدریج پیدا کیا اگر بتدریج جامہ انسانی میں آنا ڈارون تھیوری کے مطابق مانا جائے تو قرآن سے نہ اسکی تصدیق ہوتی ہے نہ اس کی تردید ہوتی ہے لیکن خدا نے یہ اشارہ کیا ہے کہ ہم نے پیدا کیا پھر صورت بنائی (لقد خلقنا کم ثم صورنا کم) اس کا یہ منشا رہو سکتا ہے کہ انسان نطفہ میں نہایت باریک بھنگہ کی مانند پیدا ہوتا ہے پھر اس کی صورت بنتی ہے اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ انسان کا کالبد بھی مثل اور تمام چیزوں کے انھیں چھوٹے چھوٹے ذروں سے بنتا ہے جو دنیا میں پہلے سے پیدا ہیں۔ صوفیان کرام یہ معنی لگاتے

ہیں کہ روح انسانی جو ایک خاص پرتو ہے ذات باری کا پہلے سے موجود تھی صورت انسانی میں وہ بعد کو آئی۔

دنیا کی تمام چیزیں ایسی ہیں کہ جب باہم ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو ان میں کیمیائی امتزاج ہو کر ایک نیا مزاج پیدا ہوتا ہے انسان میں خدا نے اچھی اور بری دونوں قوتیں پیدا کی ہیں اور یہ قدرت خدا کی ہے کہ انسان ایسے معجون مرکب ہیں۔ دونوں قوتوں کا مزاج الگ الگ قائم ہے ان دونوں قوتوں میں سے قوت خیر کو فرشتہ اور قوت شر کو شیطان کہیں تو خلاف قرآن نہیں ہو سکتا۔ معلوم رہے کہ قرآن لسان تمثیلی میں نازل ہوا ہے تاکہ اس کے مضامین بدوؤں سے لے کر سقراط اور بقراط کے درجہ والوں تک کی سمجھ میں بخوبی آ جائیں ہر علم کی اصطلاحات خاص ہوتی ہیں۔ اصطلاح مذہب میں قوت خیر کو فرشتہ اور قوت شر کو شیطان مان لینے سے مضمون بہت عام فہم ہو جاتا ہے اسی طرح بعض احادیث میں جو بیان ہوا ہے کہ رحم میں فرشتہ انسان کی صورت بناتا ہے تو یہاں فرشتہ سے ایک خاص قسم کی قوت مصورہ مراد ہے۔

فرشتہ یعنی قوت ملکی کا آدم کو سجدہ کرنا اور شیطان یعنی قوت شر کی سرکشی اس سے یہ مطلب ہے کہ قوت ملکوتی جو انسان میں ہے وہ اس کی مطیع ہے اور قوت شیطانی بارہا، اطاعت سے انکار کرتی ہے انسان جب کوئی اچھا کام کرنا چاہتا ہے تو اس کو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اس وقت تمام قوتیں انسان کی انسان کے تابع ہوتی ہیں اور جب وہ اس قوت کو حرکت دینا چاہتا ہے جو نیکی کی مخرج ہے تو فی الفور وہ حرکت میں آتی ہے اور انسان سے نیکی، رحم، محبت، ہمدردی اور حمیت ظہور میں آتی ہے اور اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام قوتیں جو ان چیزوں کی منشا ہیں سجدہ کر رہی ہیں لیکن اس کے برخلاف حالت اس قوت کی ہے جو بدی اور گناہ کی مخرج ہے لوگ ان افعال کو جو اس قوت سے پیدا ہوتے ہیں برا جانتے ہیں اور ان کو نہ کرنے کا ارادہ کرتے ہیں اور پھر کرتے جاتے ہیں۔ لوگ جھوٹ کو برا سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ منہ سے نہ بولیں۔ مگر منہ سے نکل ہی جاتا ہے۔ غصہ کو برا جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ نہ کریں لیکن وقت پر طبیعت بے قابو ہو جاتی ہے۔ زنا سب سے بری چیز ہے۔ زنا کے بعد لوگ خود پر لعنت کرتے ہیں اور پکا ارادہ کرتے ہیں کہ نہ کریں گے اور پھر کرتے ہیں۔ غرض کہ وہ قوت جو تمام بدیوں کی جڑ ہے

نہایت ہی سرکش اور نافرماں بردار ہے۔

شیطان نے جو خدا سے کہا کہ تو ہی نے مجھے بہکایا ہے میں بھی انسان کو بہکاتا رہوں گا اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا ہی نے قوت سرکش پیدا کی ہے اور سرکش قوت ہمیشہ سرکشی پر مائل رہے گی۔ یہ جبر و اختیار کا مسئلہ ہے۔ مفصل بیان اس کا "جبر و اختیار" فصل ۲۵ میں ہے بے شک خدا نے دونوں قوتیں پیدا کی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم کو عقل دی ہے کہ قوت سرکش کو ہم دبائیں اور اپنے افعال پر ہم کو طاقت دی ہے کہ جب چاہیں ہم ہاتھ ہلائیں اور جب چاہیں نہ ہلائیں جب چاہیں ہم چلیں اور جب چاہیں نہ چلیں۔ بولنے اور نہ بولنے پر ہم کو قدرت ہے دیکھنے یا نہ دیکھنے پر ہم کو پورا اختیار ہے۔

شیطان جب ایک قوت انسان کا نام ٹھہرا تو وہ فرشتوں میں شامل کیا گیا اور جب اس کا سرکش ہونا بتایا گیا تو وہ ان میں سے علیحدہ کر کے شیطان بتایا گیا یہی اس کا مردود ہونا اور فرشتوں سے علیحدہ کیا جانا ہے۔ رہا آگ سے اس کا مخلوق ہونا اس کا مطلب یہ ہے کہ قوائے انسانی میں حرارت غریزی (مادہ الکٹرسٹی) ضرور پایا جاتا ہے اس تمام حرارت کا سرجوش قوتِ سرکش ہے جسے شیطان کہتے ہیں۔ وہ قوت سب سے اوپر ہے اور تمام قوتیں اس سے نیچے ہیں۔ اسی لئے اس کی خلقت آگ سے اور بقیہ قوتوں کی خلقت مٹی سے کی گئی ہے۔

رہا "درخت ممنوعہ" اس کے معنی بھی تمام مضامین پر نظر کرنے سے سمجھ میں آ جاتے ہیں انسان کے ہوش سنبھالنے کو جس طرح زبان حکما میں بالغ ہونا اور زبان شرع میں مکلف ہونا کہتے ہیں اسی طرح انبیاء کی زبان میں شجرۂ ممنوعہ کا کھانا یا چکھنا کہتے ہیں۔ اب یہ مضمون کہ جب انسان پیدا ہوا تو وہ بلوغ تک پہنچے گا آدم کو اس درخت کے کھانے سے منع کرنا اور پھر اس کو آدم کا کھانا اور خدا کی نافرمانی کر کے گنہگار ہونا اس کا مطلب ذرا ٹیڑھا ہے۔ جبر و اختیار کا یہ دوسرا مسئلہ ہے اور اس کے متعلق راویوں میں اختلاف ہے۔ بعض خیال کرتے ہیں کہ انسان اپنے افعال میں بالکل مجبور ہے بعض خیال کرتے ہیں کہ وہ بالکل مختار ہے بعض سمجھتے ہیں کہ وہ جزاً مجبور اور جزاً مختار ہے۔ ممکن ہے کہ یہاں یہ بتایا گیا ہو کہ انسان بالکل مجبور ہے اچھا یا برا وہ پیدا ہوتا ہے۔

السعید من سعد فی بطن امہ والشقی من شقی فی بطن امہ

نہایت سچا قول ہے۔ برا کام کرنا گو برا ہے لیکن انسان ضرور اس حدتک وہاں پہنچتا ہے جہاں تک برائی اس کے ساتھ مخلوق ہے اور برائی کرنے سے وہ خدا کی نافرمانی کر کے گنہگار بھی ضرور ہوتا ہے لیکن یہ تمام برائیاں اس کی خدا معاف کر دیتا ہے۔ اگر وہ اپنی تمام قوتوں کو بحصہ رسدی کام میں لائے یعنی قوائے ملکیہ کو جو اس میں کمزور حالت میں ہے اسے بیکار نہ چھوڑے۔ قوائے ملکیہ کو کام میں نہ لانے کو زبان انبیاء میں توبہ کہتے ہیں اور اسی کو شارع نے کہا ہے (التائب من الذنب کمن لاذنب لہ) یہ مشکل اور باریک مسئلہ اس عام فہم طریقہ سے یوں ادا کیا گیا کہ آدم کو درخت ممنوعہ کے کھانے سے خدا نے روکا لیکن آدم نے کھالیا اور اس نافرمانی کی وجہ سے گنہگار ہوا۔ بعدازاں آدم اپنی قوت ملکوتی کو کام میں لائے اور دعا کی کہ اے ہمارے خدا ہم نے خود پر ظلم کیا اگر تو معاف نہ کرے گا اور رحم نہ کرے گا تو ہم آفت میں رہیں گے آدم کے پچھتانے اور معافی مانگنے پر خدا نے انکی خطا معاف کر دی۔ اور اگر شجرہ ممنوعہ کھانے سے عام برائیوں کا ارتکاب مراد ہو جب بھی معنی صاف رہتے ہیں۔ آدم کو ان کے قوائے شیطانی نے قوائے شر کو کام میں لانے کی ترغیب دی اور گنہگار ہوئے اور پھر پچھتانے لگے تو خدا نے معاف کیا اور یہی توبہ کرنا اور معاف کرنا کہلاتا ہے۔

آدم کا زمین پر نائب ہونا صریح ظاہر ہے کہ سب سے زبردست مخلوق بنی نوع انسانی ہیں اور فرشتوں کا تکرار کرنا یہ از قسم خطابیات ہے۔ تمام قویٰ وہی کام کرتے ہیں جس کے لئے وہ مخلوق ہیں۔ مگر انسان ہی ایسی مخلوق ہے کہ وہ نیکی بھی کرتا ہے اور بدی بھی کرتا ہے۔ خدا نے گویا انسان کی حقیقت بیان کر دی ہے کہ وہ بڑے بڑے گناہ کرتا ہے لیکن وہ قابل تعلیم اور قابل اصلاح ہے اس لئے وہ نائب کیا جاتا ہے۔ خدا نے آدم کو تمام چیزوں کے نام بتائے۔ نام بتانے سے اس ملکہ کا علم انسان میں ودیعت کرتا ہے جس سے انسان بقدر اپنی طاقت کے کارخانہ قدرت پر غور کر سکتے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ انسان کو خدا نے سب کے نام ہی بتائے ہیں (وعلم آدم الاسماء کلہا) حقیقت ایک چیز کی بھی نہیں بتائی۔ جیسا کہ بڑے بڑے علما کے قول سے ظاہر ہے کہ وہ جتنا ہی غور کرتے ہیں اتنا ہی خود کو حقائق عالم سے بے خبر پاتے ہیں۔

حضرت نوح

ان کو آدم ثانی بھی کہتے ہیں اس لئے کہ ان کے وقت میں اکثر ذی روح طوفان نوح میں ہلاک ہو گئے تھے اور پھر ان سے اور نیز ان کے ساتھیوں سے نسل بڑھی۔ قرآن میں یہ قصہ یوں مذکور ہے کہ حضرت نوح کے زمانے میں گمراہی بہت بڑھ گئی تھی۔ حضرت نوح نے لوگوں کو بہت سمجھایا بجائے شکر گزار ہونے کے لوگ ان کے دشمن ہو گئے۔ کسی نے ان کا کہنا نہ مانا۔ حتیٰ کہ ان کا ایک لڑکا بھی ان سے جدا ہو گیا۔ بالآخر ایک سوتے سے جس کو تنور سے تعبیر کیا ہے لیکن یہ صاف نہیں لکھا ہے کہ تنور سے کیا مراد ہے۔ پانی نکلنا شروع ہوا۔ حضرت نوحؑ کو پہلے سے خیال تھا اور انھوں نے ایک کشتی بنا رکھی تھی اپنے ساتھیوں کو اس پر سوار کر لیا اور جانوروں کے جوڑے بھی رکھ لئے۔ تمام خلقت ڈوب گئی لیکن حضرت نوحؑ مع اپنے ساتھیوں کے صحیح و سلامت رہے۔

ذوالقرنین

قرآن میں ذوالقرنین کا قصہ ہے۔ لیکن ٹھیک پتہ نہیں لگتا کہ ذوالقرنین سے کیا مراد ہے غالباً یہ لقب اس بادشاہ کا ہے جس کا قصہ ہے۔ حضرت عیسیٰ سے کچھ ہی پہلے سکندر یونانی نے مشرق سے مغرب تک یعنی یونان سے ہندوستان تک فتح کر ڈالا تھا۔ اس کا پتہ سب کو معلوم تھا اور قرآن میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے اس نے بھی مشرق سے مغرب تک فتح کیا تھا۔ سکندر کے حالات پڑھ کر مسلمان سمجھے کہ ذوالقرنین سے وہی سکندر مراد ہے جو یونانی ہے۔ اس وقت کے مسلمان جغرافیہ ارض سے اس قدر واقف نہ تھے جتنا کہ اب نئی تحقیقات سے دریافت ہوا ہے اور اس لئے وہ ٹھیک مفہوم قرآن کا نہ سمجھ سکے اب تحقیقات جدید کے بعد قرآن کے معنی ٹھیک لگائے جائیں تو ذوالقرنین کوئی دوسرا شخص ٹھہرے گا اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں بالکل سنے سنائے قصے نہیں ہیں بلکہ ایسی باتیں کہی ہیں جو اس وقت کے لوگوں کو معلوم نہ تھیں۔ صرف پیغمبر کو اس خاص فیضان الٰہی کے ذریعہ سے معلوم ہوئیں جس کا دوسرا نام رسالت ہے۔

قرآن میں مذکور ہے کہ ذوالقرنین کو خدا نے بہت بڑھایا اور پچھم کی جانب وہ بڑھتے بڑھتے ایسے مقام پر پہنچا جہاں سیاہ کیچڑ کے کنڈل میں آفتاب غروب ہو جاتا ہے اور پھر

پورب کی طرف بڑھتے بڑھتے ایسے مقام پر پہنچا جہاں لوگ جانوروں کی طرح بسر کرتے تھے ستر عورت بھی کسی چیز سے چھپاتے نہ تھے۔ قرآن میں یہ بھی مذکور ہے کہ ذوالقرنین اُتر جاتے جاتے ایک قوم کے پاس پہنچا جو اپنے ہمسایہ شمالی سے نہایت تنگ تھی۔ قرآن میں یہ شمالی قوم یاجوج اور ماجوج کے نام سے ذکر کی گئی ہے۔ اور یہ مذکور ہے کہ ان شمالی وحشیوں کا حملہ بچانے کے لئے دیوار تاتار ذوالقرنین نے بنائی تھی۔ دیوار تاتار دنیا میں صنعت انسانی کی نہایت مستقل یادگار رہے۔ اس قصہ کے ذکر کرنے کی غایت یہ ہے کہ اپنی صنعت اور ہمت پر ناز کرنے والے سلاطین سمجھیں کہ خدا نے دنیا میں ایسا بادشاہ بھی پیدا کیا تھا جو دیوار تاتار ایسی مستحکم یادگار چھوڑ گیا جسکی ثانی اس وقت بنا نا محال ہے مشرقی وحشیوں سے چین کے ساحل شرقی کے باشندے مراد ہوں جہاں تہذیب بہت دنوں کے بعد پہنچی اور مغرب میں سیاہ کیچڑ کے کنڈل سے بحر اسود سمجھا جائے تو ذوالقرنین کسی ایسے ملک کا بادشاہ ٹھہرتا ہے جسکے شمال میں دیوار تاتار اور پچھم بحر اسود رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترکستان ۔ چینی تاتار اور چین خاص میں کوئی شہنشاہ اگلے زمانے میں ایسا زبردست گزرا ہے جس کے حکم سے دیوار تاتار بنائی گئی تھی اور تاریخ کی پرانی کتابوں سے بھی کچھ کچھ پتہ لگتا ہے کہ اگلے زمانے میں ایک بادشاہ ایسا گزرا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ

ان کا لقب خلیل اللہ ہے۔ ان کا تذکرہ بھی قرآن میں ہے اور مختلف جگہوں پر ہے کفار عرب اور یہودیان شام انھیں کی نسل سے تھے اس لئے قرآن میں انکے ذکر کی زائد ضرورت تھی لوگوں کو یہ سمجھانا تھا کہ اگر باپ دادا ہی کے دین پر رہنے کے لئے وہ حریص ہیں تو ابراہیم کے دین پر چلیں کہ وہ بھی اجداد میں ہیں۔ گمراہ آباؤ اجداد کے طریقے اختیار نہ کریں۔

حضرت ابراہیم کے باپ آذر بت فروش اور مقرب سلطان تھے۔ بادشاہ بھی بت پرست تھا۔ حضرت ابراہیم کے عرفان کی کیفیت قرآن میں یوں لکھی گئی ہے کہ یہ اپنے طریقہ آبائی یعنی بت پرستی سے متنفر تھے اور اس کو عقلاً برا سمجھتے تھے۔ ایک روز چاند نکلا تو اس کی پیاری پیاری صورت دیکھ کر یہ سمجھے کہ بت کی جگہ اسی کو خدا کیوں نہ سمجھیں پھر اتنے میں رات گذری دن آیا۔ آفتاب کی روشنی سب پر غالب ہوئی تو کہنے لگے کہ یہ تو بڑا زبردست معلوم ہوتا ہے۔ یہی خالق عالم ہوگا۔ پھر وہ بھی شام کو چھپ گیا تو کہنے لگے کہ خالق عالم کوئی دوسری

ہی قوت ہے جو پردہ میں بیٹھی ہوئی تماشہ دکھا رہی ہے اسی کو خالق سمجھنا چاہیئے۔ جب وہ اس پر خوب اچھی طرح قائم ہو لئے تو نور ایمان روز بروز ان میں بڑھنے لگا۔

ایک روز حضرت ابراہیم نے موقع پاکر تمام چھوٹے چھوٹے بت توڑ ڈالے اور جو سب سے بڑا تھا اس کو رہنے دیا۔ گھر والوں نے آکر پوچھا کہ کیا ہے۔ حضرت ابراہیم نے کہا کہ بڑے بت سے پوچھو۔ وہ سب سے بڑا ہے وہی جانتا ہوگا یا اسی نے یہ سب کچھ کیا ہوگا۔ لوگوں نے ابراہیم سے کہا اس پتھر سے کیا پوچھیں بھلا یہ بولنا جانتا ہے یا کچھ کرنے کی قدرت رکھتا ہے؟ ابراہیم نے کہا کہ پھر اسکی پرستش کیوں کرتے ہو۔ سب نے ابراہیم کو زندہ آگ میں ڈالنا چاہا کہ اس وقت سب سے سنگین یہی سزا تھی۔ حضرت ابراہیم کو خدا نے اس آفت سے بچایا۔ بچنے کی صورت زیادہ تفصیل سے نہیں بیان کی گئی ہے۔ قرآن میں صرف اتنا بیان ہے کہ خدا نے آگ سے کہا کہ "ٹھنڈی ہو جا"۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں: "ہم نے حکم دیا کہ اے آگ ابراہیم کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی کی موجب ہو جا" الانبیاء رکوع ۵۔ مفسروں نے لکھا ہے کہ آگ بالکل ٹھنڈی ہو گئی اور حضرت ابراہیم صحیح و سالم اس میں سے نکل آئے۔ ہم مسلمان ہیں اور ہم کو اس کے سچ ہونے میں شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ اگر خدا چاہے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قانون قدرت کو خدا نہیں توڑتا تو وہ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ خدا نے آگ سے ان کو کسی طرح بچا لیا جلنے کی نوبت نہیں آئی۔ دیکھئے کفار مکہ نے جب آنحضرت محمدؐ کے قتل کے لئے آنحضرتؐ کے گھر کا محاصرہ کیا تھا تو اپنی جگہ پر آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو سلا دیا تھا اور خود مدینہ چلے گئے تھے۔ یہ بھی تو خدا کا بچانا ہی تھا کہ تمام مکہ کے لوگ ایک شخص کے مار ڈالنے پر تلے ہوئے تھے اور وہ بچ کر چلا گیا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم بھی کسی طور سے بچ گئے ہوں گے۔ خدا نے اگر اس کو یوں کہا کہ ہم نے آگ کو حکم دیا کہ بجھ جائے تو مجازاً ایسا کہنا درست ہے۔ پرانے قصے قرآن میں محض اشارہ اور کنایہ کے طور پر بیان کئے جاتے ہیں کیونکہ مقصود اصلی ہوتا ہے نصیحت کرنا نہ کہ قصہ بیان کرنا۔ قرآن کی فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے قرآن کا طرز بیان بھی ایک خاص قسم کا ہے خدا نے اگر آگ سے کہا کہ ٹھنڈی ہو جا تو ماحصل یہی ہوا کہ خدا نے ابراہیم کو آگ میں جلنے نہیں دیا ظاہری الفاظ کی پوری پوری پیروی کرنے کو تو کوئی بھی نہیں کہتا۔ یعنی یہ کسی کا خیال نہیں ہے کہ جس طرح ایک طرف لوگ حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالنے کے لئے کھڑے تھے اسی طرح خدا دوسری طرف کھڑا اپنی زبان سے آگ کو حکم دے رہا تھا کہ ٹھنڈی ہو جا۔ جس طرح کہنے کے مجازی معنی

لئے جائیں گے کہ زبان سے کہنا مقصود نہیں ہے اسی طرح آگ کا ٹھنڈا ہو جانا بھی یہ مفہوم رکھ سکتا ہے کہ آگ میں حضرت ابراہیم جلنے نہ پائے بلکہ آگ تک پہنچنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ تدبیر سے بچ گئے اس بچانے کو خدا سورہ عنکبوت کے رکوع ۳۔ اور طور سے بیان کرتا ہے " قوم کے پاس حضرت ابراہیم کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا بجز اس کے کہ انھوں نے کہا کہ اسے مار ڈالا جائے یا جلا دینا چاہیئے۔ لیکن اللہ نے اسے آگ سے بچا لیا " قرآن کے قصے زیادہ تر وہ ہیں جن کو لوگ پہلے سے جانتے تھے۔ ان قصوں کو یاد دلا کر لوگوں کو اسلام کی ترغیب دینے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے طرز بیان جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کچھ تو لسان تمثیلی کی رعایت سے ہے اور کچھ فصاحت کلام کے لحاظ سے ہے اس وقت کے مفسروں کو ملکی اور اخلاقی امور کی طرف زائد توجہ تھی۔ دوسرے علوم و فنون کی طرف متوجہ ہونے کی نہ ضرورت تھی اور نہ موقع تھا۔ اس لئے وہ سیدھے سیدھے طور پر قصہ کی تعبیر مشہور و معروف طریقے سے کرتے گئے دوسرے طور پر سمجھنے کی تو ضرورت اس وقت ہوئی جب اور علوم کی طرف بھی مسلمانوں کو توجہ ہوئی یا اور علوم جاننے والوں کے ساکت کرنے کی ضرورت ہوئی۔ قرآن کا معجزہ ہے کہ جس طرح اسکو سمجھو ٹھیک ہوتا ہے۔ جنگلی آدمیوں کو بھی وہ سمجھا سکتا ہے اور فلاسفۂ وقت کو بھی تسکین دے سکتا ہے۔

ابراہیم کو اپنے وطن یعنی زمین بابل سے آ کر شام میں آباد ہونا پڑا۔ شام سے وہ مصر بھی گئے تھے مکہ میں خانہ کعبہ انھیں کی تعمیر ہے لیکن بیان یوں کیا جاتا ہے کہ پہلے بھی یہاں ایک عبادت خانہ تھا اور ابتدائے خلقت آدم سے تھا جو منہدم ہو گیا تھا۔

حضرت ابراہیم بہت بوڑھے ہو گئے تھے اور کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک دن فرشتوں نے کہا کہ آپ کے اولاد پیدا ہو گی۔ حضرت ابراہیم اور انکی بیوی کو حیرت ہوئی کہ پیرانہ سالی میں اولاد کیسے ہو گی لیکن خدا نے اولاد دی ایک بیوی سے حضرت اسحق اور دوسری سے حضرت اسمٰعیل ہوئے کبر سنی میں اولاد کا پیدا ہونا ایک غیر معمولی بات تھی اس لئے خدا اس کا ذکر کر کے اپنی قدرت دکھاتا ہے فرشتوں کا مژدہ دینا بھی ہمارے نزدیک مستبعد نہیں ہے ابتدائے عالم میں جب کچھ نہیں سے سب کچھ ہوا قانون قدرت کا طرز بھی موجودہ حالت سے ضرور ہی جدا ہو گا لیکن اس کو نہ ماننے والے اگر صرف اتنی ہی بات پر دین اسلام سے الگ ہوئے جاتے ہیں تو ہم ان کو یوں بھی سمجھا سکتے ہیں کہ ہر ایک انسان میں جو قوت ملکوتی یا قوت شیطانی دی گئی ہے اسی کی طرف یہاں بھی اشارہ ہے یعنی ابراہیم میں جو ملکوتی قوت تھی اس کے ذریعہ سے ان کو اور انکی بیوی کو آثار

معلوم ہوئے کہ لڑکا پیدا ہونے والا ہے اور ان کو سخت تعجب ہوا کہ اس کبرسنی میں یہ محض شان خدا ہے کہ جوانی میں یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوئی اور اب ناامیدی کی حالت میں امید قائم ہوئی۔

لڑکا اور وہ بھی بڑھاپے کا لڑکا۔ حضرت ابراہیم کو حضرت اسحٰق سے بے حد انس تھا خدا کو اپنے خلیل کی آزمائش منظور ہوئی اور حکم دیا کہ اسمعیل کو خدا کی راہ میں قربان کرو۔ حکم دینا وحی کے ذریعے سے تھا اور وحی آنا دو طور سے تھا خواب میں یا بیداری میں۔ قرآن میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے لڑکے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں۔ سمجھے کہ خدا کا یہی حکم ہے اور لڑکے کو راہ خدا میں قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس واقعہ کے ذکر سے صرف آل ابراہیم کو یہ یاد دلانا مقصود تھا کہ خدا کی محبت میں اس کا دادا ابراہیم کس درجہ ثابت قدم تھا۔ قرآن میں مذکور ہے کہ حضرت اسحاق بھی قربان ہونے کو بخوشی راضی ہو گئے اس بیان سے حضرت اسمٰعیل کا بچپن ہی سے خداشناس ہونا دکھایا گیا ہے اور نیز یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے کاموں میں کس طرح باپ کی اطاعت لائق بیٹے کیا کرتے ہیں۔ یہیں یہ بھی جاننا چاہیئے کہ اخلاق اور تہذیب کے طریقے وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے ہیں اس زمانے میں اللہ کی راہ میں اپنے کو قربان کرنا ناروا نہ تھا اور اسی لئے حضرت ابراہیم بیٹے کے ذبح کرنے پر اسکی رضامندی کے ساتھ آمادہ ہو گئے۔ شرع محمدیؐ میں اب یہ جائز نہیں ہے اور اس لئے اگر کوئی بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر اپنے گلے پر چھری پھیر دے اور خدا کی راہ میں قربان ہونا چاہے تو شریعت ظاہری اسے عاصی قرار دے گی۔

قرآن میں اس قربانی کا قصہ یوں ختم کیا گیا ہے کہ "ہم نے ایک بڑی قربانی اسمٰعیل کا فدیہ دیا۔ اور آنے والی امتوں میں اس کا ذکر باقی رکھا" مفسروں نے یوں لکھا ہے کہ بہشت سے ایک موٹا دنبہ آیا اور وہ ذبح ہوا اور اسی روز سے ہر سال قربانی ابراہیم پر اور ابراہیم کی امت پر واجب ہوئی اور آنحضرت محمدؐ کے مذہب میں بھی وہی وجوب قائم رہا۔ لیکن اگر بہشت سے دنبہ کا آنا نہیں اور سیدھے سیدھے یوں سمجھیں کہ خدا نے پھر وحی کے ذریعے سے حضرت ابراہیم کو آگاہ کر دیا کہ بیشک تم میرے سچے دوست ہو لیکن بیٹے کو قربان نہ کرو یہ طریقہ برا ہے۔ تمہارا امتحان ہو چکا۔ اس کے عوض میں بقرعید میں قربانی کیا کرو تو گویا یوں ہوا کہ بقرعید کی عالمگیر قربانی بجائے اسمعیل کی قربانی کے بطور فدیہ کے قائم ہوئی اور دوسری آیت کے معنی صاف ہیں کہ اس طرح سے آنے والی امتوں میں بھی حضرت ابراہیم کا ذکر خیر قائم ہو گیا۔ ہر ایک مسلمان جانتا ہے کہ بقرعید کی قربانی حضرت ابراہیم کے وقت سے اور اس طرح قائم ہوئی ہے۔

حضرت یوسفؑ

حضرت ابراہیم کے دو بیٹے حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ تھے۔ حضرت اسحٰقؑ کے ایک بیٹے کا نام حضرت یعقوبؑ تھا۔ حضرت یعقوبؑ کے بہت سے بیٹے پیدا ہوئے جن میں حضرت یوسفؑ حسن صورت اور حسن اخلاق کی وجہ سے بہت زیادہ ممتاز تھے اور اسی لئے حضرت یعقوب ان کو بہت پیار کرتے تھے۔ بڑے بھائیوں کو حضرت یوسف کی حالت پر رشک آیا اور ان کو شکار کے حیلے سے گھر سے باہر لے جا کر ایک کنوئیں میں زندہ ڈال آئے بھائیوں نے تو حضرت یوسف کا خاتمہ ہی کر دیا تھا لیکن قدرت خدا کہ وہاں ایک قافلہ کا گزر ہوا اور سقّے پانی بھرنے آیا تو رسی پکڑ کر حضرت یوسف باہر نکل آئے اور سردار قافلہ کے غلام ہوئے بکتے بکاتے شاہ مصر کے پاس پہنچے وہاں بادشاہ بیگم انکی طرف مائل ہوئی۔ یہ بھاگے تو شرمندہ ہوئی اور دبا ڈالنے کے لئے فریادی ہوئی بادشاہ نے تحقیقات کی تو حضرت یوسف بے قصور پائے گئے ان کے بھاگتے وقت پیچھے کا دامن پھٹ کر شاہ بیگم کے ہاتھ میں رہ گیا تھا اور وہی شاہ بیگم کے خلاف ایک معقول شہادت تھی حضرت یوسف بچے تو سہی لیکن پھر مصلحتاً زندان میں بھیج دیئے گئے۔ زندان میں جانے سے قبل شہر میں اس واقعہ کا چرچا ہوا تو ہم چشم عورتوں نے شاہ بیگم کو چھیڑنا شروع کیا۔ شاہ بیگم نے ایک روز ان عورتوں کو جمع کیا اور سب کے ہاتھ میں ترنج اور چاقو دیدیئے اور کہا کہ تراشو اور اسی حالت میں حضرت یوسف کو بلا بھیجا۔ حضرت یوسف آئے تو ان کا حسن وجمال دیکھ کر عورتیں گھبرا گئیں اور حالت بدحواسی میں بجائے ترنج کاٹنے کے انگلیاں زخمی کر لیں۔ ان عورتوں نے تو شاہ بیگم کو ضرور نا قابل الزام قرار دیا لیکن زبان خلق کو کون روکتا۔ اس واقعہ سے اور بھی شاہ بیگم کی رسوائی بڑھی اور حضرت یوسف کا زندان میں بھیجنا ناگزیر سمجھا گیا زندان میں بادشاہ کا ایک ندیم چند روز کے لئے معتوب ہو کر بھیجا گیا تھا۔ جب اس کی صفائی ہوئی اور پھر اسکو تقرب شاہی نصیب ہوا تو اس کے ذریعہ سے حضرت یوسف کی عقل و فراست کی خبر دربار میں پہونچی بادشاہ نے ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر حضرت یوسف نے یہ کی کہ آئندہ قحط آنے والا ہے اور پھر اس قحط کی مصیبتوں سے بچنے کے لئے ترکیب بھی بتائی۔ وہ زندان سے پھر بادشاہ کے پاس پہنچے لیکن اب کی زمرۂ غلامان میں نہ تھے بلکہ ندیموں میں تھے۔ رفتہ رفتہ اراکین دولت میں داخل ہوئے اور بادشاہ کے مرنے پر مصر کے بادشاہ ہوئے ان کے عہد سلطنت میں وہی دشمن بھائی غلہ لینے کے لئے مصر گئے تو حضرت یوسف نے ان کو پہچانا اور تھوڑے سے اسباب لطف فراہم کرنے کے بعد اپنے والدین کو مصر میں بلوا بھیجا اور بے حد تعظیم و تکریم انکی کی اور اسی

سلسلہ میں اپنے دشمن بھائیوں پر بہت کچھ احسان کیا اور وہ حضرت یوسف کا کرم دیکھ کر بہت محجوب ہوئے۔

اس قصہ سے مفصلہ ذیل باتیں پیدا ہوتی ہیں۔

۱:۔ عدو بود سبب خیر گر خدا خواہد۔ جو فعل حضرت یوسف کا باعث ہلاکت خیال کیا گیا تھا وہی انکی شاہی کا سبب ہوا۔

۲:۔ خدا کو کسی کے گھٹانے یا بڑھانے میں یا عزت و ذلت دینے میں دیر نہیں لگتی اس نے آغوش پدر سے نکال کر حضرت یوسف کو کنوئیں میں ڈالا۔ کنوئیں سے وہ نکلے تو غلام ہوئے حالت غلامی میں اس رتبے کو پہنچے کہ شاہ بیگم کی نظر پڑنے لگی پھر اس عیش سے جدا ہو کر زندان میں بھیجے گئے۔ جہاں چور اچکے اٹھائی گیرے بند رہتے تھے زندان سے نکل کر جو ایک بار گی ترقی کے زینہ پر چڑھنے لگے تو مصر ایسے ملک کے بادشاہ ہوئے جو اس زمانے میں تمام دنیا میں منتخب سمجھا جاتا تھا۔

۳:۔ اس قصہ میں یہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی برائی کرے تو تم اس کے ساتھ بھلائی کرو کہ یہ بھلائی دیکھ کر وہ دشمن محجوب اور شرمندہ ہوگا۔ اور اس طرح جو روحانی تکلیف اس کو ہوگی وہ اور طور پر شاید نہ ہو سکے۔

حضرت داؤدؑ

یہ پیغمبر تھے اور بادشاہ بھی تھے۔ ان کے پاس ننانوے بیویاں تھیں۔ کسی سپاہی کی بیوی ان کو پسند آئی مگر شوہر اس کا زندہ تھا اس لئے اس کو زوجیت میں نہیں لے سکتے تھے۔ اتفاق سے کوئی لڑائی پیش آئی اس کے شوہر کو وہاں بھیجا گیا اور وہ مارا گیا۔ باقتضائے بشریت ان کو مسرت ہوئی ہوگی۔ خدا کو اس لغزش پر متنبہ کرنا منظور ہوا۔ آپ کے سامنے ایک روز دو شخص لڑتے ہوئے آئے آپ نے وجہ مخاصمت پوچھی تو ایک نے بیان کیا کہ میں دوسرے کا بھائی ہوں اس کے ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک ہے یہ اسکو بھی نہیں دیکھ سکتا اور مجھ سے بہ جبر میری دنبی لینا چاہتا ہے۔ حضرت داؤد نے کہا یہ بڑا ظلم ہے اس کے بعد ان کو خیال آیا اور سمجھے کہ ان کا حال تو بجنسہ اس ظالم کا سا ہے کہ ننانوے بیویاں گھر میں موجود ہیں اور پھر دوسرے کی بیوی پسند آتی ہے۔ حضرت داؤد نے اس واقعہ کے بعد خدا سے توبہ کی۔ زار زار روئے اور پریشان ہوئے۔ خدا نے توبہ قبول کی اس

قصہ سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ انسان سے قصور ہو ہی جاتا ہے اور توبہ کرنے سے خدا معاف بھی کر دیتا ہے اس کے بعد خدا کی طرف سے جو نصیحت کی گئی وہ یہ ہے " داؤدؑ ہم نے تم کو زمین کا بادشاہ بنایا ہے۔ تم آدمیوں میں منصفانہ حکم دیا کرو۔ خواہش نفس کی پیروی نہ کرو ورنہ یہ تم کو راہ خدا سے پھیر دیگی اور جو لوگ راہ خدا سے پھر جائیں گے ان پر روز حساب کو دل سے بھلا دینے کی وجہ سے عذاب شدید ہوگا "

حضرت سلیمانؑ

حضرت داؤد کے بیٹے حضرت سلیمان بھی پیغمبر ہوئے اور روئے زمین کے بڑے بادشاہوں میں ہوئے کہ جن وانس، ہوا، طیور بھی ان کے قابو میں تھے۔ الفاظ قرآن ایسے ہی ہیں اور لسان تمثیلی سمجھ کر اگر یوں معنی پیدا کئے جائیں کہ علم وہنر اور زور ان میں اس قدر تھا کہ ہر شے ان کے تابع تھی جب بھی ممکن ہے۔ غبارہ کے اڑنے والے کو کہہ سکتے ہیں کہ ہوا پر بھی ان کا قابو ہے سرکس کے تماشہ کرنے والے وحشی جانوروں پر کیسا قابو رکھتے ہیں۔ تاریخوں سے ثابت ہے کہ بنی اسرائیل کی اعلیٰ ترقی کا زمانہ ایسا تھا کہ اب اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ خدا قرآن میں یہ دکھاتا ہے کہ ہم نے سلیمان ایسے پیغمبر بھی پیدا کئے ہیں جو ہر چیز پر قادر تھے۔ کوئی بادشاہ اپنے زور اور حکومت پر اترانا چاہے تو اس کو حضرت سلیمان کے حالات پڑھ کر سمجھنا چاہیئے کہ ابھی وہ حضرت سلیمان کا پاسنگ بھی نہیں ہے۔

قرآن میں حضرت سلیمان کے لشکر کا یوں ذکر ہے کہ لشکر کی آمد ہوئی تو چیونٹیاں سوراخ میں چلی گئیں وہ ڈریں کہ ہم سب پامال نہ ہو جائیں۔ قرآن میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ تمام حاضر تھے ہُدہُد حاضر نہ تھا۔ سلیمان نے پوچھا پوچھا تو معلوم ہوا کہ سبا کی ملکہ بلقیس کی خبر لانے گیا تھا۔ حضرت سلیمان نے سنا کہ بلقیس کی بادشاہت میں لوگ آفتاب پرست ہیں جواب دہی کے لئے بلقیس طلب کی گئی اسکے آنے میں ذرا دیر ہوئی۔ دیو (شیطان) تعینات ہوئے۔ معلوم نہیں کہ ہُدہُد اور دیو سے کیا استعارہ۔ یا کنایہ ہے۔ بہر حال اس سے سمجھانا ہے کہ سلیمانؑ کی حکومت کس درجہ بڑھی ہوئی تھی۔ پھر قرآن میں حضرت سلیمان کے محل کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ بلقیس مکان میں چلی تو فرش زمین کا شیشہ کا تھا وہ پانی سمجھ کر پائنچہ چڑھانے لگی آجکل اس قدر صنعت کو ترقی ہے پھر بھی شیشہ کی اتنی بڑی چادر کہ فرش زمین ہو سکے کہیں نہیں دیکھی گئی۔ خدا ظاہر کرتا ہے کہ جسقدر سلیمان کو عیش و آرام حکومت وطاقت دی گئی تھی دوسرے کو نہیں دی گئی۔ حضرت سلیمان کا قصہ لوگوں کا غرور کم کرے گا۔

خدا سے ذراسی نعمت پاکر جو لوگ خود کو اور اپنے ساتھ خدا کو بھی بھول جاتے ہیں ان کو اس قصہ میں بڑا سبق دیا گیا ہے کہ ظرف ہو تو حضرت سلیمان کا سا۔ اتنا خدا نے ان کو دیا پھر بھی وہ خدا کو نہیں بھولے اور نہ خود کو بھولے کہ انسان ایک قطرہ آب سے پیدا ہوا ہے اور پھر اس کو خاک میں مل جانا ہے۔

حضرت موسیٰ

حضرت موسیٰؑ کا قصہ قرآن میں یوں مذکور ہے کہ فرعون جو قبطیوں کی انتہائی ترقی کے زمانے میں متعارف بادشاہت کا مدعی نہ تھا بلکہ الوہیت کا بھی مدعی بن بیٹھا تھا۔ بنی اسرائیل جو اپنے زمانے میں دنیا کی اعلیٰ ترین قوم سے تھے اپنے اعمال کی برائیوں سے گرتے گرتے ذلت کی انتہا تک پہنچ گئے تھے آج کل ہندوستان میں جس طرح برہمن اور چھتری چماروں سے خدمتیں لیتے ہیں اس سے بھی برے طور سے قبطی بنی اسرائیل سے پیش آتے تھے۔ خدا کو منظور ہوا کہ بنی اسرائیل کو پھر عروج دے اور ان کے ہاتھ سے فرعون ہلاک ہو اور قبطیوں کا زوال ہو۔ فرعون کو منجموں نے خبر دی کہ عجب نہیں تیری ہلاکت کے لئے بنی اسرائیل میں کوئی شخص پیدا ہو۔ فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جتنے لڑکے پیدا ہوں وہ تہہ تیغ کئے جائیں صرف لڑکیاں زندہ رہیں۔ ایسی حالت میں موسیٰ پیدا ہوئے اور حضرت موسیٰ کی ماں نے بادشاہ کے خوف سے حضرت موسیٰ کو صندوق میں بند کر کے دریا میں پھینک دیا۔ دریا سے ایک نہر باغ شاہی میں جاتی تھی۔ صندوق فرعون کی بیوی کے ہاتھ لگا انھوں نے حضرت موسیٰ کی پرورش کی اور اتفاق سے حضرت موسیٰ کی ماں دودھ پلانے کے لئے نوکر بھی رکھ لی گئیں۔ خدا اپنی قدرت دکھاتا ہے کہ دشمن کے گھر حضرت موسیٰ پلنے لگے اور خود فرعون کی گود میں کھیلنے لگے۔ جب وہ ذرا سن شعور کو پہنچے تو ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس سے ان کو مصر چھوڑنا پڑا۔ دارالحکومت فرعون میں بنی اسرائیل کا ایک مزدور جا رہا تھا اس پر کسی قبطی نے سختی کی۔ حضرت موسیٰ کو حب قومی نے جوش دلایا اور انھوں نے اس قبطی کو ٹھونکا۔ وہ اجل رسیدہ مر گیا اور حضرت موسیٰ کو وہاں سے مفرور ہونا پڑا۔ حضرت موسیٰ جاتے جاتے حضرت شعیبؑ کے پاس پہنچے اور انکی لڑکی سے بیاہ کیا۔ حالت سفر میں تجربہ ہوا۔ عقل پختہ ہوئی۔ نبوت عطا ہوئی قبطیوں کو راہ راست پر لانے کے لئے یہ پھر مصر آئے بنی اسرائیل نے ان کا ساتھ دیا۔ قبطیوں نے نافرمانی کی لڑائی ہوئی فرعون کی ہلاکت ہوئی قصہ ختم ہوا۔ اس قصہ میں جس قدر اخلاق کی تعلیم ہے اور حکمت اور معرفت کی باتیں ہیں ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود عیاں ہے

فرعون کے جادوگروں سے بھی حضرت موسیٰ کا مقابلہ ہوا اس کے سمجھنے کے لئے "سحر (جادو) فصل ۱۵ پڑھیئے۔

حضرت خضر علیہ السلام

حضرت خضر کا ذکر قرآن میں نہیں ہے لیکن ایک حکایت حضرت موسیٰ کے سفر کی مذکور ہے سفر کے ساتھی کا نام قرآن میں مذکور نہیں ہے لیکن مفسروں نے اس نا معلوم شخص کو خضر لکھا ہے۔ صورت قصہ یوں ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر ایک سفر میں ساتھ ساتھ چلے خضر نے معیت اس شرط سے قبول کی تھی کہ حضرت موسیٰ انکی حرکات پر معترض نہ ہوں۔ قصہ سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ خضر اس حالت میں حضرت موسیٰ سے زائد تر واقف رموز الہٰی تھے۔

حضرت خضر نے ایک لڑکے کو راستے میں مار ڈالا تھا۔ حضرت موسیٰ نے کہا یہ حرکت نامناسب تم نے کی۔ خواجہ خضر نے کہا مجھ سے تم سے یہ شرط تھی کہ تم میرے کاموں میں دخل نہ دوگے حضرت موسیٰ نے کہا کہ اچھا اب نہ بولوں گا۔ آگے چل کر حضرت خضر نے ایک کشتی ڈبا دی۔ حضرت موسیٰ نے اس پر بھی اعتراض کیا۔ خضر نے پھر انکا وعدہ ان کو یاد دلایا اور وہ پھر منفعل ہوئے۔ پھر یہ دونوں ایک گاؤں میں گئے جہاں کے باشندے نہایت بے اعتنائی کے ساتھ پیش آئے کھانے کو بھی نہ پوچھا۔ حضرت خضر بجائے ناخوش ہونے کے اس قدر خوش نظر آئے کہ ایک دیوار جو قریب الانہدام تھی مرمت کر دی۔ حضرت موسیٰ نے کہا کہ مجھ کو بولنے کا تو کوئی حق نہیں ہے لیکن میں صرف اتنا کہتا ہوں کہ دیوار بنوانے کی مزدوری تو لے لو کہ کچھ کھانے کا سہارا ہو۔ حضرت خضر نے کہا کہ آپ کی معیت کو سلام ہے میرا آپ کا ساتھ نبھنے والا نہیں ہے۔ فی امان اللہ میں رخصت ہوتا ہوں اور چلتے چلاتے اپنے افعال کی وجہ بھی تمہیں بتلائے دیتا ہوں۔ جس لڑکے کو میں نے قتل کیا اس کے والدین صالحین سے ہیں اور یہ لڑکا دلی کے گھر شیطان پیدا ہوا تھا اور اس کے بعد دوسرا لڑکا ایسا پیدا ہونے والا ہے جو اپنے والدین کے قدم بہ قدم ہے۔ اس لڑکے کو مار کر میں نے اس کے والدین پر بڑا احسان کیا ہے۔ کشتی میں نے اس لئے ڈبا دی تھی کہ اس بے چارے غریب ملاح کو صرف ایک اسی کشتی کا سہارا تھا اور ایک بادشاہ ظالم کے آدمی کشتی گرفتار کرنے کے لئے مامور ہوئے تھے۔ جب تک ملاح کشتی نکالیں گے اور اسے درست کریں گے تب تک ظالموں کا گروہ وہاں سے چلا جائے گا اور اسکی کشتی بچ جائے گی۔ دیوار میں نے اس لئے بنا دی تھی کہ اس کے نیچے ایک خزانہ تھا اور خزانے کا مالک ایک یتیم بچہ تھا جس کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ مزدوری لیتا تو کس سے لیتا اور دیوار گر جاتی

خزانہ لوٹ لے جاتے۔ اب وہ یتیم جب سن شعور کو پہنچے گا تو اس خزانے کو کھود کر تصرف کرے گا۔

۱۰ الخیر فی ما وقع "جو ہوا اچھا ہوا جو شخص اس کا مفہوم سمجھتا ہے اس کو بہت کم دنیا میں تاسف کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ موجودہ حالت پر صبر کرنا اور خیال کرنا کہ خدا اس میں کوئی بھلائی سمجھتا ہوگا انسان کو نہایت آرام سے رکھتا ہے۔ خدا کے فعل کو خالی از حکمت نہ سمجھنا اور ہر امر کی نسبت یہ خیال کرنا کہ ممکن ہے راز الٰہی کچھ اور معنی رکھتا ہو۔ مفصلہ بالا قصہ میں بیان کیا گیا ہے۔ جو انسان اس کے نتیجہ پر دھیان رکھے گا وہ اوروں سے نسبتاً زائد خوش رہ سکتا ہے۔

اس قصہ میں درپردہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ رموز الٰہی سے پورے طور پر کوئی انسان واقف نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ حضرت موسیٰ بھی جنکو کلیم اللہ کا خطاب ملا ہمہ دانی کے مدعی نہ ہو سکے۔

قارون

قارون ایک بڑا مالدار تھا اس کے خزانے کی کنجیاں کئی آدمیوں کا بوجھ تھیں۔ دولت کے نشہ میں وہ خدا کو بھول گیا اور سمجھا کہ اس کے قوت بازو سے سب کچھ ہے بالآخر خدا کی نافرمانی کرنے لگا زیردستوں پر ظلم کرنے لگا اور اس کے غرور کی کچھ انتہا نہیں رہی۔ لوگ اسے دیکھ کر دل میں کہتے تھے کہ اللہ قارون پر اس درجہ مہربان ہے اور ہماری خبر نہیں لیتا اے کاش ہم بھی قارون کے سے زردار ہوتے۔ خدا نے ایک دن قارون کا خزانہ اور مکان زمین میں دھنسا دیا۔ دوسرے دن لوگوں نے یہ عبرت ناک واقعہ دیکھ کر کہا خدا کا شکر ہے کہ ہم قارون کے سے نہ ہوئے۔

اس قصہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس کو خدا دے وہ خدا کی راہ میں بھی کچھ خرچ کرے۔ خدا بر تو پاشد تو بر خلق پاش۔ قارون کی طرح ایک دن سب کو دولت چھوڑنا ہے پھر۔ برائے نہادن چہ سنگ وچہ زر۔ نہ دولت پر اترانا چاہیئے اور نہ اس کو جائز مقام پر خرچ کرنے سے دریغ کرنا چاہیئے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جو لوگ بڑے روپے والے ہیں ان پر دوسروں کو رشک نہ کرنا چاہیئے زائد روپے والے بھی روپے سے اتنا ہی فائدہ اٹھاتے ہیں جتنا کم روپے والے قارون کی دولت اس کے کس کام آئی۔ جو لوگ اپنی بے سمجھی سے ایک دن پہلے قارون کی حالت قابل رشک سمجھتے تھے وہی دوسرے دن اسے قابل تاسف سمجھنے لگے۔

قارون پر کیا خصوصیت ہے دنیا میں جتنے قارون کے بھائی ہیں سب کی یہی کیفیت ہے لوگوں کو چاہیئے کہ مالداروں کی حالت دیکھکر رشک نہ کریں اور نہ اپنے دل میں دولت کو کوئی

بڑی چیز سمجھیں۔ دل غنی رہنا چاہیئے اور چشم سیر رہنا چاہیئے۔ ہر شخص دنیا میں اتنا فائدہ حاصل کرتا ہے جتنا اسکی قسمت میں ہے۔ زائد دولت کبھی وبال جان ہوتی ہے۔ دنیا میں جتنے لوگ روپیہ جمع کرتے ہیں تمام عمر فکر زر میں پریشان رہتے ہیں وہ ذرہ خاک بھی نہیں پاتے براۓ نہادن چہ سنگ وچہ زر اور دوسروں کے لئے اپنا اندوختہ چھوڑ جاتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ اگر چشم بینا ہو تو سبق حاصل ہوتا رہے۔ ابھی تھوڑے دنوں کا تذکرہ ہے کہ یورپ میں ایک بڑا مالدار یہودی اپنے خزانے کی کوٹھری یا تہہ خانے میں گھسا۔ قارون ثانی اس کو سمجھنا چاہیئے کوٹھری میں الماریاں اور درجے اتنے تھے کہ بھول بھلیاں بن گئے روشنی لے کر وہ گھسا اور گھستے وقت دروازہ بند کرتا گیا۔ روشنی گل ہو گئی اور کئی دن تک وہ اس میں پریشان پھرا۔ چیخ کی آواز باہر آتی نہ تھی۔ بخیل ایسے موقع پر بہت چھپ کر کام کرتے ہیں دوسروں کو خبر بھی نہ ہوئی کہ آج در خزانہ وا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مر گیا اور مرتے وقت ایک کاغذ پنسل سے اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر یہ لکھ گیا کہ " آج میری دولت کا شمار نہیں ہے لیکن ایک پیالہ چاۓ اور ایک بسکٹ کے نہ ہونے سے جان جاتی ہے "

قارون کے قصے لکھنے سے یہ سبق دینا منظور ہے کہ مالدار دوسروں پر احسان کرنا سیکھیں اور مفلس مالداروں کو ضرورت سے زیادہ محترم سمجھ کر اپنے دل میں بے جا کمزوری پیدا نہ کریں اور نہ خود کو حقیر اور خدا کو غیر منصف سمجھیں۔

حضرت یونسؑ

حضرت یونس کا قصہ مختصر طور پر یوں مذکور ہے کہ حضرت یونس کشتی پر جا رہے تھے۔ کشتی رکی ایک شخص کو کشتی سے گرا دینے کی ضرورت معلوم ہوئی۔ قرعہ ان کے نام پر ڈالا گیا۔ مچھلی انکو نگل گئی۔ یہ مچھلی کے پیٹ سے زندہ بچ کر نکلے لیکن گھائل تھے اور کدو کے بیل کے نیچے پڑے رہے مفسرین لکھتے ہیں کہ کدو کے پتوں کے سایہ میں مکھیاں نہیں آئیں۔ اور یونس کے لئے بہت ضرورت اس کی تھی کہ مکھیاں نہ آنے پائیں۔ مکھیوں کی وجہ سے زخموں میں کیڑے پڑ جانے کا احتمال ہوتا ہے ناک گھڑیال وغیرہ ایسے جانور ہیں جو آدمی کو کھا جاتے ہیں اور سمندر کی مچھلیاں بھی ایسی ہیں۔ جو آدمی کو نگل جاتی ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان جانوروں سے آدمی نیم جان ہو کر بچ نکلتا ہے اس قصہ میں دکھایا گیا ہے کہ طرح طرح کی مصیبتیں انسان کے لئے ہیں جن سے پیغمبر بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔

مفسروں نے یوں لکھا ہے کہ حضرت یونس کی امت گمراہ تھی ان پر عذاب آنے والا تھا۔ یونس بھاگ نکلے اور لوگوں کو بھی متنبہ کر دیا۔ لوگوں سنکر شہر خالی کر دیا۔ اب عذاب آتا تو کس پر۔ حضرت یونس کو خیال گزرا کہ اب قوم میں جانا اپنی ہنسی کرانا ہے اس لئے وہ ایک طرف بھاگ نکلے راستہ میں ایک مچھلی ان کو نگل گئی اور وہ کچھ دنوں تک مبتلائے آلام رہے۔

حضرت عیسیٰ [۱،۲]

حضرت عیسیٰ کا قصہ بھی قرآن میں مختلف مقامات پر ہے جس طرح سے حضرت موسیٰ کی پرورش میں قدرت خدا ہے کہ وہ دشمن کے گھر پلے اسی طرح حضرت عیسیٰ کی پیدائش میں یہ شان ایزدی ہے کہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے بغیر باپ کے لڑکے کا پیدا کرنا خدا کے لئے کوئی بات نہیں ہے حضرت عیسیٰ [۲] کی ماں مریم تو موجود تھیں۔ زیادہ اچھا تو یہ ہے کہ حضرت آدم کی ماں تھی نہ باپ تھا پھر ان کو خدا نے پیدا کیا۔ جو لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ جب خدا نے ایک طور پر سلسلہ توالد سل قائم کر دیا تو پھر اس قاعدہ کو خدا نہیں توڑتا ان کے سمجھانے کے لئے ہم وہی کہہ سکتے ہیں کہ جو اس خصوص میں بہت سے ڈاکٹروں نے کہا ہے یعنی عورت کے شکم میں دونوں قوتیں پیدا ہو سکتی ہیں جن کے اتصال سے توالد و تناسل کا سلسلہ معمولی طور قائم رہتا ہے۔

حضرت عیسیٰ کی زندگی بہت سادہ تھی۔ نہ انھوں نے شادی کی اور نہ گھر بنایا لوگوں کو راہ خدا دکھاتے پھرتے تھے۔ اخیر اخیر یہود ان کے دشمن ہو گئے اور ان کو سولی پر چڑھانا چاہا۔ یہ رمتے جوگی تھے۔ آج یہاں کل وہاں۔ یہ دشمنوں کے ہاتھ نہ آئے ان کے شہر میں دوسرا شخص سولی پر چڑھایا گیا جب ان کا وقت آیا تب یہ بھی مرے اور گمنام حالت میں مرے۔ مرنے کے وقت ان کے معتقدوں کا گروہ کسی شمار میں نہ تھا۔ لیکن ان کے بعد ان کے وعظ اور نصیحت کی قدر بڑھی اور ان کے پیرو بڑھتے گئے۔

اصحاب کہف

چند احباب ایسے تھے جو بت پرستی سے متنفر تھے لیکن بادشاہ وقت بت پرست تھا جسکی وجہ سے ان کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور بھاگ کر کسی غار میں چھپے کہ وہیں چھپ کر خدا کو یاد کریں اور خیال کیا کہ اس کے بعد جو ہونا ہے ہو رہے گا اس وقت مخالفین سے بچنے کی یہی صورت تھی خدا کی قدرت کہ انکو وہاں نیند آئی اور وہ سو گئے۔ سو کر اٹھے تو آپس میں پوچھنے لگے کہ کتنی دیر

تک ہم سوتے مگر کچھ ٹھیک رائے قائم نہ کرسکے ان میں سے ایک آدمی بازار میں سودا خریدنے چلا کہ اپنے بھائیوں سے چھپ چھپا کر کوئی سودا خرید لائے کیونکہ بھوک کی بیتابی غار سے باہر نکلنے پر مجبور کرتی تھی۔ بازار میں جانے پر بازار کی صورت ہی دوسری نظر آئی اور وہاں بازار والوں نے اس عجیب الخلقت آدمی کو دیکھ کر تعجب کیا سکہ جو اس نے پیش کیا تھا وہ تین سو برس کا تھا حالت یہ تھی کہ تین سو نو برس تک وہ سوتے رہ گئے تھے اس درمیان میں حضرت عیسیٰ پیغمبر مبعوث ہوئے اور عیسائی مذہب پھیلا اور شہر کا بادشاہ بجائے بت پرست کے اب عیسائی مذہب کا تھا اصحاب کہف بادشاہ کے سامنے پہنچائے گئے بادشاہ نے انکی بڑی تعظیم کی اس واقعہ سے وہاں کے عیسائیوں کے نور ایمان میں بھی روشنی بڑھی اور وہ کہنے لگے کہ جو خدا تین سو برس تک سلا کر پھر جگا سکتا ہے وہ بالکل جان سے مار کر حشر کے دن زندہ بھی کر سکتا ہے اس میں سب قدرت ہے

ہم مسلمانوں کو اس قصہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہے بس اتنا جاننا ہمارے لئے کافی ہے کہ یہ قصہ قرآن میں ہے اور جو کچھ قرآن میں ہے سب سچ ہے لیکن جو لوگ غیر معمولی بات کے سچا سمجھنے میں خواہ مخواہ توضیح اور دلائل تلاش کرتے ہیں ان کے سمجھانے کے لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ اب بھی ہند وفقرا بہت سے ایسے ہیں جو سوا لنسہ برہمانڈ میں چڑھا کر ایک جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور برسوں اسی حالت میں رہتے ہیں۔ تمام بدن میں آثار موت نظر آتے ہیں۔ صرف دماغ میں گرمی رہتی ہے سندر بن میں اب بھی ایسے فقرا ہیں۔ تھوڑے روز کا ایک واقعہ بنگال میں عام طور پر مشہور ہے کہ ایک انگریز ایک ایسا ہی آدمی سندر بن سے اٹھا لایا تھا۔ کلکتہ میں وہ بہت روز تک تماشا بنا رہا۔ صرف دل و دماغ میں اس کے گرمی تھی اور بدن سڑتا نہ تھا یہی دو علامتیں اسکی زیست کی تھیں ورنہ اور طور سے وہ مردہ تھا۔ انگریزوں نے بہت ترکیب کی کہ اس کو بیدار کریں مگر وہ بیدار نہ ہو سکا۔ علم جوگ سے انگریز واقف نہیں ہیں اس لئے انکی تدبیریں بیکار ثابت ہوئیں بالآخر اس کو کوئی گرم چیز کھلائی گئی شراب یا ارنڈی کا تیل جس سے اس کو ایک دست آیا اور دست کے ساتھ وہ دماغی حرارت جس زیست باقی تھی جاتی رہی اور وہ مرگیا اس وقت سے یہ حکم صادر ہوا کہ ایسوں سے تعرض نہ کرنا چاہیئے۔

ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ اصحاب کہف کی نیند کو ہم ایسی ہی نیند سمجھتے ہیں۔ ہم خدا کو قادر مطلق جانتے ہیں تو پھر کوئی چیز ہمارے لئے قابل حیرت نہیں ہے اگر یہ مان لیں کہ خدا کبھی قانون فطرت نہیں بدلتا تو یہ کیا ضروری ہے کہ تمام قوانین فطرت ہماری سمجھ میں بھی آجائیں بلکہ ہمارا

ایمان ہے کہ اس کے سمجھنے سے ہم قاصر ہیں لیکن اگر منکرین کے ساکت کرنے کے لئے یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ اصحاب کہف جوگ کے طریقہ سے یا دالہٰی کرتے تھے اور وہ بداطوار ملکی بھائیوں سے کنارہ کش ہوکر غار میں جا بیٹھے تھے اور تین سو نو برس تک وہ حبس دم کر کے ایک حالت سے پڑے رہ گئے تب بھی ماحصل ایک ہی ہے یعنی خدا میں یہ قدرت ہے کہ حبس دم کے طریقے جاننے والوں کو وہ مدتوں تک ایک حالت پر بیدم رکھ سکتا ہے اور پھر جگاتا ہے۔ تو وہ اپنی اصلی حالت پر آجاتے ہیں۔

لقمان

لقمان کا ذکر بھی قرآن میں ہے۔ معلوم نہیں یہ وہی یونانی حکیم ہیں جنکا ذکر یونان کے حکیموں کے سلسلہ میں بھی پایا جاتا ہے یا کوئی دوسرے بزرگ ہیں۔ خدا نے قرآن میں فرمایا ہے کہ ہم نے لقمان کو حکمت یعنی دانائی عطا کی تھی اور وہ اللہ کا شکر گزار بندہ تھا۔ لقمان نے جو نصیحت اپنے بیٹے کو کی تھی اس کا ذکر بھی قرآن میں ہے۔ سورہ لقمان رکوع اول سے ہم ترجمہ کرتے ہیں۔

" بیٹا کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرانا یہ بڑا گناہ ہے۔ بیٹا! رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی عمل ہوگا پتھر میں ہوگا یا آسمان وزمین میں کہیں ہوگا تو خدا اسے روز حشر میں سامنے کر دے گا خدا باریک بین اور باخبر ہے۔ بیٹا! نماز پڑھا کرو اور اچھے کاموں کی ترغیب دو اور برے کاموں سے منع کرو اور جیسی پڑے جھیلو کہ ہمت کی یہی باتیں ہیں۔ لوگوں سے بے رخی نہ کرو زمین پر اترا کر مت چلو اللہ اترانے والے اور شیخی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا رفتار میں میانہ روی اختیار کرو اور آہستہ آہستہ بولو سب سے بری آواز گدھوں کی ہے۔

اصحاب فیل

اصحاب فیل کے واقعہ کی طرف سورۂ فیل میں یوں اشارہ کیا گیا ہے۔

تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا انکی چال اس نے غلط نہیں کر دی ان پر اس نے غول کے غول چڑیاں بھیجیں جنھوں نے ان پر پتھر کی کنکریاں پھینک کر انکو کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا۔

تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا انکی چال اس نے غلط نہیں کر دی۔ ان پر اس نے مصائب کے غول بھیجے جس نے ان کو اس آفت میں مبتلا کیا جو انکے لئے لکھی ہوئی تھی اور کھائے ہوئے بھوسے کی طرح انکو کر دیا۔

سورہ فیل میں یہ قصہ لکھا ہوا ہے لیکن صورت قصہ میں اختلاف اور اسی کی رعایت سے اس سورہ کے ترجمہ میں بھی اختلاف کیا جاتا ہے دونوں ترجمے اوپر لکھ دیئے گئے ہیں پہلا ترجمہ لفظی ترجمہ ہے اور دوسرا ترجمہ محاورہ کے اعتبار سے ہے۔ ترجمے دونوں صحیح ہیں فرق اتنا ہے کہ پہلے ترجمہ میں مافوق العادت باتیں ہیں اور دوسرے میں کوئی بات مافوق العادت نہیں ہے اور تاریخی واقعات کے انطباق کے لحاظ سے بھی پچھلا ہی واقعہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ کوئی بہت پرانا واقعہ نہ تھا آنحضرتؐ کے سال پیدائش کا واقعہ تھا اور سب جانتے تھے کہ ابرہا کے لشکر ابابیل کی کنکریوں سے تباہ ہوئے یا وبائے چیچک سے برباد ہوئے۔

ترجمے میں اختلاف کا سبب یہ ہے کہ "طیر" کے اصلی معنی ہیں "پرند" لیکن بدشگونی اور مصیبت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور اسی طرح "ترمیھم بحجارۃ" کا لفظی ترجمہ ہے "پتھر کی کنکریاں پھینکیں" اور محاورہ کا ترجمہ ہے "آفت میں مبتلا کیا" اور "سجیل" سے مراد ہے آفت مقدر۔

فصل نمبر ۵۴

شیطان اور جن

بھوت پریت۔ چڑیل۔ دیو اور پری کے افسانے جس طرح ہندوستان میں سنے جاتے ہیں اسی طرح اور ملکوں میں بھی سنے جاتے ہیں۔ یہ باتیں کچھ جدید نہیں ہیں بہت پہلے سے ہیں انکی دلچسپیاں البتہ قومی ترقی کے ساتھ گھٹتی اور قومی تنزل کے ساتھ بڑھتی رہتی ہیں قومی ترقی کے وقت یہ خیالات خاص خاص جہلا میں محدود رہ جاتے ہیں اور قومی تنزل کے وقت تمام قوم کی قوم انھیں باتوں میں مبتلا پائی جاتی ہے۔

یونان میں بھی ایک وقت ایسا تھا کہ تمام قوم کی قوم انھیں لغویات میں پھنسی ہوئی تھی اور جب قومی ترقی شروع ہوئی تو ان لغویات اور توہمات سے بھی آزادی نصیب ہوئی اسی زمانے میں ایک حکیم نے ارواح کے وجود سے انکار کیا اور بہت سختی سے لوگوں کو اپنے انکار کے وجوہ بتائے ایک برابر کے علم والے نے اس پر اعتراض کیا تو اس نے کہا کہ " ارواح کے وجود سے مجھ کو انکار نہیں ہے لیکن اس بارے میں لوگوں کے خیالات ایسے برے ہو رہے ہیں کہ کچھ دنوں تک ارواح کے وجود ہی سے انکار کرنا قرین مصلحت ہے۔ عوام سے یہ کہنا کہ تمہارے خیال کے مطابق ارواح کا وجود نہیں ہے بلکہ میرے خیال کے مطابق اس کا وجود ہے قوم کی بودلی کا سبب ہوگا اور قومی اصلاح کا باعث نہ ہوگا " اب بھی مہذب سے مہذب ممالک میں یہ بلا پائی جاتی ہے لیکن ادنیٰ طبقہ کے لوگوں میں جو جتنا ہی ذلیل حالت میں ہے اتنا ہی اس کا زائد مُقر ہے۔

عرب میں بھی مشرکان عرب بھوت پریت کے خیالات رکھتے تھے اور عرب کی لغت میں انکو

جن کہتے تھے ۔جن کے معنی ہیں پوشیدہ ۔ خیال یہ تھا کہ روحیں چھپی پھرتی ہیں ۔مخلوقات عالم میں سے جو صورتیں چاہتی ہیں اختیار کر لیتی ہیں ۔ بجنسہ یہ وہی خیال تھا جو ہندوستان میں بھی ہے ۔صرف لفظوں کا فرق ہے ۔ ہندوستان میں بھوت نام ہے اور عرب میں جن ۔شیطان کو بھی اسی قبیل سے سمجھتے تھے ۔ فرق اتنا ہے کہ جنات تعلیم پذیر سمجھے جاتے تھے ان میں اچھے بھی ہوتے تھے اور برے بھی ہوتے تھے شیطان راندہ بارگاہ ایزدی خیال کیا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ تعلیم قبول کرنے کی قابلیت اس میں نہیں ہوتی ۔

جہاں کہیں انسان نے ترقی کی ان خیالات باطل کی پیروی بھی چھوڑ دی ۔کیا اسلام نے اپنے زمانہ ترقی میں اس قسم کے خیالات کی تقلید قائم رکھی تھی ؟ ہمارے نزدیک جس طرح دو اور دو چار ہوتے ہیں اسی طرح یہ امر بھی درجہ یقین رکھتا ہے کہ اگر اسلام نے ان باتوں کی پیروی کی ہوتی تو ہرگز اسکو ترقی نصیب نہ ہوتی ۔ ہم آئندہ یہ دکھائیں گے کہ قرآن نے ان لغویات کے یقین دلانے کے بجائے ان لغویات کا ترک کرنا تلقین کیا ہے ۔اب رہا یہ امر کہ مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانے میں اسکی نسبت کیا خیال کیا اسکی بابت ہمارے پاس دو قرینے ہیں جو بتاتے ہیں کہ مسلمانوں نے بھی مثل دوسری ترقی یافتہ قوموں کے ان چیزوں کی کبھی پروا نہیں کی ایک تو یہ ہے کہ انکی ملکی ترقیوں کی تاریخ میں اس قسم کے توہمات کا کہیں ذکر نہیں آیا ہے بلکہ فریق مخالف نے جہاں جہاں ان لغویات سے اثر قبول کیا ہے وہاں فریق ثانی کے قومی شعار کی تضحیک کی گئی ہے دوسرا قرینہ یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کے تمام مسلمان چھوٹے بڑے عالم اور جاہل ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اس قوم کی جیسی حالت ہے ویسے ہی اس کے سامان بھی ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہر مسلمان کو اس امر کا عقیدہ ہے کہ جب مسلمان پاک رہتا ہے اور کلمہ یا آیت قرآنی پڑھتا ہے تو بھوت اور چڑیل جو نجاست اور ناپاکی میں رہتے ہیں خوف سے مسلمان کے پاس نہیں آتے جنات جو خود مسلمان ہوتے ہیں کسیقدر بے خوف ہوتے ہیں لیکن وہ بھی مسلمانوں کو ایذا نہیں پہنچاتے اور ایذا پہنچاتے بھی ہیں تو آیات قرآنی سے اسکی روک تھام ہو جاتی ہے یہ خیالات ہمارے نزدیک موروثی ہیں اور اصلیت اس خیال کی وہی معلوم ہوتی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ۔ یعنی مسلمان اپنی ترقی کے زمانے میں ان چیزوں سے ڈرتے نہ تھے اور نہ ان کے قائل تھے مسلمانوں کا نہ ڈرنا اور غیر مسلمانوں کا ڈرنا اب اس انحطاط کے زمانے میں یوں سمجھا گیا ہے کہ ارواح خبیثہ مسلمانوں کو نہیں ستاتیں اور غیر مسلمانوں کو ستاتی ہیں ایسا ہی انگریزون

نسبت بھی کہا جاتا ہے کہ ان پر سحر یا جادو کام نہیں کرتا اور نہ بھوت پریت ان کو ستا سکتے ہیں اور نہ کبھی برہمہ بابا ان کو دق کرتے ہیں۔ ان چیزوں سے ان کا محفوظ رہنا انکی قوت کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے وہ محض اس لئے محفوظ ہیں کہ وہ اس کا اعتبار نہیں کرتے۔

اب اس وقت ہندوؤں میں عموماً اور مسلمانوں کے طبقۂ جہلا میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بھوت انسان سے لڑتے ہیں اور انسان کو مار ڈالتے ہیں۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ صرف حیران کرتے ہیں جان سے نہیں مارتے بیمار ڈالتے ہیں اور بیماری سے انسان مرتا ہے۔ بلا واسطہ نہیں مرتا ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ انسان پر جن یا چڑیل سوار ہو جاتی ہیں اور اس وقت اس سے عجائبات کا ظہور ہوتا ہے۔

غرض کہ جتنی باتیں ظہور میں آتی ہیں۔ وہ یا تو خود اپنی قوت نفس کا اپنے اوپر اثر ہوتا ہے یا ایک کی قوت نفس کا دوسرے پر ہوتا ہے اور کبھی کبھی نظر کے دھوکہ کھانے سے بھی یہ باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ مضمون "جادو (سحر)" فصل ۱۵ کے عنوان میں بخوبی واضح کیا گیا ہے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے لیکن اتنا کہنا اور بھی ضروری ہے کہ اس طرح کے عجائبات اور کیفیات سے زیادہ تر انکھیں کا مقابلہ ہوتا ہے جو دل کے کمزور ہوتے ہیں۔ منکرین کو اس قسم کے عجائبات نظر نہیں آتے یا بعض منکرین کو نظر بھی آتے ہیں تو صرف اسی حالت میں کہ انکا انکار کاذب ہوتا ہے اور ساتھیوں کی گفتگو سے ان کے دل پورے طور سے متاثر ہوتے ہیں۔

سروں پر جنات اور چڑیلوں کا آنا زیادہ تر مصنوعی ہوتا ہے اور جہاں کہیں اصلی ہوتا ہے وہاں بھی اس سے زیادہ نہیں ہوتا جتنا کہ مسمریزم کے معمول عموماً دکھایا کرتے ہیں۔ حالانکہ کسی ارواح کا مسلط ہونا کسی صورت سے نہیں ہوتا۔ اس حکایت سے اسکی حقیقت بخوبی سمجھ میں آجائے گی۔

ایک شاہ صاحب کسی مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے وہاں سے ذرا فاصلہ پر ان کا معتقد رہتا تھا اور روز رات کو شاہ صاحب کا کھانا پہنچاتا تھا ایک رات وہ کھانا لے چلا تو لوگوں نے اس کو ڈرایا کہ راستہ میں فلاں درخت پر ایک بڑا بھوت رہتا ہے بیسیوں آدمی وہ مار چکا ہے تعجب ہے کہ اس سے تم سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ اس تقریر سے اس پر کچھ ایسا خوف غالب ہوا کہ وہ اس شب کو کھانا نہ لے گیا اور دوسرے دن کچھ دن رہے کھانا لے کر پہنچا اور جلد واپسی کی اجازت چاہی شاہ صاحب نے اسکو باتوں میں لگایا۔ جب آدھی رات گزری تو اسے جانے کی اجازت دی اس معتقد نے جانے میں تامل کیا تو شاہ صاحب نے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ اس درخت پر بہت بڑا شیطان رہتا ہے اور لوگوں سے چمٹ بھی جاتا ہے لیکن جب تم میرے پاس آئے ہو تو

تو اسکی مجال نہیں ہے کہ تم سے مقابلہ کرنے لیکن اگر اسکی موت ہی آگئی ہو گی اور تم سے مقابلہ کرے گا تو پھر فنا بھی ہو جائے گا۔ ایک پڑیا میں میری دھونی کی راکھ لیتے جاؤ۔ وہ تم سے چمٹے تو اس کی پیشانی پر لگا دینا فوراً وہ جل کر خاک ہو جائے گا اور جب گھر پہنچنا تو اپنا منہ آئینے میں ضرور دیکھ لینا۔ اس مرید کو شاہ صاحب کے کہنے سے جہاں شیطان سے مڈبھیڑ ہو جانے کا خیال قوی ہوا وہاں اس بات کا بھی یقین ہوا کہ شیطان چمٹا اور خاک ہوا۔ اور جب وہ درخت کے نیچے پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ ایک دیو درخت سے اترا اور اسے چمٹ گیا۔ اس کا چمٹنا تھا کہ اس نے راکھ فوراً اسکی پیشانی پر مل دی اور وہ فوراً فنا ہو گیا۔ خوشی خوشی وہ گھر آیا اور آتے ہی شیشہ میں منہ دیکھا تو راکھ کا ٹیکا پیشانی پر تھا دوسرے دن شاہ صاحب کے پاس پہنچا تو بہت خوش تھا لیکن اپنے ماتھے پر راکھ لگنے سے حیران بھی تھا۔ شاہ صاحب نے اسکو بتایا کہ یہ سب تماشا تیرے واہمہ نے پیدا کیا تو نے خود اپنے سر پر ٹیکا لگایا اور سمجھا کہ شیطان ٹیکا لگاتا ہے۔ شاہ صاحب بھلے مانس تھے کہ صاف صاف کہدیا ورنہ کوئی دوسرا ہوتا تو بیسیوں ابلہ فریب باتیں بناتا۔ تمام گردو نواح کے باشندوں کا دین اور ایمان خراب کرتا اور اپنا گھر دولت سے بھر لیتا۔

ہم جنات، شیطان اور بھوت کے منکر نہیں ہیں۔ ہم صرف نام جانتے ہیں۔ انکی حقیقت نہیں جانتے۔ ہم کو اس سے بھی بحث نہیں ہے کہ اس کا وجود ذہن میں ہے یا خارج میں ہے یہ محض لفظی بحث ہے اور ایک حد تک بے معنی ہے۔ اتنا ہم جانتے ہیں کہ وہ مادی نہیں ہے اور اتنا ہی جاننا کافی ہے۔ غیر مادی ہونے کی حالت میں اس کا وجود فی الذہن ہو یا فی الخارج دونوں یکساں ہیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جنات اور شیاطین کبھی سانپ بن گئے اور کبھی بلی بن گئے۔ گھوڑے کی صورت میں نمودار ہوئے اور جب کوئی تھوڑی دیر تک سوار ہو کر ان پر گیا تو وہ غائب ہو گئے۔ جب کسی کمزور سے سابقہ پڑا تو اسکو ستانا شروع کیا اور جب کسی زبردست عامل سے مڈبھیڑ ہوئی تو بوتل کے اندر جاکے چپ چاپ بیٹھے اور عامل نے بوتل میں کاگ لگا کر ہمیشہ کے لئے انکو زندہ درگور کر دیا۔ یہ سب خیالات نہ مسلمانوں کے تھے اور نہ کسی طرح قرآن شریف سے ان کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ جن کا یہ خیال ہے کہ ایسے جنات اور شیطان کا وجود قرآن سے ثابت ہے وہ قرآن شریف پر بہتان کرتے ہیں۔

شیطان کے غیر مادی ہونے کی حالت میں کسی قسم کا اعتراض قرآن شریف پر کوئی ذی علم نہیں کر سکتا خدا نے نہ معلوم کیا کیا چیزیں پیدا کیں جن کے جاننے سے ہمارے حواس قاصر ہیں۔

ہمارے لئے اتنا ہی جاننا کافی ہے کہ شیطان میں یہ قوت نہیں ہے کہ گدھا بن جائے اور جب اس پر لڑکے سوار ہو جائیں تو وہ ہوا ہو جائے اس کے بعد اس کا غیر مادی ہو کر موجود فی الخارج ہونا یا موجود فی الذہن ہونا دونوں برابر ہے اندھے کے لئے جیسا سیاہ رنگ ویسا ہی اجلا رنگ نہ یہی نظر آتا اور نہ وہی نظر آتا۔ لیکن جو لوگ اس غیر ضروری مسئلہ میں خواہ مخواہ حجت کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ شیطان کا وجود خارجی نہیں ہے محض ذہنی ہے ان سے ہم اتنا ہی کہیں گے کہ یہ قرآن شریف کے منافی نہیں ہے۔ خدا نے جس چیز کی حقیقت نہیں بتائی اس کو جس طرح چاہو سمجھ لو۔ شیطان کا وجود اگر ذہنی ہونا مانا جائے گا تو وہ نفس انسانی کی ایک قوت ٹھہرے گی اور پھر اسکی ہیبت وہ ہو گی جو ایسے خیال والوں کی تسکین خاطر کے لئے قصص قرآنی فصل ۵۳ میں ابوالبشر آدم کے ذیل میں بیان کی گئی ہیں۔ اسی طرح جو لوگ جنات کے غیر مادی ہونے پر اکتفا نہیں کرتے اس کے وجود خارجی سے بھی انکار کرتے ہیں تو ان کے لئے قرآن کی سورہ جن کے معنی وہ کہے جائیں گے جو ہم آگے بیان کرتے ہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ قرآن میں جو معنی چاہے نکالے تو یہ قرآن کا ہے کو ہوا دل لگی ہوئی۔ اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ قرآن میں جہاں تک اوامر و نواہی ہیں وہاں ذرا بھی رد و بدل کی گنجائش نہیں ہے جاہل سے جاہل اور عالم سے عالم ایک ہی معنی سمجھے گا اور جہاں اخلاق حسنہ کی تعلیم مقصود ہے گذشتہ زمانے کے حالات یاد دلانا اور موجودہ زمانے کی برائیوں سے نفرت دلانا مقصود ہے اور اسی ضمن میں رجا و بیم کا بھی ذکر ہے۔ قومی خیالات کی طرف بھی اشارہ ہے علمی باتیں بھی بقدر ضرورت بیان کی گئی ہیں وہاں چیزوں کا نام بیان کرنا ناگزیر ہوا ہے لیکن انکی حقیقت بیان کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ کچھ تو اس لئے کہ ایسا بیان معرض بحث سے الگ ہو جاتا تھا اور کچھ اس لئے کہ ہر طبقہ اور ہر قرن کے مناسب حال نہ ہوتا۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنے پندار کے مطابق جس طرح چاہے سمجھے۔ لیکن عربی زبان میں سمجھے۔ ایسا نہ سمجھے جیسا کہ ایک نے "خرِ موسیٰ" میں موسیٰ کاٹ کر عیسیٰ بنا دیا کہ عیسیٰ کے پاس خر تھا موسیٰ کے پاس نہ تھا اور "عصیٰ آدم" کو عصیٰ موسیٰ بنا دیا کہ انہیں کا عصا مشہور ہے۔ آدم کے پاس عصا کہاں تھا۔

اب ہم سورہ جن کی آیات کے معنی لکھتے ہیں اور دکھلاتے ہیں کہ اس میں جنات کے وجود سے بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ جو لوگ جنات کے وسعت اختیارات کے قائل ہو کر اوہام باطلہ میں مبتلا تھے (یعنی مشرکین عرب) انکی توہین کی گئی۔ قبل اس کے کہ ہم آیات کا ترجمہ لکھیں

شان نزول اور مفہوم بتا دیتے ہیں اس کے بعد آیات کا ترجمہ لکھیں گے کہ پڑھنے والے خود بخود سمجھتے چلے جائیں۔ سمجھانے کی ضرورت نہ ہو۔

عرب میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو مسلمانوں کی نصیحتوں کا سننا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے اور اس لئے وہ چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے ان میں عیسائی بھی تھے کفار بھی تھے یہود بھی تھے مجوسی بھی تھے یہ لوگ چھپ کر قرآن سنتے تھے۔ جب بھی مسلمان ہو جاتے تھے اپنے عقاید سے پھر جاتے تھے اور اعلانیہ اپنے عقاید کی تکذیب کرتے تھے۔ قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ چھپ کر سننے والے جب قرآن سنتے تھے تو وہ عیسائی ہونے کی حالت میں یہ کہتے ہیں کہ خدا بڑا ہے اس کی شان سے بعید ہے کہ اس کے کوئی جورو ہو یا لڑکا ہو اور ہم میں جو احمق ایسا کہتے تھے وہ خدا پر اتہام کرتے تھے ورنہ انسان یا جنات کوئی بھی جب عقل رکھے گا تو خدا پر جھوٹ نہ بولے گا۔ یہ عیسائی بیشک جنات کے قائل تھے اور انھیں کا یہ قول تھا کہ انس و جن یعنی آدمی یا اور کوئی ارواح مخفیہ اب خدا پر جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کریں گی۔ کفار عرب جب قرآن چھپ کر سنتے تھے تو وہ اپنے عقاید سے پھر جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم میں جو لوگ جناتوں سے پناہ مانگتے تھے اور اس طرح وقار بڑھاتے تھے وہ جھوٹے تھے۔ فی الواقع ان کا کوئی وقار نہ تھا۔ اصلی وقار محمد رسول اللہ صلعم کا ہے۔ جناتوں کے وقار بڑھانے والے بعض مشرکین عرب ویسے ہی تھے جیسے کہ اس زمانے کے عامل خود کو جناتوں پر قابو پانے والا سمجھتے ہیں اور جناتوں کی بڑی بڑی داستانیں سناتے ہیں۔ اور یہودی کہتے تھے کہ بیشک لوگ سمجھتے تھے کہ اب خدا کسی کو اپنا پیغبر نہیں کرے گا۔ لیکن یہ بات آنحضرت محمدؐ کی رسالت سے صریح غلط ثابت ہوئی۔ مجوسیوں میں وہ با وقار نجومی تھے جو ستاروں کی گردش سے سعادت اور نحوست کا اندازہ کرتے تھے اور غیب کی باتیں بتاتے تھے۔ مجوسی دین اسلام قبول کرنے کے بعد کہنے لگے کہ جتنے ڈھکوسلے ہمارے پیشواؤں کے تھے۔ وہ سب اس دین برحق کے سامنے غلط ہو گئے۔ وہ دن گئے کہ نجومی آسمان کی باتیں بیان کرتے تھے اب وہ آسمان کی باتیں نہیں لاتے اور اپنے سابق پیشواؤں کے لئے بطور طنز کہتے تھے کہ اب گویا نجومیوں کے لئے آسمان پر چوکیدار بیٹھے ہوئے ہیں اور آگ کے شعلے سے آسمان بھرا ہوا ہے کہ انکے پر وہاں پر جاتے ہوئے جلتے ہیں۔ پہلے ہم میں ایسے بھی تھے جو لمبی چوڑی باتیں بناتے تھے گویا آسمان میں بیٹھ کر خدا کی باتیں سنتے تھے اب وہی لوگ ہیں کہ انکے لبوں پر مہر سکوت لگ گئی ہے اور گویا وہ آسمان پر جانے نہیں پاتے۔ وہ جائیں تو آگ کے شعلے انھیں جھلسا دیں۔

مفصلہ بالا بیان سے صریح ظاہر ہے کہ آسمان پر چوکیداروں کا بیٹھنا اور شہاب ثاقب کا (فرشتوں کا اگن بان۔شعلہ آتشیں) ہونا اسلام کا عقیدہ نہیں ہے بلکہ یہ عقیدہ اسلام سے قبل تھا اور نومسلموں کا یہ بیان تھا کہ یہ سب خیالات ہم لوگوں کے اسلام نے غلط کر دیئے لیکن ایک امر پھر بھی بحث طلب رہ جاتا ہے وہ لفظ " جن " ہے جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے چھپے ہوئے آدمی۔ یہ لغوی معنی صحیح ہیں لیکن مجازاً چھپی ہوئی ارواح پر بھی اسکو عرب بولتے تھے اب گفتگو یہ ہے کہ جن لوگوں کا شروع آیت میں چھپ کر سننا بیان کیا گیا ہے وہ انسان تھے یا از قسم ارواح تھے اگر وہ انسان سمجھے جائیں تو معنی بہت ہی قرین فہم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اور اگر وہ از قسم ارواح سمجھے جائیں تو ذرا بعید از فہم ہوتا ہے لیکن محال نہیں ہوتا۔ ان ارواح میں بھی عیسائی۔ کفار، یہود اور مجوسی کا ہونا ممکن ہے اور پھر مفہوم صاف ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اگر جن کو اس پچھلے معنی میں لیں جب بھی صرف ارواح مخفیہ کا وجود قرآن سے ثابت ہوتا ہے۔ جنکو تمام عقلائے زمانہ مختلف حالتوں سے صحیح مانتے چلے آتے ہیں لیکن ان سے ان ارواح یا جنوں کا وجود ثابت نہیں ہوتا جن کو جہلا مانتے ہیں۔ قرآن میں صرف لفظ جن آیا ہے اسکی ماہیت نہیں بتائی گئی ہے اور اس لئے وہ خیالات مسلمانوں کی طرف کسی طرح منسوب نہیں ہو سکتے جنکو ہم نے شروع میں تمام جہلائے عالم کی طرف منسوب کیا ہے۔

اب ہم قرآن کی آیتوں کا ترجمہ لکھتے ہیں۔

"پیغمبر کہو مجھکو وحی سے معلوم ہوا ہے کہ چند چھپے ہوئے شخصوں (جنوں) نے قرآن سنا تو کہا کہ میں نے عجیب طرح کا قرآن سنا جو راہ نیک دکھاتا ہے ہم تو اس پر ایمان لائے اور آئندہ ہم کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ ٹھہرائیں گے اسکی بڑی اونچی شان ہے نہ کوئی اس کی جورو ہے اور نہ اس کا کوئی بیٹا ہے۔ ہم میں جو احمق تھے وہ خدا کی نسبت بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے تھے۔ ہم تو ایسا سمجھتے تھے کہ آدمی اور جن کوئی بھی خدا پر جھوٹ بول سکتا ہے۔ اور بے شک ایسے لوگ بھی تھے جو جناتوں سے پناہ مانگتے تھے اور اس طرح ان کا تکبر زیادہ بڑھ گیا تھا اور بے شک لوگ سمجھتے تھے جیسا تم سمجھتے ہو کہ خدا کوئی پیغمبر نہیں بھیجے گا اور بلا شبہ ہم نے ڈھونڈ ڈالا آسمانوں کو تو اس کو بڑی مضبوط چوکیوں اور شہابوں (آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں) سے بھرا ہوا پایا۔ پہلے تو آسمان میں بہت سے ٹھکانے تھے جہاں ہم سننے کے لئے بیٹھا کرتے تھے۔ لیکن اب کوئی سننے کا قصد کرے تو ایک شہاب اپنے لئے تیار پائے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس سے زمین کے رہنے والونکو کچھ نقصان پہنچانا مقصود ہے یا ان کے پروردگار کا ارادہ ان کے حق

میں بہتری کرنے کا ہے۔ ہم میں سے کچھ نیک ہیں اور کچھ برے ہیں۔ ہمارے فرقے مختلف ہیں۔ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم نہ تو زمین میں رہ کر خدا کو ہرا سکتے ہیں اور نہ کسی طرح بھاگ کر اس کو ہرا سکتے ہیں۔ ہم نے جب راہ کی بات سنی تو ہم اس کو مان گئے۔ اب جو شخص اپنے پروردگار پر ایمان لائے گا اسے کسی نقصان یا ظلم کا ڈر نہ ہوگا۔ ہم میں فرماں بردار بھی ہیں اور نافرمان بھی ہیں جنھوں نے فرماں برداری کی انھوں نے سیدھا راستہ پایا اور جنھوں نے سرتابی کی وہ دوزخ کے کندے ہوئے[1]۔

اور دوسرے مقام پر سورہ ناس میں ہے۔

"تو کہہ میں آدمیوں کے رب۔ آدمیوں کے بادشاہ اور آدمیوں کے معبود کی پناہ میں آیا۔ وسوسہ ڈالنے والے خناس کی برائی سے جن ہو یا آدمی[2]"

اس سورہ میں بھی جن کی ماہیت بیان نہیں کی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی روح ہو اور یہ بھی ممکن ہے عرب میں جس طرح جنات کو با اختیار سمجھ کر خیر و شر پر قادر جانتے تھے انھیں کے خیال کے مطابق ارشاد ہوا ہے کہ شیطان جو دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے اسے جنات سمجھو یا انسان ان میں سے کوئی بھی پیغمبرؐ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا جب وہ اللہ کی امان میں ہے اور اس کا یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ جو انسان خدا سے امان طلب کرے گا پھر اسے کسی سے گزند نہ پہنچے گا۔ اس سورہ میں جن کے اختیارات کی صریح نفی ہوتی ہے اور اسی سے اسلام کو بحث ہے انکی نوعیت

---

[1] قل اوحی الی انہ استمع نفر من الجن فقالوا انا سمعنا قرآناً عجباً یہدی الی الرشد فامنا بہ ولن نشرک بربنا احداً وانہ تعلی جد ربنا ما اتخذ صاحبۃ ولا ولدا وانہ کان یقول سفیہنا علی اللہ شططاً وانا ظننا ان لن تقول الانس والجن علی اللہ کذباً وانہ کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن فزادوہم رہقا وانہم ظنوا کما ظننتم ان لن یبعث اللہ احدا وانا لمسنا السماء فوجدناہا ملئت حرساً شدیداً و شہباً وانا کنا نقعد منہا مقاعد للسمع فمن یستمع الان یجد لہ شہاباً رصداً وانا لا ندری اشر ارید بمن فی الارض ام اراد بہم ربہم رشداً وانا منا الصلحون ومنا دون ذلک کنا طرائق قدداً وانا ظننا ان لن نعجز اللہ فی الارض ولن نعجزہ ہرباً وانا لما سمعنا الہدیٰ امنا بہ فمن یومن بربہ فلا یخاف بخساً ولا رہقا وانا منا المسلمون ومنا القاسطون فمن اسلم فاولئک تحروا رشداً واما القاسطون فکانوا لجہنم حطباً۔

[2] قل اعوذ برب الناس۔ ملک الناس الہ الناس من شر الوسواس الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس۔

یا ماہیت کا بیان نہیں کیا گیا تو ان کا وجود اور عدم وجود دونوں برابر ہے۔ اور اگر یہ مان لیں کہ جن کو عرب جن معنوں میں سمجھتے تھے انھیں معنوں میں قرآن میں بھی استعمال کیا گیا جب بھی کوئی حرج نہیں مخاطب کے خیال کے مطابق یہ کہنا کہ جس کو تم اس قدر با اختیار سمجھتے ہو وہ خدا کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ان کے وجود اور اختیارات کا ایک حد تک قرآن میں اقرار کیا گیا ہے۔ بہرحال ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ جن اور شیطان وغیرہ کے جو اختیارات جہلا میں مانے جاتے ہیں قرآن سے (نعوذ باللہ من ذالک) اسکی تائید نہیں ہوتی۔

فصل نمبر ۵۵

قومی ترقی

شخصی ترقی کے وسائل کوئی ہم سے پوچھے تو ہم سیکڑوں ہی گنا چلیں لیکن قومی ترقی یا تنزل کے اسباب کا بتانا کیا سمجھنا بھی مشکل ہے۔ یہ سوچنا تو آسان ہے کہ قوم ترقی پر ہے اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کس طرح کی جائے۔ اس سے کس طرح خود کو محفوظ رکھا جائے اپنی کمی کیونکر پوری کی جائے لیکن دوسری ترقی یافتہ قوم کے ہم پلہ یا اس سے بڑھ کر اپنی حالت کیونکر بنائی جائے یہی معنی ہیں ترقی کے ا یہ نہایت مشکل اور انسان کے اختیار کے بالکل باہر ہے۔

دیوار چین کے عرض وطول اور استحکام سے چینیوں کی پچھلی ترقی کا جو اندازہ کیا جاتا ہے۔ وہ بہت ہی حیرت افزا ہے۔ کسی طرح اس زمانے میں اس کے سمجھنے کا پورا مقیاس سمجھ میں نہیں آسکتا قرآن میں جو لفظ ذوالقرنین کا آیا ہے بعض مسلمان مورخوں نے اسے خاقان چین سمجھا ہے۔ اور ہمارے نزدیک بجا سمجھا ہے چینیوں کے پچھلے کارنامے بالکل ناپید ہو گئے۔ چینیوں کا جو زمانہ پلٹا تو ایسا کہ گویا کچھ تھا ہی نہیں۔ دور نہ جایئے اس کے قریب ہی جاپان ہے۔ پچھلے زمانے میں جاپانیوں کو چینیوں کی غلامی کی قابلیت بھی نہ تھی۔ لیکن اب جو حالت جاپانیوں کی ہے اس کے اندازہ کرنے کی بھی قابلیت چینیوں کے پاس نہیں ہے۔ ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

بیشک چینیوں کو دوسری قوموں کے غلام ہو کر زندگی بسر کرنے کی نوبت کبھی نہیں پہنچی۔ لیکن اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ترقی یافتہ قوموں سے بُعد رہا۔ اگر کوئی قوم بڑھی بھی تو مضافات چین تک پہنچتے پہنچتے اس کا زور گھٹ گیا۔ چین کسی طرح اپنا گزران کئے جاتا ہے۔ لیکن پوری آزادی سے وہ مدت ہوئی بے نصیب ہے۔ پہلے آتش پرستوں تاتاروں اور مسلمانوں سے وہ تنگ تھا اور

اب یورپین سلطنتوں کی شعاعیں بالکل اسکی آنکھیں خیرہ کر رہی ہیں۔

مصر کا وہ عروج جب اس کے سلاطین فرعون کہلاتے تھے کیسا کچھ تھا۔ تاریخوں کے صفحے الٹیئے تو معلوم ہو کہ کیسے کیسے کارہائے نمایاں اس قوم سے ہوئے ہیں۔ مصر کی گزری ہوئی حالت کی ایک یادگار یہ ہے کہ یونان کو اس نے اس قابل بنا دیا کہ آج اس کو دنیا کی تمام مہذب قوموں کے استاد ہونے کا دعویٰ ہے۔ اور پھر مصر کو زوال آیا تو یوں آیا کہ میناروں اور چند زراعتی چیزوں کے سوا اور کوئی شے اس امر کے بتانے والی نہ رہی کہ اس ملک کو کسی زمانے میں تمام روئے زمین سے وہ نسبت تھی جو انسان کو دوسرے حیوان سے ہے یا انسان کے دماغ کو دوسرے اعضا سے ہے۔

ایک زمانہ بنی اسرائیل کا وہ تھا کہ مصر کے قبطی ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے تھے جیسا ہندوستان کے برہمن چماروں کے ساتھ کرتے ہیں اور اگر پچھلے زمانے کے طرز و تمدن پر لحاظ کیجئے تو اس سے بھی بدتر اور پھر حضرت موسیٰ کے زمانے میں بنی اسرائیل کی ترقی کی جو بنیاد قائم ہوئی تو ایسی کہ دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتی اور اس کے ساتھ ہی یہ قوم گری تو ایسا گری کہ خود اس قوم کے اسلاف اپنے بزرگوں کی ترقی کا اندازہ نہ کر سکے اور جن باتوں کو ان کے بزرگوں نے دنیاوی ترقی کے انتہائی زور میں کر ڈالا تھا اسکو ارواح کی تاثیر پر لوگ محول کرنے لگے حضرت سلیمان (جنکو اہل کتاب مسلمان پیغمبر کہتے ہیں) جو بنی اسرائیل کے ایک بڑے بادشاہ گزرے ہیں انکی نسبت لوگ کہنے لگے کہ دیو انکے زیر فرمان تھے اور پریاں ان کا خانہ باغ اور عیش محل آراستہ کرتی تھیں یہی ایک مثال انتہائی ترقی اور انتہائی زوال کے سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اس وقت ریل تار برقی۔ برقی روشنی، دخانی جہاز، مختلف کلیں جو یورپ اور یورپ کی بدولت افریقہ اور ایشیا میں دیکھی جاتی ہیں قومی ادبار کی وجہ سے مٹ جائیں۔ قومی زور گھٹ جائے یورپ کے کارخانے بند ہو جائیں۔ کاریگری اٹھ جائے۔ جاہلیت کا زمانہ آجائے تو چند صدیوں کے بعد ان چیزوں کی نسبت لوگ ویسی ہی رائے قائم کرنے لگیں گے جیسی حضرت سلیمان کے کارناموں کے سمجھنے کے لئے دیو اور پری کے وجود کو ماننے کی ضرورت پڑی حتیٰ کہ مسلمانوں کے بعض فرقوں کے عقیدے کے مطابق خدا کو بھی قرآن میں عوام کے سمجھانے کے لئے انھیں الفاظ کے استعمال کی ضرورت پڑی جس طرح ہندوستان کے بڑے بڑے ہیرو کی نسبت خارج از عقل باتوں کے سمجھنے کے لئے منتر جادو، معلوم نہیں کیا کیا باتیں فرض کرنا پڑیں کیونکہ انسان کو جہالت کی تاریکی

میں عجائبات دنیا دمی کے ساتھ تائید غیبی یا امداد ارواح کے مان لینے میں اور اس طرح تمام کاوشوں سے چھٹکارا پانے میں جو آسانی ہے کسی میں نہیں۔ ہندوستان کے متعدد شہروں کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بارہا بسے اور اجڑے۔ عام لوگوں میں ایک نقل مشہور ہے کہ حضرت خواجہ خضر نے کسی بزرگ سے ملاقات کی اور عندالاستفسار خواجہ صاحب نے بیان کیا کہ دہلی سات مرتبہ اجڑی اور بسی اور کوتوالی کو بتایا کہ یہ مقام ہمیشہ خطرناک رہا۔ آبادی کی صورت میں سیاست گاہ رہا۔ شہر دریا برد ہوا تو یہاں بھنور میں لوگ ڈوبتے تھے اور جنگل کی حالت میں درندہ جانور رہتے تھے۔ اس نقل سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اس کو باور کرتے ہیں کہنے کا منشاء یہ ہے کہ دنیا جب سے قائم ہے تب سے معلوم نہیں کیسی کیسی ایجاد کیسی کیسی قومی ترقی ہوئی اور پھر اس طرح مٹی کہ قیاس کو بھی دخل نہ رہا کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ کیا کیا عمارتیں بنیں اور بن کر اس طرح منہدم ہوئیں کہ نشان تک باقی نہ رہا۔ ایک ویران جگہ کو دیکھ کر کبھی قیاس نہیں ہو سکتا کہ یہاں کسی زمانے میں موتی محل تھا اس کے ساتھ ایک پائیں باغ بھی تھا۔ دنیا کے مشہور کاریگروں نے آکر بنایا تھا شام کو شہنشاہ وقت اپنی بیگم کے ساتھ یہاں سیر کرتا تھا۔ فوارے چھوٹتے تھے۔ جابجا حوضوں میں مچھلیاں تیرتی تھیں۔ رنگ برنگ کے پھول تھے اور طرح طرح کے سبزہ زار کی کیاریاں تھیں۔ اب کیا ہے کہ سر شام سے گیدڑ بولتے ہیں۔ عوام میں بھوت کے رہنے کی جگہ سمجھی جاتی ہے دن دوپہر یہاں کوئی آئے تو ڈر جائے بس یہی حالت قوم کی ہے ایسی ایسی قومیں مٹ گئیں کہ ان کا کچھ اثر تک باقی نہیں رہا۔ ہمارے نزدیک تو عمدہ قیاس یہ ہے کہ جس قوم کو جتنا ہی ذلیل حالت میں دیکھو تو سمجھو کہ کسی زمانے میں وہ اتنی ہی باوقعت تھی اگر قوم کے مرنے جینے کا نام تناسخ ہوتا تو بہت ٹھیک تھا اور کیا عجب کہ اسی معنی میں تناسخ کا خیال ابتداً ظاہر کیا گیا ہو ہندوستان کی پچھلی ترقیوں کا تذکرہ کرنا عبث ہے۔ تمام اسکولوں کے بچے اسے جانتے ہیں اور انگلستان کی پچھلی حالت کا بیان کرنا بھی غیر ضروری ہے۔ کوئی تعلیم یافتہ اس سے لاعلم نہیں ہے بھلا اپنی پچھلی ترقی میں تو ہندوستان کوئی ملک اپنا ہمسر نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس گئی گزری حالت پر یعنی مسلمانوں کی فتح کے بعد بھی وہ ایسا تھا کہ دو تین سو برس پہلے انگلستان کو اس سے کوئی نسبت کسی قسم کی نہ تھی۔ اللہ نے یورپ کو ترقی دی تو اس کے ساتھ انگلستان کو بھی بڑھایا اور ایسا بڑھایا کہ وہاں کے تاجروں کے گروہ اگر ہندوستان کی بگڑی ہوئی حالت سنبھالنے میں مدد نہ کرتے تو معلوم نہیں اسکی حالت کہاں تک ابتر ہو جاتی۔ اس کا کوئی سبب نہیں قانون قدرت

یوں ہی ہے کہ ایک گھٹتا اور دوسرا بڑھتا رہتا ہے۔ تلک الایام نداولہا بین الناس۔

یونان کا جب زمانہ تھا تو علم و دولت، بہادری، صناعی، خدا پرستی، تمام صفتوں میں اس کو کمال حاصل تھا اور صرف یورپ کی سلطنتوں میں نہیں بلکہ تمام دنیا کی سلطنتوں میں اس کا درجہ بڑھا ہوا تھا اور اب بھی وہی یونان ہے کہ یورپ کی تمام سلطنتوں سے ہر اعتبار میں گھٹا ہوا ہے۔ اس قومی ادبار کو ہندوستان کے عام باشندے یوں تعبیر کرتے ہیں کہ تختہ یونان الٹ گیا سارا ملک قعر میں چلا گیا گرد و نواح کے لوگ کسی اہم کام پر غور کرنا چاہتے ہیں تو جہاز لے جاکر وہاں ٹھہرا دیتے ہیں۔ ہوا میں اب بھی وہی ذہانت ہے۔ وہاں ٹھہرنے سے رائے ایسی صائب قائم ہوتی ہے۔ کہ دوسری جگہ ممکن نہیں۔ اس عام پسند حکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ترقی یونان کی کسی زمانہ میں تھی وہ لوگوں کے نزدیک ایسی نہ تھی کہ مرور زمانے سے بالکل ناپید ہو جاتی اور اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ خطہ ہی آبادی کے قابل نہ رہا جہاں ملایک صفت لوگ پیدا ہوتے تھے۔ یہ بالکل غلط ہے کہ خطہ الٹ گیا۔ ملک وہی زمین وہی۔ آب و ہوا وہی۔ نسلیں وہی، سب کچھ وہی۔ بس خدا کی مشیت جسکو اقبال کہتے ہیں البتہ نہیں ہے

ایران کی سلطنت بہت قدیم ہے۔ مشہور ہے کہ کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے، پہننے اوڑھنے کے سارے سارے طریقے ایران سے نکلے۔ ایران کی ابتدائی ترقی کا زمانہ کسی طرح دریافت نہیں ہو سکتا۔ یہ ابتدا رسے ترقی پر تھا اور ہمیشہ ترقی پر رہا۔ چینیوں سے، ترکوں سے، مصریوں سے اور یونانیوں سے برابر اس کا مقابلہ رہا؛ جنگ دو سر دارو۔ جیتنے ہارنے کی کوئی بات نہیں یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ لیکن قومی تنزل اسے اسلام سے قبل کبھی نہیں ہوا۔ ہر اعتبار سے ایران دنیا میں استاد سمجھا جاتا تھا اس کے برابر ہی عرب کی ایک خانہ بدوش قوم تھی (شہری تھے لیکن وہ بھی خانہ بدوشوں کی صفت سے متصف تھے) جو ہمیشہ ایران کی ماتحت رہی اگر یوں سمجھو کہ ایران کو اس کا ماتحت رکھنا ملک کے افلاس و ناداری کی وجہ سے وبال جان تھا تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک خود مختار آزاد قوم تھی۔ لیکن آزادی ایسی ہی جیسے کسی احمق غلام سے یہ سمجھ کر کام نہ لیا جائے کہ وہ کوئی بات سمجھ نہیں سکتا کام کیا کرے گا خدا کو منظور ہوا کہ اس نکمے ملک کو بھی عزت دی جائے۔ یہ ملک جیسا ہی گرا ہوا تھا ویسا ہی اعلیٰ درجے پر اس کا عروج پہنچا ایک بے لکھے پڑھے غیر متمول (یعنی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے عرب ہی کی نہیں بلکہ کل دنیا کی اصلاح خالق کو منظور ہوئی ایک دن وہ کہہ پڑا کہ ہم کو اللہ نے حکم دیا ہے کہ ہم لوگوں سے کہیں کہ وہ اللہ کو پہچانیں دیکھئے قوم کی

ترقی کی یہی جڑ بندھتی ہے۔ جن لوگوں نے اس پر اعتبار کیا وہ پیغمبرؐ کے پیرو ہوئے اور جو منکر ہوئے وہ کافر سمجھے گئے ان مومنوں پر ان کے کافر اعزہ کی طرف سے زیادتیاں ہونے لگیں۔ اس لئے بچاؤ کے لئے فوجی قوت کی ضرورت ہوئی۔ دوسرے ملکوں سے خط و کتابت کی ضرورت ہوئی تو لکھے پڑھے لوگوں کی بھی قدر بڑھی۔ جلاوطن نومسلموں کے لئے روپے پیسے کی ضرورت ہوئی اور اس کے بہم پہنچانے کے لئے بیت المال جو قائم ہوا وہ آگے چل کر خزانہ شاہی بن گیا غرض کہ دس بارہ برس میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد پڑ گئی اور پھر تو تمام دنیا کے علوم اور تمام دنیا کی صنعتیں مسلمانوں نے سکھیں۔ تمام علوم و فنون کے ماہر مسلمانوں کے پاس آکر جمع ہو گئے اور اس طرح عرب بھی یہ کہنے کے قابل ہوا کہ ہمارے کارنامے بھی تاریخی دنیا میں بے نظیر ہیں۔ جہالت۔ نااتفاقی۔ کم ہمتی۔ بے زری۔ بدخلقی۔ بے ہنری یہ سب باتیں قوم کے ادبار کا سبب سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن غور کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ قومی ترقی اور تنزل میں ان باتوں کو کوئی دخل نہیں۔ شخصی موت کے ساتھ قومی موت کو پورے طور پر تشبیہ دے سکتے ہیں۔ مرنے کے لئے کسی بیماری کی خصوصیت نہیں ویسے ہی قوم کے تنزل کے لئے کوئی سبب معین نہیں کیا جا سکتا۔ قوم کے تنزل کے وقت ہمیشہ ایک نیا سبب پیدا ہو جاتا ہے ایران اور یونان پر مسلمانوں کے فتحیاب ہونے کے حالات دیکھیئے۔ قدرت خدا نظر آتی ہے۔ ہم یہاں صرف ایران کا تذکرہ کرتے ہیں ایران میں کوئی کسی قسم کے آثار نکبت یا قومی تنزل کے نظر نہیں آتے تھے اس کے چراغ کی روشنی بدستور قائم تھی۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ عرب کی مشعل کے سامنے خواہ مخواہ اس کی روشنی جاتی رہی اسلام کے پھیلنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد دفعتہً عربوں نے ایران کا قصد کر دیا۔ فوج لب دریا پہنچی جسکے عبور کرنے پر ایران کی سرحد اور ایران کا پائے تخت تھا۔ عربوں کے پاس تلوار اور گھوڑوں کے سوا اور کیا سامان تھا۔ کشتیاں ایرانیوں نے اپنی طرف منگوالی تھیں یا ڈبوا دی تھیں۔ عربوں نے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے۔ گھوڑے تیرنے لگے اسی اثنا میں ایک سپاہی کی کمر میں لکڑی کا پیالہ بندھا تھا اور وہی اس کا سارا اثاثہ تھا پیالہ کسی طرح کھل کر دریا میں بہہ چلا ذرا اس کے استقلال اور قوم کے اقبال پر غور کیجئے دوسرے ملک پر چڑھائی جان جوکھم کا سودا۔ گھوڑا ابحر ذخار میں تیر رہا ہے جان کے لالے پڑے ہیں ان سب باتوں کا خیال نہیں۔ میاں سپاہی کو یہ سوچ پیدا ہوا کہ ملک فتح ہونا تو اتفاقات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ میرا اثاثہ جو بہا جاتا ہے "نقد را بہ نسیہ گزاشتن کار خردمنداں نیست" اس کو تو کسی طرح جانے نہ دینا چاہیئے۔ اب میاں سپاہی نے اسی پیالے کے پیچھے گھوڑا ڈالا۔ اور

پیالے کے ساتھ گھوڑا بھی دھار میں چلا۔ تھوڑی دور جا کر اس نے پیالہ پایا اور پھر فوج کی طرف پھرا یوں تو نام سن سن کر ایرانیوں کا اقبال روگردانی کر رہا تھا۔ اس حملہ کی کیفیت دیکھ کر بھلا کسے تاب مقابلہ تھی کچھ ایسی لڑائی بھی نہ ہوئی اور عربوں کا قبضہ ایران پر ہو گیا یا یوں کہو کہ ایرانیوں کی ترقی کا زمانہ ختم ہو گیا اور عربوں کی ترقی کا وقت خود بخود آ گیا۔ اس مہم نے عربوں کی زبان۔ طرز تمدن اخلاق مذہب سب کو ایک دم سے ایران کا حکمران کر دیا۔ جس زبان سے ایرانیوں کو نفرت تھی اب اسی کی تحصیل کا نام سعادت دارین حاصل کرنا سمجھا گیا۔ فردوسی نے اسے یوں نظم کیا ہے۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسیدہ است کار
کہ ملک عجم را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

فصل نمبر ۵۶

ضعف اسلام

ہر کمال کو زوال لازم ہے لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ زوال بلا سبب پیدا ہو جاتا ہے نہیں۔ سبب ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے ضعف اسلام کے اسباب پر ہم غور کریں تو یہ کار بے سود نہ ہو گا۔ اسباب تو بہتیرے بیان کئے گئے اور بیان کئے جائیں گے لیکن ہمارے نزدیک سبب وہی ہے جس کی پیشں گوئی روم کے پادریوں نے کی تھی۔ خلفائے عباسیہ کے عہد میں مسلمانوں نے یونان کے علوم قدیمہ کی کتابیں روم کے بادشاہ سے طلب کیں۔ یہ حکم ایسا تھا جیسے گورنمنٹ انگلشیہ کا والی کشمیر کے نام۔ عدول کیونکر ہوتا۔ لیکن ملکی رسم کے طور پر پادریوں سے کہ یہی ارکان دولت تھے استصواب کیا گیا۔ پادریوں نے سوچ کر کہا اچھا یہ کتابیں مسلمانوں ہی کے پاس جانے دیجئے۔ کسی طرح ان کا زور تو گھٹے۔ ان کتابوں کا آنا تھا کہ مسلمانوں کا زور گھٹنے لگا۔

فلسفہ کی دو قسمیں سمجھئے۔ عملی اور خیالی۔ مسلمانوں کا مذہب خود ایک فلسفہ تھا لیکن فلسفہ خیالی نہیں۔ فلسفہ عملی اگر ہم مشرح بیان کرنا شروع کر دیں تو ایک جدا رسالہ لکھنا پڑے۔ اختصار میں گنجائش نہیں ہے۔ اسوقت صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ خدا کی معرفت۔ محنت اور استقلال۔ یہ باتیں موضوع اس علم کی تھیں جو مسلمانوں کو مذہب اسلام کے ساتھ اعلیٰ درجہ پر تعلیم دیا گیا تھا۔ خیالی فلسفہ کے ترجمہ نے جو اشاعت پائی اس سے اسلام کی خوبیاں زائل ہونے لگیں۔ یقین گھٹتا گیا اور ظن بڑھتا گیا۔ ظنی اور خیالی قوت کے سامنے دماغی اور جسمانی قوت کا زور کم ہو گیا۔ ہمت اور استقلال نے جواب دیا اور ان کے بدلے میں کیا ملا؟ خیالی کمزوریاں۔ خدا کی معرفت اور مذہبی روشنی نے کنارہ کیا نام کے مسلمان باتوں کے شیر رہ گئے جسمی اور روحی ان دونوں قوتوں کے عوض صرف خیالی اور لاحاصل مقدمات کی ترتیب دماغ میں رہ گئی۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسوقت مسلمانوں کو فلسفہ نہ پڑھایا جائے۔ اب کچھ نہیں تو یہی سہی کچھ تو جاننا چاہیئے لیکن جس زمانے کا ہم ذکر کرتے ہیں اس زمانہ میں جو مسلمانوں کے پیغمبرؐ کا پڑھایا ہوا فلسفہ،

سینہ بہ سینہ چلا آتا تھا وہ یونانی فلسفہ سے کہیں اچھا تھا اور اس کی بدولت مسلمانوں نے ابتدا میں ترقی کی تھی اب اس کو کوئی سیکھنا چاہے تو مشکل ہے "مسلمانان در گور و مسلمانی در کتاب"! مسلمانوں کے پیغمبرؐ کے وقت سے کئی صدی بعد تک جو سچا طریقہ زندگی بسر کرنے کا جاری تھا اس میں اس نئے فلسفہ نے خلل ڈال دیا اور خلل ڈالنے کا نتیجہ وہی ہوا جو روم کے پادریوں نے پہلے سوچا تھا۔ فلسفہ پھیلنے کے بعد عرصہ تک مسلمانوں کو عروج رہا لیکن یہ عروج ماسبق کارروائیوں کا نتیجہ تھا۔ ٹرالی کو ریل کی پٹری پر چلا کر تلی بیٹھ جاتے ہیں اور ٹرالی میلوں خود چلی جاتی ہے بس یہی مثال اسلام کے آخری زمانے کی سمجھیے۔ پہلے زمانے میں مسلمانوں نے جو ملک فتح کئے ان کا مقابلہ پچھلی فتوحات سے کرو تو معلوم ہوگا کہ فاتحین کی کارگزاریوں میں کتنا بڑا فرق ہے ابتدائی فتوحات میں مسلمانوں کی محض صحبت سے مسلمان اور پکے مسلمان ہو جاتے تھے اور آخری زمانے کو دیکھو اکبر نے کیا کچھ دلجوئی نہ کی۔ عالمگیر نے کیا کچھ سختی نہ کی مگر ایک بھی کارگر نہ ہوئی۔ وجہ صرف یہی تھی کہ ان میں یا انکے ہمعصر مسلمانوں میں وہ صفت نہ تھی جو اگلے مسلمانوں میں تھی۔ اندلس (اسپین) وہ مقام ہے جہاں کے علم و فضل پر آج تک مسلمان فخر کرتے ہیں لیکن ہم یہ کہیں گے کہ فخر بالکل بیوجہ۔ جب عیسائیوں نے اندلس کے مسلمانوں سے کہا کہ تم سب ایک دم سے نکل جاؤ۔ تو علم و فضل سے کچھ نہ بن پڑا اگر بجائے علم و فضل کے سچا اسلام ہوتا اور مصر اور ایران کی طرح سب مسلمان ہی مسلمان ہوتے تو یہ کون کہہ سکتا تھا کہ ملک خالی کرو پھر ملک کا مسلمانوں سے خالی کرانا ملک کے لئے ایسا ہی دشوار تھا جیسا جسم سے کھال یا ہڈیوں سے گوشت کا علیحدہ کرنا۔ علم و فضل کا ماحصل کیا ہے؟ روحی اور دنیاوی ترقی۔ جب تک مسلمان اپنے مذہبی فلسفہ پر قائم تھے تو یہ دونوں باتیں ان میں اس قدر تھیں جو دوسری قوموں کو آج تک نصیب نہیں ہوئیں تاریخوں کے صفحے الٹنے پر ہمارے اس دعوے کو ایسا ہی سچ ماننا پڑے گا جیسا آفتاب کو روشن اور رات کو تاریک جاننا۔

فصل نمبر ۵۷

مذہبی نفاق

ارکان مذہب کے ادا کرنے کا نام ہے مسلمان ہونا اور بعض کے نزدیک محض ارکان مذہب کا حق جاننا مسلمان ہونے کو کافی ہے یا دوسرے لفظوں میں اللہ اور اللہ کے رسولؐ پر ایمان لانا بس یہی "اسلام" ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ارکان مذہب یا ان کے فرائض کے متعلق مسلمانوں میں اختلاف نہیں ہے دنیا کے کل مسلمان ان کو یکساں مانتے ہیں اور بالکل اختلاف نہیں کرتے لیکن جزوی مسائل جو مستحبات کے درجہ میں ہیں ان میں روایت یا اجتہاد کے اختلاف کی وجہ سے اختلاف واقع ہوا دنیا میں جب تک اسلام قومی تھا ان اختلافات پر کچھ توجہ نہ ہوئی۔ ضعف اسلام کے ساتھ یہ اختلاف بھی ترقی پکڑتا گیا اور ان ہی اختلافات سے جدا جدا فرقے قائم ہوئے۔ قرآن کی آیت "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا" سبھی پڑھا کئے لیکن عمل ایک نے بھی نہ کیا۔ سنی، شیعہ، بدعتی، وہابی، خارجی اہل حدیث، مقلدین بہتیرے فرقے قائم ہوئے اور مذہبی کتابوں میں دیکھو تو ساٹھ ستر فرقے نہ معلوم کیا کیا قائم ہو گئے ان فرقوں کے قائم ہونے کو گویا اسلام کی چادر کہنہ میں سوراخ ہونا یا دیوار اسلام کی اینٹیں کھسکنی سمجھیے اختلاف سے نفاق پیدا ہوا اور نفاق سے زور گھٹتا گیا۔

اس نفاق نے کعبے کو بھی نہ چھوڑا۔ وہاں خانہ کعبہ کے گرد چار مصلے بچھتے ہیں اور چار فرقوں کی جدا جدا نمازیں ہوتی ہیں۔ گو ان میں باہم مخاصمت نہیں۔ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو برا نہیں سمجھتا بلکہ ایک مصلے کا مسلمان دوسرے مصلے پر بے تکلف نماز بھی پڑھ لیتا ہے۔ لیکن ہم تو سیدھے مسلمان ہیں بس اتنا جانتے ہیں کہ پیغمبرؐ یا ان کے اصحاب کے وقت یہ چار مصلے قائم نہیں ہوئے تھے۔

عرب سے جب یہ اختلاف ہندوستان میں آیا تو یہاں اس نے صورت ہی دوسرے طور پر قائم کر لی یہاں ایک فرقہ دوسرے فرقے کے پیچھے نماز کیا پڑھے گا ایک دوسرے کو دشمن اور جہنمی ٹھہرانے لگا جو ذی علم ہیں وہ گو منہ سے کہتے ہیں کہ فرقے برائے نام ہیں اور مسلمان سب ہی ہیں

لیکن دل ان کے بھی متاثر ہیں۔

ان ملاؤں کے پاس کوئی جائداد نہیں۔ جاگیر نہیں۔ اساسہ نہیں۔ سامان نہیں لڑیں تو کس برتے پر جھگڑیں تو کس چیز کے لئے اور لڑنا ٹھہرا ضروری کہ انسانیت کا مقتضا ہے۔ یہی مسجدیں جو اگلے زمانے کے امراء اور سلاطین بنوا گئے ہیں انکی ساری کائنات ہے اسی کے متعلق جھوٹے سچے قصے نکال نکال کر باہم لڑا کرتے ہیں اور اس طرح دل کے ابخرے نکالتے ہیں۔

مسلمانوں میں ابوحنیفہ اور انکے صحابہ بڑے ذی علم اور ذی عقل گزرے ہیں انھوں نے قرآن اور پیغمبر خداؐ کے مقولوں سے اخذ کرکے ایک مجموعہ قانون ترتیب دیا تاکہ لوگوں کو کاروبار میں سہولت ہو اس مجموعہ قانون کے ماننے والے مقلد کہلاتے ہیں اور جو لوگ پیغمبر خداؐ کے اقوال کو پڑھ کر خود اس کے معنی لگاتے ہیں وہ اہل حدیث ہیں ہندوستان میں جو بہت بڑا ادیب اور ذی علم ہوگا وہ البتہ اجتہاد کرسکے گا ورنہ عام طور پر تو تقلید ہی سے کام چلتا ہے۔ حنفیوں کی ہو یا اہل حدیث کی دونوں میں ماحصل ایک ہی ہے۔ شاید کوئی جزوی باتوں میں اختلاف ہو ورنہ اہم مسئلوں میں اختلاف بہت کم ہے۔

دیکھئے بات کچھ نہ تھی لیکن دو نام قائم ہو جانے سے دو فرقے ہوگئے اور آپس میں اس طرح لڑتے ہیں جس طرح ابتدائے اسلام میں مومنین اور کفار قریش کے مقابلے ہوتے تھے۔ معاذ اللہ! بھائیو! کوئی دوسرے مشغلے نکالو۔ یہ کیا کچھ دنوں دہلی میں لڑائی ہوا کی اور اب میرٹھ میں معرکہ جنگ وجدل ہو رہا ہے۔ ہم تو ہزار میں کہیں گے کہ یہ لڑنے والے محض نفسانیت سے لڑتے ہیں لڑنے کا ان میں مادہ ہے اسلام کو ناحق بدنام کرتے پھرتے ہیں۔

بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیابان ہوتا

مولوی محمد شبلی نعمانی نے ابوحنیفہؒ کے حالات اور اعتقادات کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے۔ جہاں سب کچھ لکھا رفع یدین کے متعلق بھی انکی رائے لکھدی ایک صاحب سے نہ رہا گیا انھوں نے فوراً ہی ایک نوٹ اس کے خلاف اخبار میں بھیج دیا اور حنفیوں کی رائے سے اختلاف ظاہر کیا واہ کیا نئی بات لکھی ہے بھلا دنیا میں سوائے آپ کے اور بھی کوئی ان باتوں کو جان سکتا ہے۔ برادر عزیز۔ ان باتوں کے متعلق کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ان باتوں پر غور کرنا مجتہدین کا کام ہے یا ان کا جنھوں نے مذہبی کاموں کے لئے اپنے کو وقف کر رکھا ہے اور وہ بھی آپس میں بحث کے لئے نہیں بلکہ علم شے بہ از جہل شے محض اس لئے کہ مذہب کے متعلق کوئی مسئلہ بے سمجھا نہ رہ جائے۔ ہم کو آپ کو اس سے کیا بحث یہ مسلّم ہے کہ ہاتھ جوڑ کر یا ہاتھ باندھ کر دونوں طرح نماز درست ہوتی ہے تو پھر اس مسئلہ کو زیر

بحث لانا آپ تو سمجھتے ہیں کہ اقتضائے عالمیت ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر جہالت ہو ہی نہیں سکتی کہ ناحق اپنے وقت عزیز کے ساتھ دوسرے کے وقت کا بھی خون کیا جائے اور بلا وجہ شجر فساد کی جڑ مضبوط کی جائے۔

بعض وقت ایک ہی مذہب کے دو فرقے آپس میں اس طرح لڑنے لگتے ہیں کہ گویا ان میں اخوت مذہب کی ہوا تک نہیں لگی عیسائیوں کی پچھلی تاریخیں پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اختلاف فرقہ یا مذہب کی ضمنی تقسیم کی وجہ سے جو نزاعیں ہوئیں غالباً دو مختلف مذاہب یا دو اجنبی قوموں میں بھی ایسی لڑائیاں کم ہوئی ہونگی۔ اب علمی روشنی نے ان عیسائیوں کی حالت کو اس خصوص میں ایسا درست کیا کہ کہیں سے بھی اس قسم کی تکرار کی صدا نہیں آتی۔ لیکن جہاں نئے علوم نے اپنی روشنی نہیں پھیلائی یا پچھلے علوم تقویم پارینہ کی طرح قوم کے خاص خاص پیشواؤں یا سرداروں کی الماریوں میں بند ہیں وہاں کی کیفیتیں ناگفتہ بہ ہیں۔

اب اس زمانے کے مسلمانوں میں اگر کچھ اسلام ہے تو یہ ہے کہ ایک کو سنی ہونے پر فخر ہے اور دوسرے کو شیعہ ہونے پر ناز ہے۔ مقلدین اپنے آپ کو سب سے بڑا جانتے ہیں اور اہل حدیث اپنے کو سب سے افضل۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ تمام لوگ اپنے ٹھیٹھ مذہب کے مطابق اس معصیت سے بچ نہیں سکتے کہ انھوں نے اسلام کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ضعیف کیا اور جزوی اختلاف کو رکن دین قرار دیکر مذہب کو خراب کیا۔

بالفعل ہندوستان میں جو کبھی کبھی شرمناک لڑائیاں سنیوں اور شیعوں میں ہوتی ہیں وہ بہت زیادہ قابل افسوس اور لائق شرم ہیں ہمارے نزدیک دونوں فریق مسلمانوں کی نظروں میں اہل اسلام ہونے کی حیثیت سے بے وقعت سمجھے جانے کے لائق ہیں۔

افسوس ہے کہ اسلام جو اخوت بڑھانے کے لئے آیا وہ فساد بڑھنے کا سبب سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں سے جہاں تک ہم کو واقفیت ہے ان میں سے شیعہ ایسے لوگوں کو برا جاننا اچھا سمجھتے ہیں جن کے برا کہنے سے سنیوں کے دل دکھنے کا احتمال ہے۔ اور سنیوں کا یہ فعل بھی قابل اعتراض ہے کہ شیعوں کی ان حرکات پر خواہ مخواہ معترض ہوتا وہ اپنے مذہب کا شعار سمجھتے ہیں۔ خدا یا رسول کو کوئی برا کہے تو کچھ نہ بولیں گے لیکن مسلمانان سلف کو کوئی برا کہے تو وہ سر ہو جائیں گے۔

اگر قانون کی نظر سے دیکھیے جب بھی یہ الٹی بات ہے۔ اہل تشیعہ مرے ہوئے بزرگوں کو برا کہتے ہیں جن کا برا کہنا ہرجہ ازالہ حیثیت عرفی کی بنیاد قائم نہیں کر سکتا اور اس کے جواب میں سنی جو زندوں

شیعوں کو برا کہتے ہیں اسی سے لائیل کے لئے بنا رمخاصمت پیدا ہوسکتی ہے۔

مقلدین اور اہل حدیث کے جھگڑے جو دہلی کے گرد و نواح میں آئے دن سنے جاتے ہیں وہ اور بھی حیرت افزا ہیں شرعی طور پر ایک دوسرے کو اگر کچھ کہہ سکتا ہے تو صرف یہ کہ وہ درجہ احتیاط سے گھٹا ہوا ہے لیکن عملی طور پر جو نتیجے پیدا ہوتے ہیں وہ ایسے ہوتے ہیں کہ کافروں کے مقابلے میں بھی اسلام کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔

میرٹھ کے مقلدین اور اہل حدیث کے جھگڑے سنتے سنتے ہم پریشان ہو چلے تھے کہ امروہا، (مرادآباد) کے سنیوں شیعوں کے اختلافات کی صدائیں آنے لگیں۔ ممکن ہے کہ معاملہ خطرناک حد تک نہ پہنچا ہو لیکن اخباروں کو تو ایک مشغلہ ہاتھ آگیا۔ کوئی اخبار اس تذکرہ سے خالی نہیں اڈیٹر سنی ہے تو روداد اس کے ہاتھ میں ہے اور شیعہ ہے تو وہ اپنی طرف کھینچتا ہے حالانکہ معاملہ کچھ نہیں ہے امروہا کے ایک با اختیار اہل دول (رئیس و آنریری مجسٹریٹ) نے کوئی مذہبی کتاب لکھی ہے۔ اور سنیوں اور ان کے پیشوائے مذہب کو برا کہا ہے بس بات اتنی ہی ہے لیکن ممکن ہے کہ بڑھتے بڑھتے بڑھ جائے کوئی مولف سے پوچھے کہ آپ نے کون سی ایسی باریک بات پیدا کی ہے یا اس کتاب کے بغیر قوم کا کون سا کام بند تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ہم سنی حضرات سے پوچھتے ہیں کہ اگر ایک شیعہ بھائی نے اپنے خیال کو ایک رسالے میں ظاہر کیا تو تمہارا کیا نقصان ہوا خواہ مخواہ کو تم شور و غل مچانے لگے اگر مسلمانوں کے کتب خانوں کی تلاشی لی جائے تو کوئی ہزاروں ہی کتابیں ایسی نکلیں گی اگر ایک تعداد اور بڑھ گئی تو کیا ہوا۔ یہ کچھ نہیں۔ نہ کتاب لکھنے کی ضرورت تھی اور نہ کتاب پر اعتراض کرنے کی حاجت تھی۔ دلوں میں لڑائی کا مواد موجود تھا مذہب کو ناحق بدنام کیا۔

شیعوں اور سنیوں کا ایک مقدمہ بڑا دلچسپ لڑا ہے۔ کسی شیعہ نے ایک مسجد بنوائی اور در مسجد پر لکھا " علی خلیفۃ بلا فصل " یعنی بعد پیغمبر خدا کے حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے پیغمبرؐ خدا اور حضرت علیؓ کے درمیان میں جو تین خلیفہ ہوئے ان کو حق خلافت حاصل نہ تھا پوچھیئے اس کے لکھے بغیر اس وقت مسجد کی کیا شان گھٹی جاتی تھی۔ جب خلافت کا جھگڑا تھا اس وقت ان باتوں کا لکھنا کہنا بولنا کچھ مفید بھی ہوتا اب اس لکھنے اور پرانے جھگڑے دن کے یاد دلانے سے کیا فائدہ لیکن اس سے کہیں زیادہ حیرت یہ سن کر ہوئی کہ سنیوں نے دیوانی میں دعویٰ کیا کہ در مسجد سے یہ عبارت نکلوا دی جائے کوئی مدعیوں سے پوچھے کہ اس عبارت نے ان کا کیا بگاڑا۔ اس عبارت کے قائم رہنے سے ان کا کیا حرج۔ اگر در مسجد پر یہ لکھا ہوتا کہ اس مسجد کے گرد جتنی زمین یا مکانات ہیں سب مسجد کے ساتھ مال موقوف سمجھے جائیں تو پڑوسیوں کے

عذر کے واسطے ایک بات بھی تھی۔ تیرہ سو برس کے بعد کسی کی خلافت یا سلطنت سے انکار کیا جائے تو ایک فعل عبث اور انکار پر اعتراض کیا جائے تو اس سے زیادہ عبث۔

فصل نمبر ۵۸

دنیا خوش رہنے کی جگہ نہیں ہے

(دنیا میں کوئی شے ایسی بھی ہے جس کا ذکر ہر شخص کی زبان پر اور جس کی خواہش ہر ایک کے دل میں ہو۔ پیدائش سے موت تک ہر شخص اس کا متمنی ہو۔ لیکن فی الواقع دنیا میں اس کا وجود ہوا اور نہ کسی کو کبھی حاصل ہوئی ہو؟ اس چیستان کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ جب ایک سے کسی کی مطلوب یا معصود ہوئی تو پھر اسکے نزدیک اس کا وجود کسی طرح محال تصور نہیں ہو سکتا۔ لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہو گا کہ ہمارا سوال بے معنی نہیں ہے۔ بھلا سوچو تو یہی خوشی پر یہ تمام باتیں صادق آتی ہیں؟ غور کرنے سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ خوشی ہی ایک ایسی شے ہے جس کو ہر فرد بشر چاہتا ہے لیکن کسی کو بھی وہ حاصل نہیں ہوتی۔ خوشی کے ساتھ غم اور غم کے ساتھ خوشی اس طرح وابستہ ہے کہ کسی طرح ان میں انفصال نہیں ہو سکتا۔ رونے کے ساتھ ہنسنا اور ہنسنے کے ساتھ رونا گویا لازم و ملزوم ہے خزاں اور بہار دو لفظ جدا جدا ہیں لیکن ایک دوسرے کے بعد اس طرح آتی ہے کہ بمشکل کسی زمانے کو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی خزاں ہے بہار نہیں آئی۔ سارے پتے گرے نہیں تھے کہ نئی کونپلیں نکلنے لگیں۔ اگر مسرت کا کچھ وجود ہے تو اسی حیثیت سے۔ ابھی پوری طرح سے جشن شادی ہونے بھی نہیں پایا تھا کہ ماتم کے سامان بندھ چلے۔ یہ تو وہ حالت ہے کہ خوشی برائے نام ہمارے قریب آئی اور فوراً چل دی لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی شاذونادر ہوتا ہے۔ خوشی تو عموماً قریب آنے ہی نہیں پاتی ایک طرف سے اگر کچھ سامان عیش نظر آئے تو دوسری طرف سے کدورت کی صورت دکھائی دے رہی ہے۔ مصیبت کا پلہ ہمیشہ بھاری رہتا ہے۔ الم کے نہ ہونے کا نام ہے خوشی اگر سو میں ننانوے حصہ خوشی کا ہے اور کہیں ایک حصہ رنج کا شامل ہو گیا تو خوشی کہاں باقی رہی؟ غرض کہ دنیا میں خوش رہنا کبھی انسان کو میسر نہیں ہو سکتا۔ نپولین بونا پارٹ ایک مرتبہ جوش ہمت میں کہہ پڑا کہ کوئی امر دنیا میں محال نہیں ہے اس بے معنی لفظ کو لغت سے نکال دینا چاہیئے۔ اس وقت کوئی حاضر جواب نہ ہوا ورنہ بونا پارٹ سے فوراً ہی قبول کرا لیتا کہ دنیا میں خوش رہنا ضرور محال ہے کیونکہ بونا پارٹ جیسے،

باہمت اور مستقل مزاج شہنشاہ سے زیادہ تر شاید کوئی شخص تجربہ کار اس امر کا پیدا نہ ہوگا کہ خوشی ایسی شے نہیں ہے جو اس عالم میں میسر آسکے۔ خوشی ایک محال چیز ہے تو خلقت اسکی متمنی کیوں ہے؟ یہی راز الٰہی یا قدرت خدا ہے خوشی کسی کو میسر نہیں آتی لیکن ہر شخص اپنے سوا دوسرے کو خوش سمجھتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ دوسرے کی طرح وہ بھی خوش رہے۔ یہ تمنا مرتے دم تک ساتھ لے جاتا ہے اور کبھی اسے ایسا وقت نہیں ملتا کہ وہ خوش ہو اور سمجھے کہ اس کے سوا دوسرے ناخوش ہیں دنیا کی حالت تو یہ ہے کہ ایک نان شبینہ کو محتاج ہے اور دوسرا متمول تو ہے لیکن اولاد نہ ہونے کے غم میں مرا جاتا ہے۔ مفلس ہے کہ متمول کو سب سے زیادہ خوش نصیب جانتا ہے اور متمول اس مفلس، صاحب اولاد کو خوش قسمت سمجھتا ہے۔ اسی طرح ایک تو اس لئے ناخوش ہے کہ حکومت کی تمنا اس کا سارا کھیل بگاڑ رہی ہے اور دوسرا ہے کہ بار حکومت سر پر پڑنے سے رات دن بے چین رہتا ہے کسی کو بے زری تباہ کرتی ہے اور کسی کو زر کی حفاظت رات بھر پلک سے پلک نہیں لگانے دیتی۔ ایک نے پیٹ کے خالی رہنے سے رات بھر اختر شماری کی ہے اور دوسرا سوء ہضمی کے درد سے رات بھر گھنٹے گنتا رہا۔ کسی کے گھر شادی کی دھوم ہے رات بھر اہل خاندان کو سونا نصیب نہیں ہوا اور کہیں مالک خانہ کے تابوت پر گھر والوں نے ماتم کرکے صبح کی ہے۔ لیکن شادی کے بعد تمام گھر والے تردد ات کی بے چینی سے پژمردہ اور بے لطف ہو رہے ہیں اور بمقابلہ ان کے ماتم کرنے والوں کا اگلا دن فرحت و انبساط کا رنگ جما رہا ہے۔ رو لینے سے طبیعت ہلکی ہے متعلقین نے سمجھ لیا ہے کہ مرنے والے کے ساتھ ہمارے تمام عیش و آرام بھی مر گئے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب کیا رہا جس پر روئیں۔

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

کسی کا قول ہے اور کیا اچھا قول ہے کہ "فرط غم کا نام ہے انبساط۔ اور فرط انبساط کا نام ہے غم" کسی کے منہ میں زبان ہے کہ خدا کی بے عیب ذات کو عیب لگا سکے؟ ہرگز نہیں۔ لیکن پھر بھی سیکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں کروڑوں ایسے بے سمجھ بندے بھی ہیں جو اللہ میں عدیل ہونے کی صفت کو تسلیم نہیں کرتے "اندھے کہتے ہیں خدایا ہم نے کیا قصور کیا تھا کہ آنکھیں (جو فطرتاً تمام بنی نوع انسان کو دی گئی ہیں) ہم کو نہیں دی گئیں" یتیم بچے کہتے ہیں "ہمارا کیا قصور تھا کہ باپ کا سایہ ہمارے سر سے اٹھا لیا گیا" کتنے شیر خوار بچے اپنی ماؤں کے مرنے پر زبان حال سے کہتے ہیں "رب کریم ماؤں کا دودھ جو تو نے حیوانوں تک کے لئے حلال کر رکھا ہے ہمارے

لئے وہ کس جرم میں حرام کیا گیا" کوڑھی کہتے ہیں۔ جب ہم دنیا کے کسی کام کے نہیں گلے سڑے پھل کی طرح درخت دنیا کی شاخ میں لٹک رہے ہیں تو پھر باغ عالم میں ہمارے لانے یا قائم کرنے کے بغیر تیری قدرت میں کیا بٹہ لگا جاتا تھا۔ اسی طرح لنگڑے لولے گونگے بہرے اپنے اپنے طور پر سب ہی شاکی ہیں راجہ اپنی لاولدی کے غم میں الگ اللہ کی بے انصافیوں سے رو رو کر کہہ رہا ہے "خدایا تو نے دولت مال جاہ و حشم یہ سب لوگوں کے دکھلانے کو دیئے ہیں۔ اختیارات جو ہم کو دیئے وہ اپنی رعایا کی حفاظت کے لئے۔ دولت اس لئے دی گئی کہ شکستہ حال کی خبر گیری کی جائے۔ فوج اس لئے کہ غنیم کی لوٹ مار سے ملک بربادی سے بچایا جائے۔ لیکن وہ شے جس سے میرے دل کو راحت پہنچے آنکھیں ٹھنڈی ہوں تو نے عطا نہ کی۔ بیوہ رانی محل کے اندر بیٹھی گھسیارنوں کو دیکھتی ہے کہ وہ اپنے شوہروں کے ساتھ گھاس کا گٹھا سر پر رکھے ہوئے چہل کرتی ہوئی چلی جاتی ہیں دل میں کہتی ہے خدا ان گھسیارنوں کی سی قسمت بھی تو نے میرے لئے مقدر نہ کی تو میں کیا سمجھوں گی کہ میں بھی کسی قادر مطلق کی بندی تھی۔

عمر ساری تو مصیبت ہی میں گذری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

خدا نے راج دیا حکومت دی۔ لڑکے بالے عزیز یگانے سب موجود اور خوش و خرم رعایا بھی فارغ البال غنیم کا بھی کچھ ڈر نہیں۔ ملک میں پورا امن دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ راجہ سے زیادہ خدا نے کسی کو خوش قسمت پیدا نہیں کیا اور راجہ ہے کہ دو دن سے اس کے دانتوں میں درد ہے یا آنکھ میں ٹیس ہے ۴۸ گھنٹے ہو گئے کہ پلک سے پلک نہیں لگی۔ درد اس شدت کا ہے کہ وہ برداشت نہیں کر سکتا خودکشی کے لئے کئی مرتبہ اس نے تیغہ نیام سے باہر نکالا اور پھر کچھ سمجھ کر رہ گیا۔

جس وقت عبدالملک ابن مروان کو جو اپنے وقت میں دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ تھا مرض موت کی تکلیف نے زیادہ بے قرار کیا اسکی نظر ایک دھوبی پر پڑی جو محل شاہی کے نیچے دھوپ میں کھڑا کپڑے دھو رہا تھا بادشاہ کے منہ سے بے اختیار یہ کلمہ نکلا "اللہ نے اس وقت مجھ سے کہیں زیادہ آرام اس دھوبی کو دے رکھا ہے۔ اس لئے مجھ کو اس دھوبی کے عیش پر رشک آتا ہے"

دنیا میں کوئی غذا نہ ملنے سے مر رہا ہے اور کوئی اس لئے مر رہا ہے کہ ضرورت سے زیادہ کھانا کھا جانے سے تخمہ ہو گیا ہے۔ پہلا تو رزاق مطلق کا اس لئے شاکی ہے کہ اسے غذا نہیں ملی اور دوسرا اس لئے کہ کیوں ملی۔ کوئی برسوں دیہات میں جو کی روٹی اور مٹر کی دال کھاتے کھاتے اکتا گیا ہے شہر میں حلوائی کی دکان پر کھڑا اپنی بے زری سے نالاں مٹھائیوں کی خوشبو سے دماغ تازہ کر رہا

ہے اور دوسرا صفراوی تپ میں مبتلا بستر پر پڑا کراہتا ہے اطبّا کی صلاح سے گھر والوں نے کیوڑے سے بسی ہوئی کھچڑی کی پیالی اس کے سامنے پیش کی ہے۔ مریض ہے کہ اس کو زہر کی پیالی سے بھی زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ مفلس دیہاتی اس صفراوی کی حالت پر رشک کرتا ہے اور یہ صفراوی ہے کہ اس دیہاتی کی صحت کو یاد کر کر کے راتوں کو خدا کی بے رحمی کے شکوے زبان پر لاتا ہے۔ تکلیف مرض سے نیند تو نہیں آتی رات بھر کراہنا یا خدا کا شکوہ کرنا یہ دو مشغلے ہمدم اور ہمدرد ہیں۔ ستر برس کے بڑے میاں کروڑوں روپے کی دولت گھر میں رکھ کر اس حسرت کے ساتھ اپنی جوانی یاد کرتے ہیں کہ اگر کوئی انکی ساری دولت لے کر اپنی جوانی ان کے بڑھاپے سے بدلنا چاہے تو وہ اپنی عین مراد سمجھیں گے اور ایک وہ مفلس نوجوان ہے جسکو فاقہ کشی نے اس طرح جوانی سے بیزار کر دیا ہے کہ وہ چار روپے پر اسے بیچنے کو تیار ہے اور فوج میں بھرتی ہو کر مر کھپ جانے کے لئے کیا کچھ سعی اور کوشش نہیں کرتا۔

دو نوجوان عورتوں میں سے ایک نوجوان مفلس اور دوسری پیر دولت مند کے ساتھ بیاہی گئی اب اللہ کے انتظام پر دونوں کو اعتراض ہے۔ پہلی کو مفلسی ستا رہی ہے اور دوسری کو غیر موانست۔ تیسری نے اگر دونوں باتیں پائیں تو اب اس کو فکر ہے کہ لڑکے بھی بیاہ بعد ہی پیدا ہو جائیں اور ہوں بھی تو زندگی کا بیمہ خدا کے یہاں سے کرا لائیں۔ شوہر بھی تابعدار رہے اور بیوی کی زندگی تک جیتا بھی رہے۔ اور اگر ان باتوں میں کہیں ایک بات بھی پوری نہ ہوئی تو بس پہاڑ سا الزام خدا پر دھر دیا گیا۔ یہ تو کیفیت ان کے دلوں کی ہے جو انتظام عالم اور خدا کی قدرت پر بالانفراد نظر ڈالتے ہیں اور جو اہل دانش ہیں وہ ان سب باتوں پر اکھٹا نظر ڈال کر . . . .

یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دنیا میں نہ کوئی خوش ہے اور نہ کوئی ناخوش ہے کوئی کسی اعتبار سے خوش ہے اور کوئی کسی اعتبار سے خوش ہے خوشی اور رنج کی حالتیں ناپائیدار ہیں۔ اگر سامان عیش یا باعث حزن علی الاتصال قائم رہے تو اس کا وجود دیکھنے والوں کی نظر میں رہ جاتا ہے اس پر کچھ اثر باقی نہیں رہتا جس کو لوگ دائم السرور یا دائم الحزن سمجھتے ہیں۔

اللہ نے دنیا کی ساری نعمتیں ایک شخص کو عطا نہیں کیں کسی کو کچھ دیا اور کسی کو کچھ دیا۔ یہ قصور بندوں کا ہے کہ جو نعمت انکو ملی اسے حقیر سمجھیں اور جو دوسرے کو ملی اسے اچھی سمجھیں خدا کی حکمتوں کو جو اس طرح سمجھے اور خدا کے وجود کو جو اس طرح مانے اسی کو مذہبی اصلاح میں موحد اور خدا پرست کہتے ہیں اور محققوں کا قول ہے کہ جو جتنا ہی بڑا حکیم ہو گا اتنا ہی

بڑا موحد بھی ہو گا اور جو موحد ہو گا اسے دل سے یقین ہو گا کہ خدا کے عدل اور انصاف میں ذرا تامل کرنا عقلاً درست نہیں ہے اور اگر ہم سے پوچھئے تو یہ خیالات جنکے دل میں پورے طور پر مستحکم نہیں ہیں انکو کسی طرح سچی خوشی حاصل نہیں ہو سکتی۔

فصل نمبر ۵۹

لیست الشباب یعود

دہلیز سے نیچے دیوار سے لگی ہوئی ایک بڑھیا بیٹھی ہے کوئی ستر اسی برس کا سن ہو گا بدن پر جھریاں پڑی ہیں۔ گردن ہلتی ہے۔ مزار کے لئے زمین کی جستجو میں پشت بھی خم ہے کثیف کپڑے بدن پر ہیں۔ ہاتھ پاؤں میلے ہیں منہ پر مکھیاں بھنک رہی ہیں شاید آنکھوں کی بصارت میں بھی فرق آگیا ہے۔ ورنہ کچھ تو اسے اپنے جسم کی صفائی کا خیال رہتا۔

پیری و صد عیب ہمیں گفتہ اند

شاید کوئی والی وارث نہیں ہے اس لئے بھیک کے ٹکڑوں پر مدار زلیست ہے مدار زلیست کیا ہے زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔

یہاں کیوں بیٹھی ہے؟ وجہ کھلی ہوئی ہے۔ خود کما سکتی نہیں دوسروں کی کمائی میں حصہ پانے کا آسرا۔ کسی گوشے یا ویرانے میں جا بیٹھے تو کون پوچھتا ہے ایسے لوگ بہت کم ہیں جو کہ ایسے ذوی الحقوق کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر دیتے پھرتے ہیں۔ گزرگاہ پر بیٹھی ہے تاکہ لوگوں کی نظریں پڑیں ہزاروں میں کہیں ایک نے بھی اس کا خیال کیا تو اس کا کام نکل گیا۔

کچھ کہتی بھی ہے؟ کہتی یہی ہے کہ جن لوگوں کو خدا نے کان، ہاتھ۔ آنکھ۔ پاؤں اور دانش، فراست، قوت بازو عطا کئے ہیں ان پر فرض ہے کہ ہم ایسے اپاہجوں کی خبر گیری کریں نہیں نہیں کچھ اور بھی کہتی ہے۔ کہنے کو تو ایک نہایت عمدہ قصہ کہہ رہی ہے۔ لیکن نوجوان لوگو تم میں اس کے سننے اور سمجھنے کی طاقت نہیں۔ ہاں ہو تو اقبال ان تو توا۔ پر عمل کرو تو سمجھ سکو یا اس عمر کو پہنچ کر تم خود قصہ سنانے کے قابل ہو تو شاید تمھاری سمجھ میں آئے۔ قصہ نہایت دلچسپ ہے۔ زبان مقال سے وہ کہنے پر آئے اور تم سننے بیٹھو تو مہینوں ختم نہ ہو لیکن زبان حال سے جو تقریر مختصر وہ سنا رہی ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ جب کوئی لڑکا یا لڑکی کہیں پیدا ہو کیسے

ہی غریب یا مفلس کا گھر کیوں نہ ہو اس کی پیدائش سے اپنے بیگانے سارے محلہ والوں کو خوشی ہوتی ہے ہر ایک دوڑا ہوا چلا آتا ہے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے۔ حسن پر وضع پر رنگ پر تناسب اعضا پر رائیں دیتا ہے۔ جن کو لڑکوں سے شوق یا اپنے لڑکوں کا داغ ہے۔ وہ تو چمٹے جاتے ہیں کوئی گود میں اٹھا رہا ہے کوئی چمکارتا ہے۔ ایک ہے کہ پلا پڑتا ہے دوسرا ہے کہ چمٹا جاتا ہے کبھی کبھی کم سن سہیلیوں میں اس لڑکی کے کھلانے کدانے پر تکرار ہو پڑی۔ اللہ اللہ اس درجہ کا اخلاص اور اس حد کا پیار۔ وجہ کیا فطرت کا تقاضا نیچر کا زور اگر بچوں کی طرف اللہ اس طرح ماؤں نیز دوسرے بنی نوع انسان کو مائل اور گرویدہ نہ بنائے تو پرورش کیسے ہو۔ بچوں کی بھولی بھالی صورتیں ہیں کہ دلوں کو بیقرار رکھتی ہیں۔ جنکو اللہ نے عقل رسا یا چشم بینا عطا کی ہے وہ دوسرے ہی خیال سے دیکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اصل گھر اور اصلی وطن سے یہ نو وارد آیا ہے۔ ہماری ولایت سے تازہ وارد ہے۔ دنیا کی ہوا اسکو نہیں لگی۔ دیکھئے وہاں کے خیالات اس کے ساتھ کیا کیا ہیں۔ یہ ہنستا ہے تو کیوں؟ اور روتا ہے تو کیا سوچ کر؟ غرض اس بڑھیا پر سال اول یوں ہی گزرا ہوگا۔ اچھے اچھے حسینوں اور بڑے بڑے متکبر مالداروں کی گود میں اس نے پرورش پائی ہوگی اور ذرا رونے یا اس کے منہ بنا لینے سے کتنوں کی جان پر بنی ہوگی۔ اب دوسرے سال کا واقعہ سنیئے۔ کچھ کچھ پاؤں میں چلنے کی قوت آئی۔ بات بھی الٹی سیدھی منہ سے نکلنے لگی۔ اب ہر ایک چاہتا ہے کہ میری ہی دی ہوئی شے کھائے مینا کی طرح اپنی بولی سنا کر مجھے شاد کرے۔ ایک ایک بولی کے لئے سو سو خوشامدیں۔ اور ذرا سے تبسم کے لئے لاکھ لاکھ آرزوئیں۔ اب روز بروز سن بڑھنے لگا نئے نئے تعلقات لوگوں سے پیدا ہوئے کوئی تو اس لئے خاطر کرتا ہے کہ میرا کچھ کام کر دے گی اور کوئی اس لئے کہ بڑی ہو کر میرے کام آئے گی ہوش سنبھالنے پر دنیا پیچھے پڑی اس لئے دنیا کی چاہتیں بھی شروع ہوئیں۔ ابھی یہ باتیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ پندرھواں برس شروع ہوا۔ اس کا شروع ہونا تھا کہ ایک دم سے چاند ابر سے نکل آیا۔ تمام جہان میں روشنی پھیل گئی یا یوں سمجھو کہ شباب نے تمام دنیا کے نوجوانوں کے دلوں پر اپنا سکہ جمالیا یہ وہ زمانہ ہے کہ کیسی ہی بدصورت عورت ہو لیکن وہ بھی حسین سے حسین نوجوان پر اور متکبر سے متکبر مرد پر فطری طور پر ایسا بڑا اثر رکھتی ہے کہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ سچ ہے یہ پر اثر زور نیچر سے نہ عطا کیا جاتا تو یہ عورتیں بیچاری نیچر کی خدمت توالد و تناسل کا اتنا بڑا اہم کام روز ازل سے کیونکر انجام دیتی چلی آتیں۔ غرضکہ اب وہ زمانہ ہے کہ ایک غریب کم حیثیت کی بھی لڑکی اچھے اچھے سلاطین پر ایسی ایسی حکومت کر سکتی ہے جو کسی بادشاہ کو کسی رعایا پر یا کسی زبردست کو کسی کمزور پر حتیٰ کہ شیر کو بکری پر بھی

نصیب نہیں - یہ بڑھیا کہہ رہی ہے کہ یہ سنا ہے زمانے میں دیکھ چکی ہو شباب کی عنان حکومت بھی ایک روز میرے ہاتھ میں تھی اور ایسی تھی کہ شاید و باید - تینوں زمانے میں نے طے کئے ہیں - لڑکپن میں تمام دلوں پر ہماری حکومت تھی اس کے بعد کتنے خودغرض انسانوں پر ہمارا دباؤ تھا حالت شباب میں نوجوانوں کے دلوں پر ہماری حکومت تھی - اس کے بعد جو تھے پن میں ہمارے بچوں کو دودھ پینے کے لئے ہماری خواہش تھی - شوہر کو اولاد کی پرورش کے لئے ہماری ضرورت تھی - محلہ کے چھوٹے چھوٹے بچے دنیا میں زندگی بسر کرنے کے طریقے ہم سے پوچھنے آتے تھے اور اس طرح گویا عام طور پر ہم جو تھے پن میں بھی ہر دل عزیز سمجھے جاتے تھے - یہ پانچواں پن ایسا ہے کہ ہم دنیا جہان حتّٰی کہ زمین کو بھی بھاری ہیں - اور ہم کو سارے جہان حتّٰی کہ زمین سے بھی نفرت ہے - انتہٰی، نوّے برس کا سن ہے دنیا کے تمام تعلقات ٹوٹ گئے اتفاقات سے وہ لوگ بھی زندہ نہ رہے جو محبت سے نہیں تو قرض ہی ادا کرنے کے طور پر ہم سے خدمت لیتے تھے - ہماری خدمت کرتے - یا خدا کے خوف سے ہماری خبر گیری کو فرض کفایہ نہیں بلکہ فرض عین سمجھتے - اب تو یوں سمجھئے کہ درخت میں پھول آیا پھل لگا - پھل بڑھتا بڑھ کر پکا پک کر شاخ میں ہی سڑ گیا اور لٹک رہا ہے انسان یا جانور اسے کوئی بھی نہیں پوچھتا ہے حتّٰی کہ مالک باغ (نیچر) بھی یہی کہتا ہے کہیں لوٹ کر گر پڑے کہ درخت صاف ہو -

قصہ تو ختم ہو گیا لیکن قصہ کا نتیجہ سننا باقی ہے جو حکمت کا ایک بہت بڑا سبق ہے - دنیا میں موت سے زیادہ کوئی شے یقینی نہیں ہے لیکن عملی طور پر سب سے زیادہ شک اسی کی صحت میں مانا جاتا ہے - موت کے آنے میں شبہ نہیں لیکن مرنے کا نام سن کر کوئی ایسا نہیں جو نا خوش ہوتا ہو اور جو اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے اسے سمجھو کہ اس خصوص میں سب سے اچھا ہے - دنیا کی تمام چیزوں میں اچھے اور برے دونوں اعتبارات ہوتے ہیں - اس بڑھیا میں سب برائی سہی لیکن مرنے میں وہ تم سب سے زیادہ جواں مرد ہے - اور اس لئے اس خصوص میں وہ تم سے اچھی ہے - اس بڑھیا کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے وقت اسکی اس خوبی پر غور کر لیا کرو تو بہت سے خطروں سے بچتے رہو گے -

فصل نمبر ۶

موت

انسان کو موت لازم ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ جو پیدا ہوا اس کو ایک دن مرنا ہے۔ بلکہ اس کا منشا یہ بھی ہے کہ پیدا ہونے والے کے لئے مرنا ایک عمدہ اور آخری چارہ کار ہے۔ کبر سنی کے لئے موت لازم نہ ہوتی تو درختوں پر چڑھ چڑھ کر لوگ گرتے اور کنوئیں میں کود کود کر جان دیتے۔ ورنہ جو آج مورثوں کے مرنے پر آہ و فغاں کرتے ہیں۔ موت نہ ہونے پر مورثوں کے طول حیات پر گریہ وزاری کرتے۔ ہم خود اپنی ناگوار زیست سے بیزار ہو کر مرنے کے یوں متمنی رہتے جیسے اب جینے کے۔ خدا کی جہاں سب حکمتیں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ اس نے پیدا ہونے کے ساتھ مرنے کو لازم قرار دیدیا۔ مرنا تو انتظام عالم کی بقا کے لئے ضروری ہے زندگی کو بھی اس نے بالطف کر رکھا ہے۔

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ہمارے نزدیک تمام مذہبوں کے پیدا ہونے کا سبب یہی موت ہے۔ موت نہ ہوتی تو اس کی فکر بھی نہ ہوتی، فکر موت معدوم ہونے کے ساتھ ہی دغدغۂ حشر بھی جاتا رہتا اور جب یہ نہیں تو مذہب کی پروا کس کو ہے۔ پروا ہونے ہی کیوں لگی؟ جب وہ ایک غیر ضروری چیز ٹھہری اب حالت تو یہ ہے کہ موت ٹھہری لازمی اور موت کے بعد کیا ہوگا۔ اس کو کوئی بھی نہیں جانتا۔ یہ لاعلمی بس غضب کرتی ہے۔ تصور کے ساتھ ہی بس مہیب صورتیں سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں الہام غیبی کے ذریعہ سے موت کے بعد کی زندگی جس علم کی موضوع ہو اسی کو علم دین یا علم مذہب کہتے ہیں۔ الہام غیبی تو ایک ہی ہو سکتا ہے لیکن زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے کبھی کبھی پرانے مذہب کی اصلاح بھی ضروری ہوتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ خبث باطن طمع دنیاوی یا اقتضائے جہالت کبھی ایجاد مذہب کا باعث ہو جاتا ہے سچے مذہب بگڑ کر مختلف طور سے مذہب باطلہ پیدا کر دیتے ہیں غرض یہ کہ انھیں سب اسباب کے اکٹھا ہو جانے سے ہم دیکھتے ہیں کہ جتنے فرقے اتنے ہی مذاہب۔

اس وقت ہم کو مذاہب کی تاریخ نہیں لکھنی ہے۔ ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ دنیا میں کوئی فرد بشر ایسا نہیں ہے جو کوئی مذہب نہ رکھتا ہو۔ حق و باطل سے بحث نہیں جھوٹ یا سچ ایک نہ ایک خیال موت و حیات کی نسبت ہر شخص رکھتا ہے اور یہی اس کا مذہب کہلاتا ہے ممکن ہے کہ دنیا کی ثروت

بے فکری یا نشۂ حکومت مذہب کا خیال پاس نہ آنے دے۔ مذہبی باتیں ہنسی سمجھی جائیں۔ لیکن تردد مصیبت یا بیماری کے وقت کیسا ہی آزاد خیال آدمی ہو اسے مذہبی امور ضرور بدیہی معلوم ہوتے ہیں بعض ایسے بھی ہیں جو مرتے دم تک مذہب کو پاس آنے نہیں دیتے۔ ان کا مقولہ ہے کہ چراغ گل ہوا تو اسکی لو کیا ہوئی؟ بس یہی کیفیت روح انسانی کی ہے۔ حیات ایک کیفیت تھی جو مرنے کے ساتھ ہی زائل ہو گئی حشر ونشر۔ عذاب وثواب یہ ڈھکوسلے ہیں لیکن ایسے خیال کے آدمی بھی نزع روح کے وقت اپنے خیالات پر قائم نہیں رہتے اور کہیں کروڑ دو کروڑ میں ایک آدھ ایسے نکل آئے کہ مر گئے مگر بات نہ بدلی تو انکا وجود الشاذ کالعدم کے حکم میں ہے۔

موت انتظام عالم میں بہت کچھ دخل رکھتی ہے۔ مذہب گویا اسی سے نکلا ہے۔ بعض مذاہب میں موت کا خیال بہت بڑی عبادت ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ دنیا میں جتنی برائیاں ہیں وہ موت کے خیال کو دل سے نکال ڈالنے پر پیدا ہوتی ہیں۔ دل میں موت کا تصور ہے تو انسان معصیت کا مرتکب نہ ہو گا۔

دیکھو تو یہی ایک تھوڑی سی زندگی کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔ گھر بناتا ہے۔ زمین خریدتا ہے کاروبار بڑھاتا ہے۔ تجارت پھیلاتا ہے۔ بڑے بڑے معاملات کرتا ہے۔ کسی کو ملک گیری کا شوق ہے اور کسی کو قطاع الطریقی کی چاٹ۔ ایک چوری کرنے گھر سے چلا ہے اور ایک اس لئے بھیس بدل کر نکلا ہے کہ چور کو پکڑ کر حسن کارگزاری دکھائے۔ غرض کہ مرتے دم تک انسان اپنی تدابیر سے نہیں چوکتا۔ اچھی تدبیروں کا کیا کہنا یہاں ذکر بری باتوں کا ہے۔ آدمی جانتا ہی نہیں کہ مرنا بھی ہے۔ کیسا غفلت کا پردہ ہے کہ موت کا وقت آ گیا اور انسان ہے کہ زمین آسمان کے قلابے بیٹھا ملا رہا ہے موت کھڑی ہنس رہی ہے کہ دو چار منٹ اسکو دنیا میں اور رہنا ہے۔ اور مرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام دنیا کے لوگ مر لیں گے جب کہیں میری باری آئے گی۔

موت سب سے زیادہ یقینی اور سب سے بڑھ کر بدیہی ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص موت سے انکار کرے۔ اپنے مرنے پر کوئی شخص ذرا بھی شک نہیں کر سکتا۔ لیکن پھر بھی انسان جتنا موت سے غافل ہے دنیا کی کسی چیز سے نہیں۔ یہی نیچر کا اقتضا ہے۔ قدرت کا زور کہلاتا ہے قدرت خدا انسان کے دل میں نزع روح تک موت کا پورا خیال آنے نہیں دیتی۔ کیوں؟ اس لئے کہ انتظام عالم موقوف ہے اسی پر انسان اپنی موت یاد نہ کرے۔ موت کا جیسا خیال ہونا چاہیئے اگر ویسا خیال آدمی کے ذہن میں رہے تو دنیاوی ترقی کے اعتبار سے اشرف المخلوقات ہونے کی

کی صفت انسان سے زائل ہو جائے۔ بڑے کام کے ساتھ دنیا کی عمدہ باتیں بھی انسان سے چھوٹ جائیں۔ ہمت اور استقلال کی صفت تو انسان سے بالکل جاتی رہے۔ ترقی موقوف ہو جائے اور حیوانوں کی طرح انسان کے مرنے پر بھی کوئی یادگار اسکی قائم نہ رہے۔ کوئی علم ایجاد نہ ہو نہ کوئی کل بنائی جائے۔ دریا کا سفر بند ہو جائے۔ جہاز ریل تاریں یہ تمام چیزیں معدوم ہو جائیں۔ سلطنت حکومت یہ سب باتیں مٹ جائیں۔ زیادہ تر غذا کا دار و مدار درختوں کے پھل اور پتوں پر آ رہے کپڑوں کا رواج بند ہو جائے۔ سردی میں آگ تاپنے کے سوا گرم کپڑے دیکھنے کو بھی نصیب نہ ہوں بس ایک فوری تسکین کی تمنا دلوں میں رہ جائے اور باقی تمام حوصلے اور ارادے پست ہو جائیں کوئی کام بھی اس خیال سے نہ کیا جائے کہ آئندہ زمانے میں یا آئندہ نسل کے لئے اس سے فائدہ حاصل ہوگا۔

موت کا بالکل خیال نہ آنا ایک اعتبار سے تو قیام عالم کے لئے ضروری ہے لیکن اس خیال سے کہ فسق و فجور اس پر متفرع ہوتے ہیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان کو ہر دم موت کا خیال رکھنا چاہیئے مذاہب میں موت کا یاد کرنا ایک ضروری کام سمجھا گیا ہے۔ موت کا ہر دم خیال کرنا تو محال ہے کیونکہ خود قدرت ایسا نہیں چاہتی لیکن مذاہب کھینچ کھانچ کر کچھ نہ کچھ موت کی طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں تاکہ انسان دنیا کی بے ثبات خوبصورتی پر محو ہو کر برائیوں کا ارتکاب نہ کرے اور اس قدر خیال رکھنے کو قانون قدرت بھی برا نہیں سمجھتا بلکہ اچھا جانتا ہے۔

موت سے کیوں لوگ غافل ہیں جب وہ سب سے زیادہ یقینی ہے؟ اگر مفصلۂ بالا تحریر نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ یا دیا۔ لیکن اس قدر طوالت کے ساتھ کہ ترتیب مقدمات کے بعد خلاصہ کلام تک ذہن آسانی سے نہیں پہنچ سکتا تو مختصر یوں کہہ سکتے ہیں کہ جس نے جانداروں کے لئے موت بنائی اسی قادر مطلق نے موت کے خیال کو بھی دلوں سے محو کر دیا اور اگر اس جواب میں کوئی سقم ہو تو جانے دیجئے۔ یوں سمجھئے کہ خود سوال میں جواب موجود ہے موت سب سے زیادہ یقینی ہے اور یہی وجہ ہے کہ لوگ اس سے غافل ہیں۔ غافل نہ ہوتے تو فکر کرتے اور فکر تو اس چیز کی کی جاتی ہے جس کا تدارک اپنے اختیار میں ہو۔ مرنا ٹھہرا لازمی اور یقینی تو پھر تردد ہی کیا ہے موت کو تو ایک نہ ایک دن آنا ہی ہے پھر ابھی سے ہم قبل از وقت کیوں مر جائیں۔ خیر یہ تو عقلی تکے ہیں جنکی کوئی حد و انتہا نہیں۔ لیکن اس بارہ میں قول فیصل یہ ہے کہ "مُوتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوتُوا" مرنے سے پہلے مر جاؤ۔ یعنی موت کے خیال سے کبھی غافل نہ رہو

شارع سمجھتا ہے کہ موت کے خیال میں اس طرح مستغرق رہنا کہ دنیا کے کام بند ہو جائیں یہ تو محال عقلی ہے۔ جب تک روح بدن میں ہے ایسا ہو نہیں سکتا لیکن تاکیدی حکم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو دن میں سو مرتبہ موت کو یاد کرنا چاہے گا اسے دو چار مرتبہ وہ ضرور یاد پڑے گی اور دنیا کے مکروہات سے بچنے کے لئے اتنا بہت ہے۔

فصل نمبر ۶۱

لذات دنیا

بے بھوک تمام دنیا کی نعمتیں کھائی جائیں تو کچھ مزہ نہیں۔ سوکھی روٹی شدت بھوک میں جو لذت پیدا کرتی ہے اس کا مزہ ان سے پوچھیئے جو دن کو چار دانے منہ میں ڈال کر رہ جاتے ہیں اور شام کو موٹی موٹی روٹیاں انگاروں پر سینک کر نمک یا کوئی ایسا ہی اچھا دن ہوا تو چٹنی یا آلو کے بھرتے سے کھانے بیٹھتے ہیں۔ ان بے سروسامانوں کو جو مزہ اس سادہ کھانے میں ملتا ہے وہ شاہ ایران کو اپنے خوان نعمت میں بھی نہ ملتا ہوگا جب وہ بے بھوک اوروں کا ساتھ دینے کو طوعاً و کرہاً پیٹ پکڑے ہوئے کھانے کی میز پر آ بیٹھتے ہوں گے۔ جو کے ستو میں نمک اور پانی ملا ہوا جس مسرت سے کسان اپنے انگوچھے کے کونے پر یا پتوں کے دونے میں دیکھتے ہیں وہ مسرت ان آنکھوں کو کبھی نصیب نہیں ہوتی جو مزعفر اور بریانی دیکھتے دیکھتے تھک گئی ہیں۔

پانی کا مزہ ان سے نہ پوچھو جو خس خانے میں بیٹھے ہیں۔ سوڈا۔ گلاب۔ کیوڑا۔ شربت، درد وغیرہ وغیرہ کی بوتلیں سامنے رکھی ہیں۔ ایک طرف برف کا بکس رکھا ہے۔ ابھی ایک گلاس کی برف پگھلی نہیں اور خانساماں دوسرا گلاس تیار کر رہا ہے بھلا ان بے فکروں کو کیا پتہ لگے کہ پانی کا مزہ کیا بلا ہے۔ اس کا مزہ ان مزدوروں سے پوچھو جو پہروں کدار چلا کر دس منٹ کے لئے کنوئیں کے قریب آکر لٹیا مانج رہے ہیں۔ یا ان مسافروں سے پوچھو جو جیٹھ بیسا کھ کی دھوپ میں کوسوں چل کر ایک سایہ دار درخت کے نیچے کنوئیں کے قریب آکر دم لیتے ہیں اور گڑ کی ایک ڈلی تھیلی سے نکال کر منہ میں رکھی ہے اور پوسالہ کے قریب چلو لگا کر بیٹھ گئے ہیں اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں۔

؎ مجھے اک جام سے کیا پیاس اے پیرمغاں میری: صراحی کے دہن میں کاٹ کر رکھ دے زبان میری

پانی خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اور زندگی بسر کرنے کے لئے ہوا کے بعد اسی کا درجہ ہے۔ لیکن اس نعمت کو وہ لوگ کبھی نعمت نہیں سمجھتے جنکو انکی زندگی میں کبھی ایسا اتفاق نہیں پڑا کہ پینے کے لئے انکو پانی تلاش کرنے پڑا ہو۔

پوشش کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ عریانی کی تکلیف قریب نہ آنے پائے اس میں امرار کی حیثیت مفلسوں سے ضرور اچھی ہے۔ لیکن دوسرا پہلو یہ ہے کہ پوشش سے راحت پہنچے جسم کو آرام ملے اور برہنگی کی تکلیف رفع ہو اور اس کے ساتھ جو ایک خاص مزہ آتا ہے اس کا لطف حاصل ہو۔ یہ باتیں امرار کو خواب میں بھی نصیب نہیں۔ اس لطف کو ان سے پوچھو جو ماگھ پوس کے جاڑے میں نو بجے رات کو گھر سے ٹکڑے مانگنے نکلے ہیں۔ سردی سے ہاتھ پاؤں قابو میں نہیں ہیں دانت سے دانت بج رہے ہیں متوالوں کی طرح قدم میں لغزش ہے ہاتھ پاؤں اور گردن کو اس طرح سمٹائے ہوئے ہیں جیسے لجالو (چھوئی موئی) کی پتیوں پر کسی کا ہاتھ پڑ گیا ہو یا کچھوے نے آدمی کی صورت دیکھ لی ہو۔ پیٹ کمبخت کا تقاضہ نہ ہوتا تو یہ لاکھ برس گھر سے نہ نکلتے۔ اسی حالت میں کسی سخی داتا نے نینی تال کا بنا ہوا بارہ ہاتھ کا دبیز کمبل جسم پر ڈال دیا۔ اہاہا۔ ایسا مزا آیا کہ سکندر کو خزانہ ہفت اقلیم کی کنجیوں کے شمار میں بھی یہ مزا نہ آیا ہوگا۔ اب بتایئے جن مالداروں کی کوٹھیوں کے پٹے دن چھپتے ہی بند ہو گئے۔ آتش خانوں میں آگ جلا دی گئی۔ فرش۔ گدا۔ میز کی چادر۔ بچھونا۔ تکیہ۔ جدھر دیکھو ادھر پشمینہ نظر آتا ہے انکو کبھی خواب میں یہ تصور نہ آتا ہوگا کہ جاڑوں میں گرم کپڑوں کے پہننے کی لذت کی نوعیت کیا ہے اور نہ وہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جن غریبوں کو وہ کمبل بانٹتے ہیں انکو کیا مزا آتا ہے۔

ایک مسافر ریگستان میں پیادہ پا سفر کر رہا ہے۔ پنڈلیاں سوج گئی ہیں تلوؤں میں آبلے پڑ گئے ہیں۔ آبلوں کے ٹوٹنے سے جو زخم پیدا ہوا اس میں گرم ریت نمک بر جراحت کا کام کر رہی ہے۔ پگڑی کا ٹکڑا پھاڑ کر مسافر نے پاؤں میں لپیٹ لیا ہے۔ یہ غیر معقول بندش اور بھی اس کی رفتار میں دقت بہم پہنچاتی ہے اور ادھر سر بند جو ہلکا ہوا تو تمازت آفتاب سے گودا پگھلنے لگا۔ اسی حالت میں سامنے سے ایک قافلہ نمودار ہوا اور کسی خدا ترس نے اپنے محمل میں اس غریب الوطن کو بٹھا لیا۔ اللہ نے مویشیوں کو انسان کا مطیع بنا کر کتنا بڑا احسان بندوں پر رکھا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں سواریاں بھی انسان کے لئے کیسی مزیدار چیزیں بنائی گئی ہیں اب اس مسئلہ کو یہ آوارہ وطن اچھی طرح سمجھے گا یا وہ لوگ سمجھیں گے جن کو تمام عمر دو قدم

کبھی پیدل چلنا نہیں پڑتا اور اس لئے وہ اپنی سواریوں کو ایسی ہی معمولی چیزیں سمجھتے ہیں جس طرح ہر جان دار اپنے ہاتھ پاؤں کو اپنا جز و بدن اور ہر وقت کا ساتھی جانتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی لذتیں امیر اور غریب دونوں پر یکساں تقسیم کی گئی ہیں۔ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ دنیا میں دولت مندوں کو زیادہ مزا ملتا ہے اور مفلسوں کو کم۔ آرام اور تکلیف یہ دونوں اعتباری اور خیالی چیزیں ہیں۔ اکثر غربار کا یہ غلط خیال ہے کہ امیروں کے ساتھ فیضان الٰہی کچھ رعایت کرتا ہے۔ امیر اور غریب کا ہونا یہ ایک انتظام دنیا ہے اور یہ بھی ایک ضروریات انتظام سے ہے کہ ہر غریب کو امیر بننے کی خواہش رہے ورنہ فی الواقع سچی مسرت جو اصل نعمت ہے امیروں کو زیادہ دی گئی ہے اور غریبوں کو کم ایسا ہرگز نہیں ہے اور اسی وجہ سے مذہبی لوگ اللہ کو عادل کہتے ہیں بلکہ ایک اعتبار سے امیروں کو تفکرات دنیا کی وجہ سے تکلیف غریبوں سے زیادہ دی گئی ہے۔ یعنی جس طرح سے غریبوں کو یہ فکر ہوتی ہے کہ ہم کس طرح سے اپنی مالی حالت میں ترقی کرتے اتنی ہی یا اس سے بھی زیادہ متمولوں کو اپنی حالت قائم رکھنے کی فکر ہوتی ہے۔ سعدی کا قول کتنا اچھا ہے۔

گدا را سیر شود نان شام!
چناں خوش بخسپد کہ سلطان شام

فصل نمبر ۶۲

اچھا برا

دنیا کی تمام صفتیں اعتباری ہیں۔ ایک شے ایک اعتبار سے اچھی اور دوسرے اعتبار سے بری ہے یعنی بجز ذات باری کے اور کوئی شے یہ حق نہیں رکھتی کہ ہر اعتبار سے اچھی کہی جائے اس لئے کسی کی نسبت یہ کہنا کہ یہ اچھا ہے یا برا نہایت مشکل ہے اور اس سے زیادہ مناسب لفظ استعمال کیجئے) سخت غلطی ہے۔ صوفیوں اور جوگیوں کا قول ہے کہ انسان کے لئے بجز خود اپنی ذات میں ہم کیا کم نقص پاتے ہیں کہ دوسروں کے نقائص کی ہم کو تفتیش ہو۔ لیکن دنیاوی اغراض کے لحاظ سے کوئی تعریف" اچھے یا برے کی ٹھہرانا ہی پڑتی ہے

کسی نے لکھا ہے کہ اچھا وہ ہے جو اپنی ڈیوٹی کو اچھی طرح انجام دیتا ہو۔ اب ڈیوٹی اچھی طرح انجام دیتا ہو۔ ان تینوں الفاظ کا پورے طور پر سمجھنا اور بھی مشکل ہو گیا اور گویا دقتیں سہ چند ہو گئیں جہاں ایک لفظ کا سمجھنا دشوار تھا وہاں اکھٹے تین تین لفظ سمجھنے پڑے۔

انسان کے ساتھ بہت سی ڈیوٹیاں ہیں کچھ تو باقتضائے انسانیت کچھ بلحاظ پیشہ کچھ بہ حیثیت حالت۔ یہ اکثر سنا گیا ہے کہ ایک شخص باعتبار جج ہونے کے برا ہے اور باعتبار انسان ہونے کے اچھا ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گا کہ ان حیثیتوں سے الگ ہو کر سوال کیا جائے تو جواب میں اچھا کہا جائے گا یا برا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں میں زیادہ تر اچھے اعتبارات ہوں ان کے برے اعتبارات سے چشم پوشی کی جائے اور اسی اعتبار سے نشہ خوار کی مروت۔ حلم۔ سخاوت یہ صفتیں اس کے عیب کے چھپانے والی سمجھی جاتی ہیں۔

سخاوت مس عیب را کیمیاست

اور اسی طرح جو اپنے اہم کام کو عمدہ طور پر انجام دیتا ہو اس کا ایک کام باعتبار اہم ہونے کے بہت سی صفتوں کے برابر سمجھا جا سکتا ہے اور لوگ اس کے دیگر عیوب سے چشم پوشی کرنے لگتے ہیں۔ جہانگیر اور عالمگیر کو دیکھئے۔ قتل انسان اور باپ کی نافرمانی پر گویا اخلاقی برائیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ تاریخ بتا رہی ہے کہ یہ دونوں بادشاہ ان جرائم کے ضرور مرتکب تھے۔ لیکن تاریخی صفحے الٹیئے تو معلوم ہو گا کہ یہ دونوں بادشاہ اچھے سمجھے جاتے ہیں۔ جہانگیر کو عام باشندگان ہند اور عالمگیر کو عام مسلمانان ہند اچھا جانتے تھے اور سمجھتے ہیں۔

باپ سے بغاوت اور ابوالفضل کے قتل ناحق کا دھبہ جہانگیر کے دامن نیکنامی سے کسی طرح مٹ نہیں سکتا۔ عالمگیر کے شرعی لباس سے بھائیوں کے خون ناحق کا داغ نہ دور کیا جا سکتا ہے اور نہ جب تک اس کے باپ کے مقید رہنے کا خیال دل میں ہے غصب سلطنت کا الزام اس سے ہٹایا جا سکتا ہے۔ لیکن ان تمام برائیوں کے ساتھ کیا وجہ ہے کہ لوگ اسکو اچھا سمجھتے ہیں۔ بس اسی لئے کہ دونوں بادشاہوں نے تخت پر بیٹھ کر عادل ہونے کی ایسی کچھ صفت دکھائی کہ ہمعصر بادشاہ باوجود تمام نیک نامی اور اخلاقی صفات کے ان کا مقابلہ نہ کر سکے اور اس غالب صفت میں غالب رہنے سے وہ (جہانگیر اور عالمگیر) تمام صفات میں اچھے رہے اور عام طور پر اچھے سمجھے اور اچھے کہے گئے۔

اسی طرح ججوں کو خیال کیجئے۔ جو شخص حقوق کے تصفیہ کرنے کا کام اپنے سر لیتا ہے

اسکی تمام صفات سے الگ ہوکر لوگ صرف یہ دیکھنے لگتے ہیں کہ اس جج (تصفیہ حقوق) کی ڈیوٹی کو یہ کس طرح انجام دیتا ہے اور اس کے اچھے برے مشہور ہونے کے لئے بس یہی ایک معیار ٹھہر جاتا ہے۔ اسکی وجہ کیا ہے۔ بس یہ کہ تصفیہ حقوق کی ڈیوٹی اس کے تمام کاموں میں اہم ہے اور اس لئے لوگ اس کے دوسرے افعال کی طرف نظر نہیں ڈالتے۔

لیکن یہ کلیہ بھی بعض مقامات پر غلط ثابت ہوتا ہے۔ کتنے بادشاہ ایسے گزرے ہیں بہتیرے قاضی ایسے ہوگئے ہیں جو باوجود اعلیٰ درجہ کے عدل اور منصف مزاجی کے نیکنام نہ ہوسکے اپنے غرور، نخوت، سخت زبانی۔ سخت دلی، تیز مزاجی سے وہ ہمیشہ برے سمجھے گئے اور ان کے عادل و منصف مزاج ہونے کی صفت ان سخت برائیوں کے مقابلہ میں غالب نہ آسکی۔

مسلمانوں کے پیغمبرؐ کا ایک مقولہ ہے جسکا ترجمہ ہم یوں کرسکتے ہیں کہ "تم میں اچھا وہی ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے اور برا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ برا ہو" یہ مقولہ بہت صحیح ہے انسان کی اچھائی برائی جانچنے کا اچھا موقع یہی ہے کہ اسکی ابتدار زندگی اور طرز تمدن کو معیار ٹھہرائیں یا یوں سمجھیں کہ جو اپنے یگانوں کے ساتھ اچھا نہ رہ سکا وہ دوسروں کے ساتھ کیا اچھا ہوسکے گا۔ کہیں یہ مطلب نہ سمجھیے کہ جو غیروں کے گھر نقب دیکر اپنے یگانے کی پرورش کرے وہ بھی اچھا ہے۔

مفصلۂ بالا تحریر کو اس پوری تقریر سے کوئی نسبت نہیں جو اس خصوص میں کیجا سکتی ہے لیکن ناظرین کو اس مختصر تحریر کو دیکھنے کے بعد بھی کسی کو اچھا برا ٹھہرانے میں بہت تامل ہوگا اور صوفیوں کے قول پر لامحالا ان کو عمل کرنا پڑے گا کہ "ہم میں کیا کم عیب ہیں جو دوسروں کے عیوب کو ہم دیکھتے پھریں"۔

حکما کے اکثر مقولے یا شاعروں کے بعض کلام بڑے بڑے مباحث کے طے کردینے میں کچھ ایسا اثر رکھتے ہیں کہ سن کر حیرت ہوتی ہے اور یہ رائے قائم ہوتی ہے کہ خاص فیضان الٰہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ایسا قول فیصل انسان کی زبان سے نکلا۔ اس خصوص میں جو رائے مسلمانوں کے پیغمبر نے ایک دوسرے مقام پر ظاہر کی ہے اسے ابراہیم ذوق نے اپنے طور پر شاعرانہ مذاق میں یوں نظم کیا ہے ؎

جسے برا کہے عالم اسے برا کہیے
زبان خلق کو نقارۂ خدا کہیے

فصل نمبر ۶۳

حرص

انسان بھی کیا حریص ہے۔ خدا نے اپنے فیض میں کسی بندے کے ساتھ کمی نہیں کی۔ لیکن عجب معاملہ ہے کہ بہت کم ایسے ہیں جو اس کے شکر گزار ہیں: "ان قلیلاً من عبادی الشکور ؂" غضب تو یہ ہے کہ بہتیرے شکر کرنے والے ایسے ہیں جو دل سے شکر نہیں کرتے صرف زبان سے الحمدللہ علی نعمائہ کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ رکن مذہب ادا کرنے کے لئے دل سے نہیں تو منہ سے کہنا لازم ہے۔

سمجھ داروں کے نزدیک خدا منصف ہے اور منصف کا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی مخلوق میں سے کسی کے ساتھ کم احسان کرے اور کسی کے ساتھ زیادہ۔ خدا اپنے تمام بندوں کو یکساں سمجھتا ہے یہ ہماری غلطی ہے کہ ہم سمجھنے میں قصور کرتے ہیں۔ زندگی کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز ہوا ہے پھیپھڑے کے فعل ہی صحیح رکھنے کے لئے نہیں بلکہ ترکیب جسم کو اپنی اصلی حالت پر قائم رکھنے کے لئے بھی۔ دیکھو خدا نے ہوا اس کثرت سے پیدا کر رکھی ہے کہ شاید ہی اس کی مخلوق میں کوئی شے اتنی زیادہ ہو۔ کبھی کسی کو ہوا کی شکایت نہیں ہوتی بعض حکما کے نزدیک تو خلا محال ہے۔ جہاں کچھ نہیں وہاں ہوا ضرور ہے۔

ہوا کے بعد پانی کا درجہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہوا کی طرح دس پانچ منٹ تک پانی نہ ملے تو آدمی ہلاک ہو جائے لیکن پھر بھی یہ ضرور ہے کہ اللہ نے ہوا کے بعد اور تمام چیزوں سے زیادہ پانی کی ضرورت ہے۔ اللہ نے پانی کے لئے مختلف ذریعہ پیدا کر رکھے ہیں۔ کمی بیشی اچھے برے کی بحث نہیں۔ نفس پانی کو دیکھئے تو دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کو پانی بہم پہنچانے میں دقت ہوتی ہو۔ ہر جگہ یہ موجود ہے اور فطرتی فیض باری میں اس کا شمار ہے۔

ہوا اور پانی کے بعد غذا کا درجہ ہے۔ جس طرح ضروریات انسانی میں اس کا تیسرا درجہ ہے اسی طرح اس کے بہم پہنچانے کے وسائل میں بھی کسی قدر دشواری ہے۔ لیکن پھر بھی خدا کا انتظام قابل ستائش ہے کہ ایک طرف رزق کے وسائل تمام دنیاوی امور سے مشکل رکھے گئے ہیں اور دوسری طرف یہ خوشخبری سنائی جاتی ہے کہ: رزقکم فی السماء: شاید ہی

کوئی ایسا شخص ہو جو بھوکوں مرے ہر شخص کو کسی نہ کسی حیلے سے رزق پہنچ جاتا ہے اور اس امر میں بھی گویا تمام بنی نوع انسان کا ایک ہی درجہ ہے۔ جاہلوں کو یہ شکایت ہے کہ خدا بعض بندوں کو اچھا کھلاتا ہے اور بعضوں کو برا۔ لیکن واہ ری حکمت خداوندی۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غذا کا اچھا برا ہونا ہمارا واہمہ ہے تمام غذائیں لذت میں مساوی ہیں غذاؤں میں فرق ہے ہی نہیں۔ مزیدار اور بدمزہ ہونے کا معیار بھوک پر رکھا گیا ہے۔ کھانے کی اصلی لذت ہے بھوک اور وہ ہر شخص میں اگر کوئی جسمانی عارضہ نہ ہو تو مساوی پیدا کی گئی ہے بھوک کی حالت میں فقیر کی نان جویں کا مزہ اس خوان نعمت سے جو بادشاہ کے آگے رکھا جاتا ہے کہیں بڑھا ہوا ہوتا ہے۔

دھات میں لوہا سب سے زیادہ کارآمد چیز ہے اور اس لئے خدا نے اسے سب سے زیادہ ارزاں کر رکھا ہے۔ سونے چاندی کا وجود دنیا میں کم ہے بازار میں ان کا نرخ بھی تیز ہے لیکن یہ ہماری غلطی ہے کہ بے سود چیز کو بے وجہ قابل قدر ٹھہرائیں اور تونگروں کے زر و سیم پر رال ٹپکائیں۔ کچھ دنوں سے سونے چاندی کے ورق مقویات میں استعمال کیئے جاتے ہیں اور تھوڑے عرصہ سے محمود خاں کی بدولت سونے کا کشتہ بھی کھایا جاتا ہے ورنہ اس کے پہلے یہ چیزیں دھوکہ ہی دھوکا تھیں نہ کسی مصرف کی تھیں اور نہ کسی طرح انسان کی فطری ضرورت کو رفع کر سکتی ہیں اور سمجھیئے کہ زلیست انسانی کے مضر سمجھ کر خدا نے ہیرے کو پہاڑوں کے نیچے چھپا دیا تھا تاکہ لوگوں کا دست رس نہ ہو۔ گندم بہشت کی طرح بندوں نے سمجھا کہ اللہ تعالےٰ نے اسے اتنا چھپایا ہے تو اس میں کوئی لذت ضرور ہوگی۔ کمبخت یہ نہ سمجھے کہ اس میں اگر کچھ لذت ہوتی تو خالق مطلق چھپاتا ہی کیوں۔ بہ ہزار دقت جب یہ کھود کر نکالا گیا تو مضر زلیست ثابت ہوا کہیں اس کے ذرے پیٹ میں پہنچ جائیں تو زندگی کے لالے پڑ جائیں۔ مناسب تو یہ تھا کہ اپنی غلطی پر متنبہ ہونے پر انسان کو انفعال ہوتا۔ لیکن اس کے برعکس حضرت انسان ہیں کہ اپنی ہٹ پر قائم ہیں۔ یا اپنی محنت کی داد چاہتے ہیں۔ ہیرا جتنی ہی بیکار چیز ہے ویسی ہی اب اسکی زیادہ قدر ہوتی ہے اور تمام نعمتوں سے زیادہ گراں ہو کر بازار میں بکتا ہے۔ اب ان سب باتوں سے نتیجہ یہ اخذ ہو سکتا ہے کہ خدا نے ضروریات زندگی تمام بندوں پر یکساں تقسیم کر دی اب یہ انسان کی غلطی ہے کہ جس چیز کو خدا نے غیر ضروری سمجھ کر کم پیدا کیا انسان خواہ مخواہ اصرار کرتا ہے کہ یہی ہم کو زیادہ ملے کتنا عمدہ مقولہ ہے "الانسان حریص فیما منع"۔

فصل نمبر ۶۴

خُلِقَ الاِنسَانُ ضَعِیفًا

غور کیجئے تو انسان کا سا محتاج کمزور اور بے سرو سامان کوئی دوسرا جاندار نہیں۔ گائے۔ بھینس بکری کے بچوں کو دیکھئے پیدا ہوتے ہی کودنے لگتے ہیں۔ دو تین ہفتوں میں ماں کے دودھ سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اور انسان کے بچے پانچ چھ مہینے کے بعد تو ہنسنا سیکھتے ہیں۔ چلنے پھرنے بولنے کے لائق تو وہ جب ہوں گے کہ ان کے ہمعصر حیوانوں کے بچے عمر طبعی طے کر لیں۔

انسان ننگا پیدا ہوتا ہے۔ پیدا ہونے پر اسے پہلی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ گرمی اور سردی سے بچانے کو اس کے لئے لباس بہم پہنچایا جائے۔ مکان یا کسی دوسرے سایہ کی تلاش ہو پوشش کے لئے دوسرے حیوانوں کی کھال ڈھونڈنا پڑتی ہے۔ نباتات کے پھلوں یا ریشموں سے کپڑوں کے لئے سوت بنائے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کیڑوں کی بیٹ یا ان کے لعاب دہن کے لئے بھی (کہ یوں ہی ریشم پیدا ہوتا ہے) جانفشانی کی جاتی ہے۔ جانوروں کو قدرت نے ان تمام جھگڑوں سے مستغنی پیدا کیا ہے۔ اپنے جسم کی حفاظت کے لئے وہ دبیز کھال یا گرم روئیں ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں وہ خود کیا محتاج ہوں گے اپنی بدولت ہم کو غنی بنا دیتے ہیں۔ اپنی کھال اور روئیں ہم دام دیتے ہیں جب کہیں ہماری زندگی قائم رہتی ہے۔

خوراک کی نسبت غور کیجئے۔ اکثر حیوان بے منت غیرے زمین کی گھاس اور درخت کے پتوں سے پیٹ بھرتے ہیں اور بے غل وغش زندگی بسر کرتے ہیں۔ نباتات جنکی غذا نہیں ہے وہ چھوٹے چھوٹے جانوروں یا کیڑوں یا پانی کی میل کچیل کھانے کے عادی ہیں اور اس طرح گویا انکو بھی فکر معاشں نہیں ہوتی۔ چلتے پھرتے اپنی غذائیں پاتے ہیں اور پیٹ بھرتے رہتے ہیں بخلاف اس کے انسان کو اپنے رزق بہم پہنچانے میں جو کاوشیں کرنا پڑتی ہیں وہ لاتعداد لاتحصٰی ہیں مثلاً روٹی۔ گیہوں کے دانے کھیت میں پڑے اور جم آئے۔ کھیت لہلہانے لگا تمام حیوانات اس پر لوٹ پڑے اور کھانا شروع کر دیا۔ انسان ہے کہ اس کو کھا نہیں سکتا اس کو انتظار ہے کہ خوشے لگیں۔ دانے پڑیں۔ دانے پکیں۔ پک کر خشک ہوں خشک ہو کر بھوسی الگ ہو۔ ان سب مرحلوں کے طے ہونے کے بعد بھی بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ یہ دانے آگ میں کھون

کر کھائے جائیں۔ سب کے معدے ان کے ہضم کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ضرورتاً پیسنا پڑتا ہے
پیس کر چھاننا اور چھان کر آٹے کا گوندھنا۔ خمیر کرنا۔ روٹی پکانا اور پکانے میں آگ کا تاڑ دیکھنا کہیں
روٹی جل گئی تو ساری محنت اکارت گئی اسی طرح تمام غذاؤں پر خیال کیجئے تو انسان کی کوئی غذا
ایسی نہ ملے گی جو بے تردد اور بلا کاوش بہم پہنچتی ہے۔

دیکھیئے صحت بدنی قائم رکھنے کے لئے انسان نے کتنا بڑا علم طب کا بنایا ہے روز بروز
امراض اور دواؤں کے مدات بڑھتے جاتے ہیں۔ حیات انسانی کا ایک حصہ اس کے متعلق غور و
فکر کرنے میں بھی صرف ہوتا ہے اور حیوانوں کو نہ کچھ اسکی پرواہ ہے اور نہ کچھ احتیاج ہے۔ کتنی
بیماریاں وہ زبان سے چاٹ کر اچھی کر لیتے ہیں انکی ساخت ہی کچھ ایسی رکھی گئی ہے کہ ان کو مرض
بھی بہت کم ہوتا ہے۔ دیکھیئے جا بجا مویشیوں کے لئے اسپتال کھولے گئے ہیں انسان نے
فرط رحم کے اظہار میں یا اپنی خود غرضی کی وجہ سے حیوانوں کے علاج کا بندوبست کیا ہے۔ یا
یوں کہو اپنی طرح حیوانوں کو بھی کمزور سمجھ کر ان کی مٹی خراب کرنا چاہی ہے لیکن تجربہ سے یہ
معلوم ہوا کہ مویشیوں کے علاج کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے وہ بیمار پڑنے ہی کیوں لگیں ان
کے قوائے ذائقہ اور شامہ کو قدرت نے ایسا قوی پیدا کر رکھا ہے کہ ان سے بہت کم چوک
ہوتی ہے اور چوک نہ ہونے سے بیماری قریب نہیں آتی۔

جانوروں کی اعانت کے بغیر انسان راہ بھی طے نہیں کر سکتا وہ خود چل بھی سکا تو اپنی ضرورت
کی چیزوں کو کسی طرح اٹھا نہیں سکتا۔

یہ مضمون بہت وسیع ہے جتنا کہا جائے تھوڑا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی بسر
کرنے میں خلقتاً جتنا محتاج پیدا کیا گیا ہے اتنی محتاج کوئی دوسری مخلوق نہیں ہے اور اس عالم
میں بیکس اور بیچارہ کی مصداق اگر ہے تو ذات انسانی ہے یا اینہمہ انسان اپنے کو اشرف المخلوقات
سمجھتا ہے۔

مفصلۂ بالا مضمون ذہن میں رکھنے کے بعد اس اشرف المخلوقات ہونے کی ادعا پر ہنسی
آتی ہے۔ واہ کیا اچھا شرف ہے۔ اگر اسی بیکسی و بیچارگی کو شرف کہتے ہیں تو اشرف ہونا بدترین
صفت ہے۔ نہیں! نہیں زبان کو روکو خدا کی ناشکری نہ کرو۔ ایک نعمت ہم کو ایسی عطا ہوئی ہے
جو ہمارے تمام نقصانات کی تلافی کرتی ہے اور ہماری تمام کمزوریوں کا نعم البدل بن سکتی ہے اس
نعمت کا نام عقل ہے۔ جس طرح ایک بہت بڑے تیرہ و تاریک مکان کی بھیانک شکل کو۔ ۔ ۔

ایک شمع کی روشنی بالکل نورانی کر دیتی ہے ویسے ہی عقل نے ہماری تمام کمزوریوں کو ایکدم سے رفع کر دیا۔ جب عقل ایسی دولت ہمارے ہاتھ میں ہے تو ہم کسی طرح محتاج نہیں کہے جا سکتے اور جب عقل ایسا ہتھیار ہمارے قبضہ میں ہے تو ہم کسی طرح کمزور نہیں ہو سکتے لیکن پھر بھی ایک بات رہ جاتی ہے۔ یعنی اگر ہم عقل کو کام میں نہ لائیں تو ہمارا ضعف بدستور قائم رہیگا۔

یہ امر مسلم ہے کہ انسان میں بہت سی قوتیں ایسی ہیں جو عقل سے ہمیشہ لڑتی ہیں اور اس پر غالب آنے کی کوشش کرتی ہیں مذہب یا اخلاق کے اکثر مسائل اسی نزاع کے طے کرنے کے لئے یا عقل کو قوت دینے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ مثلاً تکبر نہ کرو۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ اپنی کمزوریوں کو تم کبھی نہ بھولو کیونکہ ان کے بھولنے سے تم اپنے کو عقل سے مستغنی سمجھوگے اور اس لئے ضرور ہے کہ ایک نہ ایک دن مصیبتوں کا سامنا ہو۔ تمہاری دنیاوی احتیاج رفع کرنے کے لئے جو راستہ عقل بتائے گی اس پہ چلنے کی حالت میں تم میں اس امر کی بڑی ضرورت ہے کہ لوگ تم کو صادق القول سمجھیں۔ اگر تم جھوٹ بولو گے تو اس راہ پر نہ چل سکو گے اور اس طرح احتیاج کی ہتیری کمزوریوں سے اپنے کو نہ بچا سکو گے۔ اپنے ضعف مٹانے کے لئے ضرور ہے کہ دنیا کے معاملات میں قاعدوں کو اپنا رہنما سمجھ کر سختی کے ساتھ ان کے پابند رہو اور اس لئے تم پر فرض ہے کہ بلا نکاح عورتوں سے قربت نہ کرو۔ حاکم وقت کی اطاعت کرو۔ بڑوں کا ادب ملحوظ رکھو۔ متوفی کے ترکے میں اپنے حق سے زائد نہ لو۔ گھر والوں اور پڑوسیوں سے بہ کشادہ پیشانی ملو۔ اگر ان قاعدوں کا لحاظ نہ کرو گے تو اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ضرور ایک نہ ایک دن برے دنوں کا سامنا ہو گا۔

حرص۔ غضب۔ شہوت۔ طمع۔ غصہ۔ تکبر۔ حسد۔ رشک۔ فکر۔ تردد۔ بیماری۔ سردی گرمی۔ مفلسی۔ بھوک۔ پیاس۔ عشق۔ بیکسی۔ ایک انسان کے پیچھے نہ معلوم کتنی بلائیں ہیں۔ اور عارضی یا چند روزہ نہیں انسان کے ساتھ پیدا ہونے والی اور اسی کے ساتھ مرنے والی ہیں یہ سب بلائیں ایک طرف اور انسان ضعیف البیان عقل کے سہارے پر دوسری طرف بھلا کہاں تک وہ ان مصیبتوں کا مقابلہ کر سکے گا۔

غرض کہ تمام دنیا کی بیماریاں انسان ہی کے لئے مخلوق ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیماریاں دو چند بھی ہوتیں تو ایک عقل سب کے علاج کو کافی ہوتی۔ لیکن اس عقل کے دشمن اتنے زیادہ ہیں کہ ان کے مقابلے سے اس کو فرصت نہیں ملتی۔ ہماری مدد وہ کہاں تک کرے گی۔ ایسے لوگ بھی گزرے ہیں اور اب بھی ہیں جو اس عقل کو بہت زیادہ احتیاط سے کام میں لا سکتے

ہیں اس کے مخالفین کو وہ کبھی غالب نہیں ہونے دیتے۔ لیکن ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ گویا یہ نہیں ہیں اور اس لئے عملی طور پر جو نتیجے نکلتے ہیں ان پر لحاظ کرنے کے بعد بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ انسان اپنی خلقت میں کمزور ہے۔

فصل نمبر ۶۵

نطق اور دل و دماغ سے اسکا تعلق

شخصی حالت سے قطع نظر کر کے قومی حالت پر لحاظ کیا جائے تو یہ امر ماننا پڑے گا کہ فصاحت بلاغت۔ قوت۔ اداے مطلب۔ زبان دانی۔ یہ تمام باتیں دل و دماغ کی قوت پر منحصر ہیں کسی کا قول ہے کہ ضعیف الجثہ آدمی کا ذہین اور متین ہونا بالکل بے سود ہے۔ جب دل و دماغ میں طاقت نہیں تو نری ذہانت سے خاک کام نکلے گا۔ دل و دماغ کی قوت کے علاوہ طبیعت کا قوی ہونا بھی ایک ایسی شے ہے جس کو نطق میں بہت دخل ہے۔ بہت بڑے علامہ دہر کو جو مفلسی میں فاقہ کرتا ہو اس جاہل بے بلد کے پاس بٹھا دیجئے جو نشہ دولت میں سرشار ہو اور پھر دیکھئے کہ اگر ملا صاحب کو کچھ غنائے نفس ہے تو خیر ورنہ اس جاہل کے سامنے یہ ستّی بھول جائیں گے اور پھر یہی نہیں کہ وہ جاہل تمام باتیں بے سرو پا کرتا رہے گا معقول باتیں بھی اس سے سنی جائیں گی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دولت بڑھنے سے یا کسی قسم کی خوشی یا استغنیٰ، حاصل ہونے سے بھی نطق میں زور اور طبیعت میں روانی آجاتی ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ نطق کو بہت کچھ زور طبیعت سے تعلق ہے۔ فاتح اور مفتوح قوموں کا مکالمہ بھی اس خصوص میں قابل لحاظ ہے۔ مفتوح قوم کی عمدہ سے عمدہ رائے اسکی زبان سے لچر معلوم ہوتی ہے اور وہی فاتح قوم کا ممبر ہے کہ ایک سڑی سی بات کس زور دار لہجے میں بیان کرتا ہے۔ کہ سنکر تعجب ہوتا ہے۔ بادشاہوں کا رعب۔ سپہ سالاروں کا تہور یا رئیسوں کا دبا ؤیہ سب چیزیں کیا ہیں۔ وہی طبیعت کا زور ہے کہ اس نے نطق میں قوت دے رکھی ہے اور یہ قوت دلوں پر مقناطیسی اثر یا سحر کا کام کرتی ہے۔ نطق بھی قوم کی حالت کا ایک مقیاس ہے جس قوم میں طاقت لسانی نہ ہو اسے ہیچ اور نکمی سمجھنا چاہیئے۔ طاقت لسانی سے لاف زنی یا فضول

گوئی مراد نہیں ہے۔ بلکہ گفتگو کا وہ لہجہ مراد ہے جو دوسروں کی طبیعتوں پر اثر ڈال سکے اور مافی الضمیر پورے طور پر ادا ہو۔ اگر ہمارے دعوے کا بین ثبوت دیکھنا ہو تو عدالتوں میں تشریف لائیے۔ دیہاتی گواہ بے علم۔ بے مقدرت۔ چاروں طرف سے ادبار گھیرے ہوئے۔ نہ کسی طرح کا زور نہ کسی قسم کی ہمت۔ پژمردہ دل اور زبوں حال جب کبھی عدالت میں گواہی دینے آئے تو آپ کی زبان پورے طور پر آپ کی حالت کا فوٹو کھینچ دیتی ہے۔ چپراسی نے حلف دینے کا ارادہ کیا

چپراسی نے کہا کہو: خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہوں گا"

گواہ: "سچ نہیں کیا جھوٹ کہنے آیا ہوں۔"

چپراسی: "ارے میاں! جو کہتا ہوں وہی لفظ بہ لفظ کہو۔"

گواہ: "ہاں! ہاں!! خدا کو جانتا ہوں"

چپراسی: "خدا کو کون نہیں جانتا۔ یہ کہو: خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہوں گا"

گواہ: "ہاں جی ہاں۔ سچ کہوں گا"

غرض کہ ذرا سا معاملہ اور دس منٹ تک چپراسی سے حجت ہوئی۔ جب تک حاکم نے ڈانٹ نہیں بتائی تب تک پورے طور پر حلف نہیں لیا۔ اب آگے چلے تو سوال کا جواب یا تو سوال سے بالکل الگ یا ضرورت سے بہت زیادہ اور فضول۔ اور کبھی اختصار کیا تو ایسا کہ کچھ سمجھ نہ آیا۔ بجائے ہاں کے کیوں نہیں بولنا تو گویا تکیہ کلام ہے پانچ پانچ منٹ پر حاکم کا ترش رو ہو کر ڈانٹنا یا چیں بہ جبیں ہو کر دیکھنا ویسا ہی ضروری ہوتا ہے جیسا مٹھر گھوڑے کو بار بار ایڑ لگانا اکثروں کی رائے ایسے اظہار پر یہ ہوتی ہے کہ گواہ ٹال مٹول کرتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ نطق کی کمی ہے کہ جو قومی ادبار اور قومی ضعف کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اس کے مقابل میں کسی ان پڑھ گورے یا کابلی میوہ فروش کو کھڑا کر کے اظہار لیجئے تو دیکھئے۔ یس۔ نو۔ ہاں۔ نہیں ہیں کھٹا کھٹ سوالوں کا جواب دیتے چلے جاتے ہیں۔ ابتدائے فتوحات اسلام میں جو طاقت جاہل عربوں کو تھی اس پر مصر۔ شام۔ ایران کے بڑے بڑے عالم دنگ رہ جاتے تھے سلاطین عصر جاہل سفیروں سے اپنے مذہب اور عقیدے کے خلاف باتوں کا سننا اور عرصہ تک سلسلہ سخن کا جاری رکھنا محض طاقت لسانی کا لطف حاصل کرنے کے لئے گوارہ کرتے تھے سب سے بڑا تعجب تو یہ ہے کہ جہلائے عرب لڑائی خوشی یا جوش کی حالت میں فی البدیہہ شعر کہتے تھے اور وہ بھی دو ایک نہیں دس دس پندرہ پندرہ۔ فصاحت ایسی کہ اس زمانہ

کے لکھے پڑھے مقابلہ نہ کر سکیں۔ واقعات تو پیدا سے بالکل موافق جن سے یہ خیال نہ ہو کہ شعر پہلے سے موزوں کئے گئے تھے۔ فتوحات اسلام میں جاہل عربوں کے فی البدیہہ اشعار کے دیکھنے سے ہم نے پورا ثبوت اس امر کا پایا نطق بالکل دل و دماغ کی قوت یا زور طبیعت کے ماتحت ہے

فصل نمبر ۶۶

ترک حیوانات

قانون قدرت کا اقتضا ہے اور انتظام عالم یوں ہی رکھا گیا ہے کہ ایک مخلوق فنا ہو کر دوسری مخلوق پیدا ہوتی ہے ایک شے کی فنا پر دوسری شے کا نمو ہوتا ہے ایک دوسرے کو کھا کر پلتا ہے۔ ایک کا تنزل دوسرے کی ترقی کا سبب ٹھہرتا ہے۔ انسان بھی ایک مخلوق ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کسی دوسری شے کا فنا ہونا یا دوسرے جاندار کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اسکی انسانیت مقتضی ہے کہ دوسروں کی برائی میں اپنی بھلائی سمجھے۔ ہاں حسن معاشرت کے لئے جو قاعدے مقرر ہیں انکی پابندی بس یہی ایک ابتدائی سمجھو یا انتہائی کمال یا صفت انسان کی ہے۔

مفصلہ بالا باتیں تمثیلوں سے بخوبی سمجھ میں آجائیں گی۔ زمین ایسی کمزور چیز بھی اپنے سے کم طاقت والوں پر شیر ہے جہاں کوئی شے سڑ گل کر اور اس طرح اپنی قوت زائل کر کے زمین کے پنجہ میں پھنسی بس فوراً اجزائے ارضی اس طرح اپنی قوت بڑھانے اور اس کے ذرّوں کو کھینچنے لگتے ہیں۔ جیسے جونک آدمی کا خون چوستی ہے۔ تھوڑے دنوں میں وہ شے غائب ہو گئی اور اس کی بدولت اجزائے ارضی کی قوت پیداوار بڑھ گئی۔ سوکھی زمین میں سوکھا دانا ڈال دو تو زمین خود اپنی بالیدگی کی فکر میں ہو گی دانے کی کچھ دال نہ گلے گی۔ لیکن وہی دانا پانی کی مدد پاکر جب زمین پر غالب آتا ہے تو زمین کے تمام عمدہ ذرے جذب کرنے لگتا ہے۔ بیسیوں فٹ نیچے کا خزانہ نکال کر گزوں اوپر لے جاتا ہے بیچاری زمین کو کمزور اور مفلس کر ڈالتا ہے بڑے بڑے درختوں کے پاس چھوٹے چھوٹے درخت نشو ونما نہیں پاتے اسکی وجہ کھلی ہوئی ہے۔ شیر کے سامنے گیدڑ کو جرأت نہیں ہوتی کہ شکار کرے زمین کے ذرے بڑے درخت کی کشش سے بچنے نہیں پاتے۔ چھوٹے درخت کو نمو ہو تو کس چیز سے۔ بعض بعض درختوں کی ٹہنیاں آسمان

سے باتیں کرتی ہیں لیکن تحرک بالارادہ کی قوت ہی دوسری ہے۔ ادنیٰ بھنگا اور چھوٹے چھوٹے کیڑے اس خصوص میں درختوں سے زبردست ہیں۔ جن پتیوں کو درخت ہزار مشکل سے برسوں کی محنت میں تحت الثریٰ سے نکال کر اپنی زیبائش کی غرض سے باہر لا کر اپنا ساز و برگ درست کرتا ہے کیڑے مکوڑے ہیں کہ بے دریغ پتیوں کی صفائی میں مشغول ہیں۔ اچھے خاصے درخت کو دو چار گھنٹے میں برہنہ اور بے سر و سامان کر دیا اور کہیں ٹڈیوں سے پالا پڑا تو گھنٹہ بھی پورا نہیں ہونے پاتا۔ آفتاب سے جو نسبت شبنم کو ہے وہی نسبت ٹڈیوں کو سبزہ زار سے ہے۔ کہیں ایسی حالت میں کوئی مینا قریب آ بیٹھے جب سیر دیکھئے جن حضرات کے دانت بیچارے درخت کے پتوں پر آرہ سے بھی زیادہ تیز تھے وہ بے تکلف بی مینا کے پیٹ میں بہ یک بینی و دو گوش گھستے اور ہضم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بلی نے اس موقع کو دیکھ پایا اور دبے پاؤں قریب پہنچ کر جھپٹی تو مینا کی گردن اس کے منہ میں ہے۔ پھر کیا تھا اسکی عید ہے۔ مینا ہتیرا پھڑ پھڑاتی ہے لیکن بلی کو کچھ پروا نہیں وہ مطمئن ہے کہ بازو جھاڑنے سے گردن چھوٹ نہیں سکتی۔ بلی کا پیٹ جو بھرا تو آپ میدان کی طرف کھانا ہضم کرنے کی غرض سے خراماں خراماں چہل قدمی کو نکلیں۔ سامنے سے ایک کتا کئی دن کا بھوکا تاڑ زدہ چلا آتا تھا۔ آنکھیں چار ہوئی نہیں کہ بلی بھاگی اور کلب بیگ پیچھے لگے۔ دوڑے۔ سو پچاس قدموں کے بعد بلی اسی طرح کتے کے منہ میں ہے جس طرح ابھی آدھ گھنٹہ پہلے مینا کی گردن بلی کے منہ میں تھی۔ اب ناظرین منتظر ہونگے کہ کتا کسی شیر کے منہ میں نظر آئے گا۔ لیکن تجربہ ایسا نہیں بتاتا۔ زبردست کمزور کو کھاتا ہے نہ کہ برابر والے کو۔ اسی لئے ایک شکاری جانور دوسرے کسی شکاری جانور کا گوشت نہ کھائے گا۔ بلی کو گو کتے نے پکڑ لیا اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ اسے کھا بھی لے گا اس کا صرف یہ کام ہے کہ وہ بلی کو مار کر اجزائے اراضی کی بالیدگی کے لئے چھوڑ دے یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ زبردست شکاری جانور کے لئے اپنے سے کمزور شکاری جانور کا کھانا محال ہے۔ ممکن ہے کہ بھوک کی بیتابی اپنا زور بھی دکھلائے لیکن یہ تو مسلم ہے کہ کمزور شکاری جانور اپنے سے زبردست شکاری جانور کے گوشت سے نفرت یا خوف کھاتا ہے۔ ہم نے ایک معزز شخص سے سنا کہ ایک مرتبہ شیر کا گوشت اس نے طاق پر رکھ دیا تھا بلی نے اسے کھانے کے لئے گرایا لیکن پھر اسکی بو سے مخوف یا متنفر ہو کر بھاگ گئی۔

مفصلۂ بالا باتوں سے ایک سرسری طور پر انتظام عالم کا نقشہ دکھانا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھانا تھا کہ زبردست کمزور کے مقابلہ میں جائز طور پر اپنی خود غرضی کا پیش کرنا کوئی مضائقہ

نہیں رکھتا۔ اب جو کچھ گفتگو ہے وہ جائز وناجائز کی تفریق میں ہے۔ میری سمجھ میں جائز اور ناجائز کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ کھیت میں دانا پڑا۔ درخت اگا۔ پھل لگا اور پکا۔ اگر انسان پھلوں کو توڑ کر کھا جائے تو کچھ بیجا نہیں اگر پھل سڑ کر گر جائیں تو افسوس ہوگا۔ جو شے پیدا ہوئی اس کو ایک دن فنا ہونا ہے۔ اگر آدمی پھلوں کو نہ کھائے اور نہ کسی جاندار کو کھانے دے تو ایک نہ ایک دن وہ ضرور سڑ کر گریں گے۔ فرض کرو کہ پھلوں میں روح ہے اور ایک نہ ایک قسم کی جان تو تمام چیزوں میں ماننی ہی پڑتی ہے ہندی میں اسے انس کہتے ہیں۔ ہر شے کی ہیت مجموعی جس حیثیت سے قائم ہو وہی اسکی جان ہے اب پھلوں کو کھاتے وقت یہ سمجھنا کہ پھلوں کو دکھ ہوتا ہے کتنی نادانی ہے۔ اگر پھلوں میں انسان کی سی روح ہوتی تو سڑ گل کر گر جانا آدمیوں کے کھا جانے سے انھیں کہیں سخت گزرتا۔ انسان اگر اپنے درختوں کے پھل ہر سال توڑ کر کھایا کرے تو وہ ظالم نہیں ہے ہاں اس وقت وہ ضرور ظالم کہا جائے گا جب درختوں کی شاخ کو وہ بلا ضرورت مروڑ ڈالے اور اس طرح درختوں کو بے کام کر دے۔ غرض کہ ہر شے کے پیدا ہونے کا عمدہ نتیجہ یہ ہے کہ وہ کسی عمدہ کام میں صرف ہو جائے یا اس کام میں لگ جائے جس کے لئے اس کا پیدا کیا جانا بظاہر سمجھا جاتا ہے۔ بکری کا بچہ آج ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ نر ہے اس لئے دودھ کی امید نہیں اور نہ بکروں کی کچھ گاؤں میں قلت ہے کہ نسل بڑھانے کے لئے اس کا زندہ رہنا مناسب متصور ہو۔ اب اس وقت دو صورتیں سامنے ہیں ایک تو یہ کہ وہ ذبح کیا جائے اور گاؤں والوں کا ذائقہ درست ہو اور دوسری یہ کہ یوں ہی چھوڑ دیا جائے کہ عمر طبعی کو پہنچ کر اور بڑھاپے کی مصیبتیں جھیل کر اپنی جان دے۔ سوال یہ ہے کہ پہلی صورت پر عمل کرنا مقتضائے دانش ہے یا دوسری پر۔ اس حلوان کا نہ کھانا ویسا ہی فطرت (نیچر) کے ساتھ ظلم کرنا یا کفران نعمت کا مرتکب ہونا ہے جیسے باغ کے میووں کا نہ کھانا اور یہ گوارا کرنا کہ وہ سڑ کر زمین میں ملجائیں۔

اب یہاں تھوڑی سمجھ والے یہ اعتراض کریں گے کہ میووں میں روح نہیں ہوتی جانوروں میں روح ہے اور اس لئے ان کو تکلیف دینا سقاوت ہے۔ اول تو ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ نباتات میں روح نہیں ہے۔ ہم نے جو تعریف روح کی اس مضمون کے اغراض کے لئے اختیار کی ہے وہ نباتات میں ضرور پائی جاتی ہے اور پھر فرض کر لیجئے کہ پھل کو توڑنے میں وہ تکلیف نہیں ہوتی جو جانوروں کو ذبح ہونے میں ہوتی ہے۔ ہم یہ کہیں گے کہ اپنی موت سے مرنا ہر حالت میں مرگ مفاجات (فوری ہلاکت) سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اور اس طرح جانوروں کو ذبح کرکے

کھا جانا اس معنی سے بھی ان پر احسان کرنا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ پھر اس اعتبار سے تو قاتل مقتول کا محسن ہے؟ ہم اس کے جواب میں کہیں گے بے شک محسن ہے۔ ایک دن سب کو مرنا ہے ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے یہ کہیں اچھا ہے کہ تلوار یا گولی سے دو منٹ میں خاتمہ ہو جائے لیکن یہ احسان صرف مقتول پر ہوتا ہے۔ مقتول کے اعزہ۔ نیچر۔ سوسائٹی اور گورنمنٹ پر ظلم ہوتا ہے اور اس لئے ناجائز سمجھا گیا۔ نیچر پر ظلم ہونا کسی قدر محتاج تشریح ہے۔ انسان کو عقل انسانی کا ایک ایسا جوہر دیا گیا ہے کہ جس نے دوسری مخلوقات سے انسان کو ممیز اور با شرف کر رکھا ہے۔ انسان کی عقل کے متعلق بہت سی خدمتیں کی گئی ہیں دوسرے مخلوق عالم کی ترتیب و آراستگی بھی ایک کام عقل انسانی کا ہے عقل انسانی کی پختگی کے لئے تجربہ درکار ہے اور تجربہ چاہتا ہے عمر کی درازی اس لئے کسی کو اسکی عمر طبعی کے پہلے ہلاک کرنا عام مخلوقات کے ساتھ ضمناً ظلم کرنا ہے۔ لیکن با ایں ہمہ جو شخص اچھے کام کی کوشش میں یا اصلاح مخلوقات کی سعی میں اپنی جان دیتا ہے تو تمام مذاہب میں سمجھا جاتا ہے کہ اس کا خاتمہ سب سے اچھا ہوا کیوں؟ بس اسی لئے کہ مرنا برحق ہے۔ ایک دن تو وہ مرتا ہی۔ اب جو اچھا کام کرنے یا آراستگی انتظام عالم میں اس کی جان نکلی تو اس نے مرتے دم تک گویا نیچر کے فرائض کو پورے طور پر ادا کیا اسی طرح سمجھو کہ بکرے کو ایک دن مرنا تھا ہی لیکن اس طرح اس کا مرنا کہ اشرف المخلوقات کی جسمانی اور عقلی قوت بڑھانے میں اس سے مدد پہنچی۔ ذی عقل کے نزدیک ضرور مستحسن خیال کیا جائے گا اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس جانور کے لئے عمدہ سے عمدہ غائت جو خیال میں آ سکتی ہے اس تک یہ پہنچ گیا۔

ہماری پچھلی تحریر سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ بکری (مادہ) یا کیا بکرے (نر) کا گوشت ممنوع ہے۔ کیونکہ انکی زندگی ان کے گوشت سے زیادہ نفع بخش ہے۔ بعض قومیں ایسا ہی سمجھتی بھی ہیں۔ لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ جو لوگ ان کے گوشت کھانے کا فتویٰ دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان جزئیات پر نظر قانون عام کے خلاف ہے موقع اور مقام کے اعتبار سے اپنی مصلحتوں کا سوچنا ہر ایک کی اختیاری تمیز پر محدود ہونا چاہیئے۔ ملکی یا ربانی قانون کے ساتھ جزوی اختصاص نامناسب ہے۔

مفصلۂ بالا تقریر اس امر کے ثابت کرنے کو کافی ہے کہ گوشت کا کھانا کسی طرح عیب یا بیرحمی میں داخل نہیں ہے۔ تاریخ سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ مچھلی گوشت دودھ اور شہد جنگلی میوے یہی سب ابتدائی غذائیں تھیں موجودہ حالت پر اگر نظر ڈالی جائے تو دنیا میں اسوقت بہت کم لوگ

ایسے نکلیں گے جو گوشت کھانا عادتاً یا مذہباً برا جانتے ہوں۔

فیثاغورس اور اس کے تلامذہ ترک حیوانات کو بڑا ثواب جانتے تھے شاید قدیم مصری بھی اسی خیال کے تھے۔ لیکن اس فرقہ نے زیادہ ترقی نہ کی۔ ہندوستان میں گو بودھ بھی حیوانات کا کھانا پسند نہ کرتا تھا لیکن اس کے نیم معتقد چین والے چوہا اور بلی تک کھا جاتے تھے۔ بودھ مذہب کے پیرو جو ہندوستان میں جین کہلاتے ہیں وہ البتہ اس خصوص میں اپنے مرشد کے قدم بہ قدم چلتے ہیں مگر تعداد میں وہ اتنے کم ہیں کہ کسی شمار میں نہیں۔ دو چار پنتھ فقیروں کے بھی ایسے ہیں جن کے متبع ترک حیوانات کے پابند ہیں۔ مسلمانوں میں بھی بعض درویش گوشت کا کھانا چھوڑ دیتے ہیں اس پر جب ان کے مولوی کہتے ہیں کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کا حرام ٹھہرانا اور اپنے کو خدا سے زیادہ رحیم یا حکمت والا سمجھنا نص قطعی کے بالکل خلاف ہے تو ان بیچاروں کو یہی کہتے بنتا ہے کہ ہم گوشت کو حرام نہیں سمجھتے بلکہ

نہ تمنائے گوشت مردن بہ   از تقاضائے زشت قصاباں

پر عمل کرتے ہیں خود رائی کا الزام ہم پر نہیں ہو سکتا یہ ناداری کا نباہ ہے۔

غرض کہ دنیا کے ہر حصہ میں گوشت کھانے کا رواج انسان میں جاری ہے۔ ان میں بعض قومیں تو ایسی ہیں کہ نباتات کی طرح تمام حیوانات کا گوشت کھا سکتی ہیں اور بعض شرطیں لگاتی ہیں کثیف اور بے حیا درند جانوروں کا گوشت اس لئے حرام سمجھتی ہیں کہ کہیں یہ عادتیں گوشت کے ذریعہ سے کھانے والوں میں بھی سرایت نہ کر جائیں گوشت کے نہ کھانے والے ایک حجت یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ گوشت جزو بدن ہوتا ہے اور اس لئے گوشت کھانے والوں میں حیوانوں کی خاصیت زیادہ اثر کر جاتی ہے۔ یہ کہنا ایک حد تک درست ہے اور اسی خیال سے حلال اور حرام جانوروں کی فہرست قائم کی گئی ہے۔ اس فہرست پر زیادہ سختی کے ساتھ مسلمان عمل کرتے ہیں۔ سور۔ کتا۔ بلی۔ گیدڑ۔ شیر۔ ہاتھی۔ چوہا۔ سانپ۔ کیڑا مکوڑا۔ باز بحری۔ گدھ۔ طوطا وغیرہ وغیرہ بہت سے چرند و پرند ایسے ہیں جنکو اہل اسلام نہیں کھاتے بعض قومیں ایسی ہیں کہ وہ سور بھی کھاتی ہیں۔ جاپانی چینی اور چند وحشی قومیں ایسی ہیں کہ کتا بلی چوہا بھی نہیں چھوڑتے الغرض شرط ہے گوشت کھانے میں جو اعتدال مسلمان برتتے ہیں دنیا کی کسی قوم میں یہ بات نہیں ہے ہندو بھی اس خصوص میں مسلمانوں کے ہم پلہ ہیں بلکہ انکی احتیاط کسی قدر حد سے متجاوز ہے اسوقت ہم یہ کہنے کو تیار نہیں ہیں کہ مسلمانوں کی صحبت نے ہندوؤں پر یہ اثر ڈالا یا خود ان کی

تہذیب کا یہ اقتضا ہے۔ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ اس خصوص میں اہل اسلام اور ہنود زیادہ ترمعتدل طریقے پر چلتے ہیں۔ خیرالامور اوسطہا نہ تو یہ گوشت کا کھانا حرام سمجھتے ہیں اور نہ آنکھ بند کر کے کیڑا مکوڑا سب ہی کچھ کھانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ گوشت کھانے والوں پر بڑا بھاری الزام سقاوت کا لگایا جاتا ہے جس کو تصریح کے ساتھ ہم نے اوپر سمجھا دیا اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ گوشت جو اپنی نوعیت میں بنی نوع انسان کے لئے کسی طور پر مضر یا خلاف مصلحت ہے اس کو خود شارع نے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ گوشت انسان کی خوراک نہیں ہے اس سے خون صالح پیدا نہیں ہوتا اسکی حدت نقصان کرتی ہے۔ یہ علم طب کی بحث ہے ترکاری اور مصالحہ کا گوشت میں ملانا انھیں امور پر نظر ڈال کر رائج ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ کوئی پہلو اس میں مضرت کا نہ ہو۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حال کی تحقیقات میں ڈاکٹروں نے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کا دانت گوشت کھانے کے لئے نہیں بنا ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کچا گوشت کھانے کے لئے انسان کا دانت نہیں بنا ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ شیروں کی طرح انسان کو بھی صرف گوشت اور کچا گوشت کھانا چاہیئے۔

خلاصہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ جن لوگوں کو ترک دنیا کر کے گوشہ نشینی نہیں کرنی ہے۔ بلکہ قوت بازو سے کام کرنا ہے۔ ہاتھ۔ پیر۔ دماغ۔ قلب اور جسم میں وہ زور چاہتے ہیں ہمت اور مستعدی سے ان کو کام کرنا ہے' وہ گوشت بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔

اب اس بارے میں اسلام کا ... اعتدال قابل لحاظ ہے۔ جینیوں کے نزدیک سوائے انسان کے ہر جاندار کا گوشت کھانے کے قابل ہے۔ ہندوؤں میں جو مذہبی گروہ کے لوگ ہیں وہ گوشت بالکل نہیں کھاتے اور جو کھاتے ہیں وہ بے وجہ معقول بہت سے جانوروں کا گوشت حرام سمجھتے ہیں۔ اس زمانے کی مہذب قومیں ان دونوں درجوں کے وسط میں ہیں۔ اور ان مہذب قوموں میں بھی وہ اعتدال ملحوظ نہیں ہوتا جو اسلام تعلیم کرتا ہے۔

فصل نمبر ۶۷

زمزم

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پیغمبر نے اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ کو مکہ کی زمین غیر ذی وزرع میں چھوڑا تو وہاں کسی قسم کی آبادی نہ تھی اور نہ پینے کو پانی اور نہ رہنے کو کوئی گھر تھا۔ خانہ کعبہ کی لنسبت مسلمان مورخوں نے لکھا ہے کہ حضرت آدم کے وقت میں اسکی تعمیر ہوئی تھی اور مسلمانوں کے نزدیک یہ دنیا میں پہلا گھر تھا لیکن جس وقت کا حال ہم لکھ رہے ہیں اس وقت یہ مکان بالکل منہدم تھا کسی قسم کی مکانیت نہ تھی۔ وہاں کی زمین کسی قدر اونچی تھی جس سے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ یہاں پر کسی زمانے میں عمارت تھی۔ دانے اور پانی کا ذخیرہ جب ختم ہوا تو ہاجرہ کو فکر ہوئی۔ رزاق مطلق کی قدرت کا نمونہ یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک چشمہ وہیں جاری ہوا یہ چشمہ تھوڑے دنوں کے بعد زمانے کے تصرف یا انسانی صنعت کی بدولت کنوئیں کی صورت میں آگیا اور اب چاہ زم زم کے نام سے مشہور ہے۔

عرب میں پانی کی بڑی قلت تھی اور اب بھی ہے کنوئیں یا چشمہ کا ہونا آبادی کے لئے پہلے زمانے میں ایک بہت بڑی تحریک تھی اور اب بھی کم وبیش ایسا ہی ہے قدیم عرب کے ایک خانہ بدوش گروہ بنوجرہم نے اس چشمہ کے پاس آباد ہونا چاہا۔ حضرت ہاجرہ نے نہایت خوشی سے ان مہمانوں کی آؤ بھگت کی اور مہمانوں نے نہایت احسان مندی سے وہاں سکونت اختیار کی اسی اثنا میں حضرت ابراہیم کی آمد ورفت بھی جاری رہی اور عبادت الہٰی کے لئے ایک گھر کی تعمیر انھوں نے حضرت اسمٰعیل کی مدد سے کی جو آج تک کسی قدر ترمیم اور تبدیلی کے ساتھ قائم ہے خانہ کعبہ نام ہے اور تمام دنیا کے مسلمانوں کا مرجع ہے۔

قبیلہ بنوجرہم میں ایک شخص مداد تھا جسکی لڑکی سے حضرت اسمٰعیل کا عقد ہوا اور اس طرح جو نسل حضرت اسمٰعیلؑ کی پھیلی جس میں غالباً اسمٰعیل کی بیویوں کی اولاد بھی شامل ہے وہ متعرب کہلائی اور آج کل عرب کی غالب آبادی انھیں لوگوں سے ہے۔ قریش اور پیغمبرؐ آخرالزماں بھی اسی نسل سے ہیں۔

ایک زمانہ بنو اسمٰعیل پر ایسا آیا کہ بنوجرہم نے ان کو خانہ کعبہ سے بیدخل کر دیا اور وہ لوگ

عرصہ تک باہر باہر گھومتے رہے۔ صدیوں کے بعد بنو جرہم کی حالت کثرت فسق و فجور سے بہت کمزور ہو گئی اور اس طرح بنو اسمٰعیل کو پھر خانہ کعبہ پر قابض ہونے کا موقع ہاتھ آیا۔ بنو جرہم جب مکہ سے بھاگنے لگے تو خانہ کعبہ کے قیمتی اسباب کو چاہ زمزم میں ڈال دیا اور اوپر سے پتھر بھر دیئے اور اس طرح چاہ زمزم صدیوں تک معدوم رہا۔ پیغمبر آخر الزماں کے دادا عبدالمطلب نے اس کنوئیں کو بڑی محنت سے کھدوایا اور قدیم زمانے کی طرح لوگ پھر اسکے پانی سے مستفید ہونے لگے۔

اسلام سے قبل چاہ زم زم کو لوگ مذہبی خیال سے نہیں دیکھتے تھے اور نہ اسلام پھیلنے کے بعد ہجرت مدینہ تک کوئی خیال مسلمانوں میں چاہ زمزم کی عظمت کا قائم ہوا۔ ہر جگہ اچھے کنوؤں کی طرف گاؤں والوں کا خیال عموماً رجوع ہوتا ہے۔ بس وہی حالت چاہ زمزم کی تھی۔ لیکن ہندوستان کی حالت پر قیاس نہ کرنا چاہیئے۔ جہاں پانی آسانی سے دستیاب ہونے کی وجہ سے کوئی بڑی نعمت نہیں سمجھا جاتا۔

کفار مکہ نے جب مسلمانوں کو بہت تنگ کیا تو وہ گھبرا کر بھاگ کر مدینہ کی طرف چلے گئے وہاں کی آب و ہوا بہ نسبت مکہ کے بہت زیادہ مرطوب تھی۔ سفر کی تکلیف وطن چھوٹنے کا غم بے سرو سامانی کی حالت افلاس کی مصیبت تو تھی ہی آب و ہوا کی ناموافقت سب پر بالا تھی۔ چند مہینوں کے بعد مہاجر مسلمانوں میں جاڑے بخار کی بیماری پھیلی۔ شدت بخار میں جب یہ ہزیان بکتے تھے تو خانہ کعبہ۔ چاہ زمزم اور مکہ کے مشہور مقامات کا نام لیتے تھے۔ چونکہ بیماری زیادہ تر پانی کی ناموافقت سے تھی اس لئے وہ لوگ مکہ کے پانی یعنی چاہ زمزم کو اس طرح یاد کرتے تھے جس طرح عشاق شب ہجراں میں معشوق کو یاد کرتے ہیں۔ مکہ والوں کو جنکی سبب سے چاہ زم زم چھوٹا تھا اس طرح کوستے تھے جس طرح شب فراق میں رقیبوں کو گالیاں دینا عشاق کی زبان سے ایشیائی شعرا باندھتے ہیں۔ بیماری کی حالت تو تھوڑے دنوں تک رہی لیکن مہاجروں کے دل میں یہ خیال برابر جما رہا کہ زمزم سے اچھا پانی دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ ہاضم ہے تو وہ ہے مقوی ہے تو وہ ہے مردوں کے لئے چاہ زم زم سے اچھا پانی ہفت اقلیم میں پیدا نہیں ہے۔ جس طرح قریش باشندگان مکہ اپنے کو تمام دنیا سے افضل سمجھتے تھے اسی طرح مکہ کی ہوا اور چاہ زمزم کے پانی کو بھی وہ تمام دنیا سے اچھا جانتے تھے۔ حب الوطنی بھی ایک سبب تھی۔ لیکن اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ جن اوصاف کو قریش پسند کرتے تھے وہ اعلیٰ درجہ پر مکہ ہی کی آب و ہوا سے مخلوق ہو سکتا تھا۔ آٹھ دس برس تک مہاجروں کو مکہ میں آنا نصیب نہیں ہوا اور اس زمانے میں چاہ زم زم اور

سواد مکہ کے دیدار کے وہ بہت مشتاق تھے ۔ فراق میں گیت بنائے گئے تھے ۔ قصیدے کہے گئے تھے ۔ مرثیے لکھے گئے تھے ۔ غرض کہ اپنے ذوق شوق کو ان لوگوں نے مختلف طریقے سے ظاہر کیا تھا۔

ناظرین خود اس خوشی کا اندازہ کر سکتے ہیں جو فتح مکہ کے بعد مہاجروں کو مکہ میں آنے سے حاصل ہوئی ۔ کنوئیں کے گرد مسلمان کودتے تھے اچھلتے تھے ۔ خوشی کے نعرے بلند کرتے تھے ۔ بے پیاس بھی پانی پیتے تھے ہاتھ منہ دھوتے تھے ۔ آنکھوں میں پانی ملتے تھے بجائے تیل کے سر میں لگاتے تھے ۔ یہ زمانہ چند ہفتوں میں گزر گیا ۔ مسلمانوں کو پھر چاہ زم زم چھوڑنا پڑا ۔ جہاں تک ہو سکا انھوں نے چھاگلیں بھر لیں اور پھر حسرت سے چاہ زم زم چھوڑ کر مدینہ کا راستہ لیا مدینہ میں پہنچ کر زم زم کا اشتیاق پھر دلوں میں موجزن ہوا اور حسرت دیاس نے چاروں طرف سے گھیرا تھوڑے ہی دنوں کے بعد پندرہ بیس برس کے اندر اندر یعنی ہجرت کے تیس تیس برس پورے ہونے سے قبل مہاجر مشرق میں افغانستان تک مغرب میں افریقہ کے شرقی و غربی سواحل تک ۔ شمال میں بحر خضر (کیسپین سی) آرمینیہ ۔ سرحد قسطنطنیہ ۔ ترکستان تک پہنچ گئے ۔ مدینہ سے تو خیر چند دنوں کا راستہ تھا ۔ اب وہ اتنی دور پہنچ گئے کہ مہینوں کا سفر کریں تو مکہ میں پہنچنا نصیب ہو ۔ یہ ظاہر ہے کہ مکہ کی سی گرم خشک اور لطیف آب و ہوا ان مقامات مفتوحہ میں سے کسی کی نہ تھی ۔ سواد مکہ اور چاہ زم زم کا شوق ان پہلوانوں کے ساتھ ہفت اقلیم تک پھرا یہ خود تو مشتاق تھے ہی ۔ کہنے سننے سے انکے بچے، بیویاں انکے پڑوسی ان کے احباب بھی چاہ زمزم کے مشتاق تھے۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد ۔۔۔۔۔ بسا کیں دولت از گفتار خیزد

حج کعبہ کے فرض ہونے نے اور بھی سواد مکہ ۔ خانہ کعبہ ۔ جبل عرفات ۔ مقام منا ۔ صفا و مروا اور چاہ زمزم کا لوگوں کو شائق بنایا ۔ خود تو مہاجر باقی نہ رہے اور نہ ان کے ملنے والے زندہ رہے لیکن جو شوق کہ دلوں میں یاد وطن نے مذہبی خیال کے ساتھ مل جل کر پیدا کیا تھا اس کو روز بروز ترقی ہی ہوتی رہی ۔ غرض کہ انھیں سب خیالات نے مل جل کر وہ نتیجہ پیدا کیا جو فی زمانہ دیکھنے میں آتا ہے ۔ یعنی حج کرنے والے مسافر خاک ۔ غلاف کعبہ کا ٹکڑا ۔ سرمے کے پتھر ۔ چاہ زمزم کا پانی تبرکاً لاتے ہیں اور لوگ نہایت خلوص نیت اور مذہبی ولولے میں ان چیزوں کو چومتے ہیں اور آنکھوں سے لگاتے ہیں ۔ مرتے وقت چاہ زمزم کا پانی موجود ہو تو مرنے والے کے حلق میں ٹپکاتے

ہیں۔ مرتے وقت کہیں کہیں کفن پر بھی چھڑک دیتے ہیں یا غسل کے بعد جسم پر ڈال لیتے ہیں۔ جتنے
تبرکات مکہ سے حاجیوں کے ساتھ آتے ہیں ان میں آب زمزم سب سے زیادہ متبرک سمجھا جاتا ہے۔

یہ ایک تاریخی حالت بیان کی گئی تاکہ معلوم ہو کہ آب زمزم کی عظمت مسلمانوں میں کیونکر قائم ہوئی۔ بعض لوگ پیغمبرؐ کے ان اقوال سے سند لیتے ہیں جو چاہ زمزم کی خوبیوں میں بیان کئے گئے تھے۔ لیکن ہمارے نزدیک ان اقوال کے تذکرہ کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ مختصر طور پر سمجھ لینا چاہیئے کہ جس طرح مجنوں کو سگ لیلیٰ عزیز تھا اسی طرح مکہ اور مدینہ کی تمام چیزیں مسلمانوں کے نزدیک پیاری ہیں۔ خوبیوں کے لئے حدیث کے نقل کرنے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں ہے کہ شہد شہد کی خوبی خود قرآن میں مذکور ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بمقابلہ چاہ زمزم کے شہد کی بھی کچھ عظمت لوگ نہیں کرتے۔ اس میں مٹھاس نہ ہوتی تو شاید لوگ کوئی جانتا بھی نہیں۔ اس مٹھاس پر بھی ہندوستان میں قند اور مصری کے مقابلہ اسے کوئی نہیں پوچھتا اور کوئی پوچھتا بھی ہے تو نص قرآنی کی سفارش پر نہیں بلکہ اطبا کی تشخیص پر ایسے عالم جو انہیں کے ذریعہ سے شہد کو شفا امراض سمجھ کر اس کا استعمال کریں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ اس میں کوئی ضرر نہیں ہے بہت کم ہیں۔ اور نص قرآنی کا منشاء بھی یہ نہیں ہے کہ شہد کو لوگ جملہ امراض میں روزانہ استعمال کریں بلکہ شہد کے فوائد اور لذات کو یاد دلا کر خدا کی قدرت کا بندوں پر ظاہر کرنا مقصود اصلی ہے۔ اسی قبیل میں وہ حدیثیں بھی ہونگی جو چاہ زمزم کے متعلق لوگ ذکر کرتے ہیں۔

ان جملہ امور کے ظاہر کرنے سے ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ چاہ زمزم کی وقعت مسلمانوں کے دل میں کہاں تک مناسب یا غیر مناسب طور پر جمی ہوئی ہے۔ بلکہ ہم کو صرف یہ بتانا ہے کہ اب عام مسلمانوں کے خیال میں چاہ زمزم کی وقعت اور عظمت ایک مذہبی اثر رکھتی ہے اور اس کی توہین کرنا گویا مسلمانوں کا دل دکھانا ہے۔ غلطی پر ہیں وہ انگریزی اخبار جو چاہ زمزم کی برائیوں کے بیان کرنے میں یہ نہیں سوچتے کہ مسلمانوں کو اس کے سننے سے صدمہ ہوتا ہے ممکن ہے کہ بعض مسلمانوں پر اس کا اثر نہ پڑے۔ لیکن چونکہ عوام تعداد میں زیادہ ہیں اور "للاکثر حکم الکل" کے اعتبار سے عام مسلمانوں کے مصداق بھی وہی ہیں ہم یہ کہتے ہیں کہ آب زمزم کی برائی کیجائے اور مسلمان اسے سن کر خوش ہوں یہ غیر ممکن ہے۔

زمزم کی برائی کی طرف خیالات اس وقت سے پھرے ہیں جب سے دبائی امراض کی کثرت مکہ میں ہونے لگی ہے چونکہ ان حاجیوں کی بدولت اور ممالک میں بھی ہیضہ پھیلتا ہے اس لئے

یورپ کے ڈاکٹروں نے تمام تر توجہ اس کے اسباب دریافت کرنے کی طرف منعطف کی ہے گرم ملک ہے اور گرم ملک میں وبائی مرض زیادہ پھیلتا ہے۔ جہاں زیادہ لوگ جمع ہوں اور صفائی کا بندوبست عمدہ نہ کیا جائے، تو مرض زیادہ پھیل سکتا ہے۔ یہ سب وجوہ معقول ہیں۔ جہاں تک صفائی کا تعلق ہے مسلمانوں کو منتظموں۔ انتظام کی تحریک پیش کرنے والوں یا ایسی خواہش ظاہر کرنے والوں کا مشکور ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ بعض ڈاکٹروں کا یہ قول ہے کہ مکہ کی ہوا لطیف نہیں ہے بلکہ وبا پیدا کرنے میں اس کو خاص دخل ہے۔ یا یہ کہ چاہ زمزم کے پانی میں کوئی خاص نقص ہے۔ گندہ پانی کنوئیں کے اندر سوتوں سے پہنچتا ہے اور اس طرح عام طور پر پانی کو خراب کر دیتا ہے۔ یہ رائے ان لوگوں کے نزدیک قابل مضحکہ ہے جو مکہ کی زمین چاہ زمزم کے موقع اور وہاں کی ہوا کی لطافت سے واقف ہیں۔

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وبا کے اسباب کیا ہیں۔ جہاں تک غور کیا گیا ہے کوئی سبب ظاہر نہیں ہوا۔ کیونکہ سبب ظاہر ہونے کے بعد ازالہ سبب مشکل نہ تھا اور پھر قطعی طور پر یہ کہا جا سکتا تھا کہ وبا کا روکنا انسانی کوشش کے اندر داخل ہے۔ لیکن جب تمام ڈاکٹر اس خصوص میں اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہیں تو ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اسباب دریافت کرنے میں انکی رائیں قاصر ہیں۔ صفائی کی طرف ازالہ مرض میں زیادہ تر ڈاکٹروں کو توجہ ہوتی ہے اور صفائی خود بذاتہ ایک عمدہ چیز ہے اس لیئے طبیعتیں بے دلیل اسے مان لیتی ہیں ان ایام میں صفائی بہت ضروری ہے اور صفائی کے ہونے سے ایک گونہ تسکین خاطر بھی ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ گندگی اصلی سبب مرض پھیلنے کا نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو بیماری پھیلنے پر بھنگیوں کی موت کا اوسط زیادہ ہوتا اور بھنگی گندگی صاف کرنے کیلیئے اور دھوبی کپڑا دھونے کے لیئے میسر نہ آتے

مکہ میں قربانی کی وجہ سے اگر گندگی پھیلنے کا خیال قائم کیا جائے تو بادی النظر میں پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ جب اس امر پر غور کیا جائے کہ مکہ کی لطیف اور خشک ہوا خون کو سڑنے نہیں دیتی کثافت بھی دور پھینکی جاتی ہے۔ گندگی مرنے کے بعد پیدا ہوگی اور سڑنے کیلیئے کچھ وقت چاہیئے۔ حاجی اس وقت کے آنے سے پہلے سواد مکہ چھوڑ دیتے ہیں تو پھر یہ مشکل کہا جا سکتا ہے کہ قربانی کو کچھ بھی تعلق ہیضہ پھیلنے سے ہے۔

زمزم کے پانی کی نسبت جو کچھ بیان ہے وہ اتنا پوچ اور لچر ہے کہ کہنے والے پر سخت حیرت ہوتی ہے۔ زمزم کا پانی اگر ہیضہ کا سبب ہوتا تو ایام حج سے پہلے بھی ہیضہ پھیلتا رہتا۔ اور ایام حج میں اس لیئے کہ پانی زیادہ صرف ہونے سے صاف ہو جاتا ہے پانی کی برائی کو مٹ جانا یا صاف ہو جانا

چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ جس پانی میں ہیضہ پیدا کرنے کی خاصیت ہے اسے تمام ملک کے لوگ پیتے رہیں ہفت اقلیم کے مسلمانوں کے پاس ہزاروں میل کے فاصلے پر تبرک کے طور پر جائے۔ تمام دنیا اندھی کیڑے کسی کو نظر نہ آئیں صرف یورپ کے چند ڈاکٹروں کو نظر آئیں یورپ کے ڈاکٹر سچے اور پانی بھی اچھا۔ درمیان میں زیادہ ایام گزرنے سے خود بخود کیڑوں کا پیدا ہو جانا یا ظرف کی خاصیت سے پانی کا بگڑ جانا فرض کر لیا جائے استحالہ ہے۔

کنوئیں کا موقع پہاڑی زمین اور کنوئیں کا اتق دیکھنے کے بعد کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کنوئیں کے گرد گندہ پانی جمع ہو سکتا ہے اور اگر ایسا پانی جمع بھی ہو تو وہ کس طرح اندر جا سکتا ہے۔

زمزم کوئی چھوٹا سا کنواں نہیں ہے۔ بہت ہی عریض اور طویل ہے۔ پانی بھرنے والے مقرر ہیں۔ اس کے قریب کوئی نہانے نہیں پاتا۔ صفائی کا عمدہ انتظام رہتا ہے۔ دور تک سنگلاخ پتھریلی زمین ہے۔ کہیں سے یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ گندہ پانی سوتوں کی راہ سے اندر جا سکتا ہے۔ پانی بھرنے کے لئے چمڑے کے ڈول ہیں۔ مٹی کے گھڑوں سے پانی بھرا نہیں جاتا اور نہ ہر شخص پانی بھرنے کا مجاز ہے اس لئے پانی بھرنے میں بیرونی گندگی کا اندر جانا قرین قیاس نہیں ہے۔ ہندوستان کے کنوؤں کو صاف کرنے کے لئے جتنا پانی نکالا جاتا ہے اتنا پانی وہاں روز نکلتا رہتا ہے اور ایام حج میں تو اس سے کہیں زائد نکلتا ہے۔ کنوئیں کی گہرائی غالباً سطح سمندر کے برابر ہے۔ وہ کنواں ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز اس میں گرے تو پتہ لگے یا کوئی جا کر اسے نکال لائے۔ وہ ایک قدرتی چشمہ ہے اور جس طرح چشمہ کے پانی کو گندہ نہیں کہہ سکتے اسی طرح آب زمزم کو بھی آلائشوں سے پاک و صاف سمجھنا چاہیئے۔ قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ چشمہ ایک طرف سے دوسری طرف کو چلا گیا ہے اور بیچ میں تھوڑا سا کھل گیا ہے جس کو چاہ زم زم کہتے ہیں لیکن اگر چاہ زمزم ہی چشمہ کی انتہا مانی جائے جب بھی پانی اس کثرت سے خرچ ہوتا ہے کہ آب زم زم کو چشمہ جاری کا آب رواں بے تکلف کہہ سکتے ہیں۔

فصل نمبر ۶۸

جھاڑ، پھونک، دعا، تعویذ!

دعا، تعویذ، جھاڑ، پھونک یہ سب ڈھکوسلے اسلام میں نہیں تھے ہندوستان کے مسلمانوں نے ان معاملات میں ہندوؤں کی پیروی کی اور اسلام میں یہ باتیں بڑھالیں یا یوں کہئے کہ اسلام کی چادر پر یہ بدنما دھبے ڈال دیئے۔ اسلام جو اوہام باطلہ کے مٹانے کے لئے آیا تھا وہ ان باتوں کا مٹانے والا تھا نہ کہ رائج کرنے والا۔ ایام جاہلیت میں، بچوں کو تعویذ پہناتے تھے سبعہ معلقہ کا ایک مصرعہ ہے۔

فالهيتها من ذی تمائم محلول

اس میں ذی تمائم لڑکوں یعنی تعویذ پہننے والے بچوں کا تذکرہ ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اسلام نے بھی کہیں اس خیال کی تائید کی ہے۔ مسلمانوں کو تعویذ گنڈے کا عاشق فالنامے اور حاضرات کا معتقد، جھاڑ پھونک کا دلدادہ دیکھ کر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ ان کے اسلاف صالحین کا بھی شیوہ تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مریضوں کو دیکھنے جاتے تھے تو ان کے سر پر دست شفقت پھیرتے تھے اور تسلی کے لئے فرماتے تھے "طہور انشاء اللہ تعالیٰ" یعنی اللہ چاہے گا تو تم صحیح ہو جاؤ گے (گھبراؤ نہیں) اور اکثر یہ بھی فرماتے تھے: "اللهم اشفه الاشفاء الاشفاک" اے اللہ اس کو شفاء دے کہ تیرے سوا کوئی دوسرا شفا دینے والا نہیں ہے۔ یہ کہنا گویا مریض کو تلقین کرنا تھا کہ تم خدا پر بھروسہ کرو اوہام باطلہ سے پرہیز کرو۔ آنحضرتؐ کا یہ فرمانا ایسا ہی تھا جیسا کہ کوئی بزرگ شخص کسی کو مصیبت میں دیکھ کر براہِ ترحم تسکین دینے والے کلمات کہتا ہے اور عموماً اس مصیبت زدہ کے قلب اور طبیعت کو ایک قسم کی شگفتگی ہوتی ہے اور قوت پہنچتی ہے۔

اب اگر کوئی مریض کے سرہانے کھڑا ہو کر طہور انشاء اللہ کہے یا اللهم اشفه لاشفاء الاشفاک پڑھے اور خیال کرے کہ یہ کلمات ازالہ مرض کے لئے اسلام میں موضوع ہوئے تھے تو یہ شارع اسلام کی پیروی نہیں ہے۔

حصن حصین ایک حدیث کی کتاب ہے جس میں ہر قسم کی دعائیں حدیث شریف سے منتخب

کرکے ایک جگہ جمع کر دی گئی ہیں۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ ہر حالت اور ہر موقع پر ایک خاص قسم کی دعا پڑھتے تھے جس کو عام لوگ سمجھتے ہیں کہ جس وقت اور موقع کی وہ دعا ہے گویا اس وقت اور موقع کی بلا ٹالنے کے لئے ہے یعنی جو دعا جانے منزور کو جلانے کے لئے آنحضرتؐ پڑھتے تھے اس دعا کا یہ اثر ہے کہ اس کے پڑھنے سے وہاں کی یہ بلا دور رہتی ہے یہ خیال شارع کے خیال سے بالکل دور ہے۔ ہرگز آنحضرتؐ کوئی دعا اس لئے نہیں پڑھتے تھے کہ اس دعا کے پڑھنے سے بھوت پریت سے بچنا مقصود ہوتا تھا۔ ہرگز ہرگز نہیں ایسی باتیں اسلام سے بہت دور ہیں۔

ان دعاؤں کی اصلیت یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی کہ خالق عالم کو کبھی سوتے جاگتے چلتے پھرتے بیکاری یا کاری کی حالت میں نہ بھولو۔ ہر وقت اس کو یاد رکھو اور اسکی صنعتوں پر دھیان کرو۔ نماز تو پانچ وقت کے لئے مقرر ہے جو ایک طور پر فوجی قواعد ہے لیکن خدا کا ذکر ہر وقت کرو قرآن میں تاکید ہے کہ خدا کا ذکر کرو لیکن اس ذکر کے لئے کوئی خاص قاعدہ مقرر نہیں ہوا ہے دل سے۔ زبان سے۔ خیال سے کھڑے۔ بیٹھے لیٹے ہوئے جس طرح ممکن ہے اسے یاد کرو آنحضرتؐ نے نماز کے متعلق تو ضرور قاعدے بتائے کہ وہ ایک طور پر فوجی قواعد تھی لیکن ذکر کے لئے کوئی خاص قاعدہ نہیں بتایا ہر شخص کی رائے اور آسانی پر چھوڑا۔ لیکن خود اپنے لئے مناسب الفاظ مناسب مواقع کے لئے آپ نے چن لئے تھے۔ چنانچہ رات کو سوتے ہوئے جب کبھی آپ کی آنکھ کھل جاتی تھی اور آسمان نظر آتا تھا تو یہ آیت پڑھتے تھے "ان فی خلق السمٰوات والارض واختلاف اللیل والنہار لآیات لاولی الالباب الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبہم ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ہذا باطلا سبحانک فقنا عذاب النار" ترجمہ "آسمان اور زمین کی خلقت میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں ان عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں جو اللہ کو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے ہوئے یاد کرتے ہیں اور خلقت آسمان و زمین میں غور کرتے ہیں کہ اے رب تونے اسکو بے فائدہ نہیں بنایا (یعنی یہ عالم اسباب بڑی صنعت پر مبنی ہے) تو پاک ہے عذاب جہنم سے ہمکو بچا۔

آدھی رات کو یہ کلمات آسمان کی طرف منہ کرکے کہے جائیں تو بے انتہا خلوص اور بے حد معرفت الٰہی پائی جائے گی۔ لیکن انھیں کلمات کو کوئی شخص رات کے سناٹے میں بلیات سے بچنے کے لئے پڑھے تو ظاہر ہے کہ کس درجہ شارع اسلام کے مقصود سے دوری ہو جائے گی۔

مرغ سحر جس کو موذن صبح سمجھنا چاہیئے جب اپنی آواز سے لوگوں کو بیدار کرتا ہے تو اس کی اس خدمت کی قدر دانی یہی ہے کہ فوراً آنکھ ملتے ہوئے اٹھ کھڑا ہونا چاہیئے۔ چنانچہ آنحضرتؐ

مرغ سحر کی آواز کو بہت مغتنم سمجھتے تھے اور آواز سنتے ہی بجائے آنکھ ملنے کے زبان کو جنبش دیتے تھے اور فرماتے تھے "اللھم اسئلک من فضلک" اے اللہ ایسا ہی تیرا افضل میں برابر چاہتا ہوں کہ روز صبح کو اٹھ کر تیری یاد کر دں"۔ اب اگر کوئی یہ سمجھے کہ مرغ سحر کسی بلا کو دیکھ کر شور مچاتا تھا اور آنحضرتؐ رد بلا کے لئے دعا پڑھتے تھے تو ظاہر ہے کہ وہ اصل مقصد سے کتنا دور ہے۔

اس تحریر کا منشا یہ ہے کہ جو دعائیں ہیں وہ حکیم کے نسخوں کی طرح الگ الگ امراض کیلئے بنائی نہیں گئی تھیں ایسا بنانا خدا کی قدرت میں ہے۔ خدا کی قدرت سے بحث نہیں ہے بحث یہ ہے کہ شارع نے دعاؤں کے یہ قاعدے بھی بتائے ہیں یا نہیں۔ رہا یہ امر کہ دعا رفع تکلیف کی غرض سے یا حاجت براری کے لئے پڑھنا بے فائدہ ہے یا بافائدہ اس وقت موضوع اس بحث کا نہیں ہے۔

میرا عقیدہ یہ ہے کہ تمام دعاؤں سے مقصود اللہ کا ذکر ہے اور خضوع و خشوع سے اسکو پکارنا ہے۔ ورد میں حسب حال الفاظ کہنے سے خضوع اور خشوع میں مدد ملتی ہے اور شان عبودیت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے جو تمام طاعات کی جڑ ہے اتنا تو ظاہر ہے۔ اور اس سے بڑھ کر اگر یہ نیت ہو کہ خدا قانون قدرت کو توڑ کر حاجت روائی کر دے گا تو ایمان کے خلاف نہ ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ خدا قانون قدرت کے خلاف نہیں کرتا لیکن یہ سمجھنا کہ وہ کرنا چاہے جب بھی نہیں کر سکتا سخت بے ادبی ہے۔ بلکہ کفر ہے۔ جس خدا نے قانون قدرت بنایا ہے وہ اسکو توڑ بھی سکتا ہے پنکھے کی ڈور کو جو اندھا بیٹھا ہوا کھینچتا ہے اس کے اختیار میں تو اتنا ہے کہ اسے چھوڑ دے تو ہوا رک جائے اور خالق عالم باوجود خالق ہونے کے یہ قدرت نہ رکھے کہ خلقت عالم کے کسی معین قاعدہ کو مٹا سکے تو وہ خالق عالم کا ہے کو ہے خالق عالم کا مزدور بھی نہیں ہے۔ بہرحال اللہ سے دعا مانگنا کہاں تک درست ہے اور اس کے قبول ہونے کی امید کے کیا معنی ہیں یہ جدا بحث ہے۔ یہاں صرف چند اشعار مولانائے روم کے ہدیۂ ناظرین ہیں۔

از دعا نبود بس مقصود شان	جز سخن گفتن بہ آں شیریں دہان
گر کند مقبول بس فہو المراد	بادل و دیدار نقد آئند شاد
گر کند رو لذت آں بیشتر	بہر تقریب دگر بار دگر!

فصل نمبر ۶۹

اسلام اور غلامی

اپنے غلاموں کے ساتھ جو سلوک مسلمانوں نے کئے ان کا بیان فصل ۹ ، غلاموں کی حالت میں دیکھیئے۔ فصل ۷۱ " مسلمانوں کے احسانات دنیا پر" میں بھی غلامانِ مصر کی حالت بیان کی گئی ہے۔ یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ قرآن نے غلامی کا انسداد بھی کیا یا یہ کہ محض اس کے طریقے مہذب کئے اور اس کے قائم رکھنے کا حکم دیا۔ میرا خیال یہ ہے کہ انسداد کیا۔

پہلے غلامی کی تشریح کرنا چاہیئے تاکہ سمجھ میں آئے کہ غلامی کیا شے ہے اور بعدازاں پھر یہ بتایا جائے گا کہ قرآن نے کیونکر اس کا انسداد کیا۔

دنیا کی تاریخ پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے خلقت سے تمام دنیا میں یہ دستور جاری تھا کہ لوگ لڑائی کے قیدیوں کو مویشیوں کی طرح اپنے قبضہ میں رکھتے تھے اور جس طرح چاہتے تھے ان کے ساتھ برتاؤ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ انکی نسل کو بھی اپنی ملک سمجھتے تھے یہ وہ صورت غلامی کی تھی کہ کسی مہذب سے مہذب قوم نے بھی اسے ناجائز خیال نہیں کیا تھا اور دوسری صورت غلامی کی یہ تھی کہ فریب یا چوری سے کمزور زبردست کی قید میں آتا تھا اور کبھی کبھی زر کے معاوضے میں بھی ایسا ہوتا تھا۔ یہ صورت ضرور اخلاقاً مذموم سمجھی جاتی تھی لیکن اس کا رواج مثل اور بری باتوں کے تمام عالم میں تھا اور کوئی قوم اپنی خود غرضی کے سبب سے اس کے روکنے کی طرف کامل توجہ نہیں کرتی تھی۔

یہودیوں، ایرانیوں، ہندوؤں، یونانیوں اور رومیوں نے اپنے اپنے زمانے میں بڑے بڑے عروج پائے۔ لیکن غلاموں کی حالت کہیں بھی مہذب نہیں کی گئی۔ رومیوں نے ضرور کچھ اپنے غلاموں کے حقوق کی حفاظت کی تھی۔ لیکن بہت کم برائے نام۔ اور کثرت فتوحات کی وجہ سے رومیوں کے قبضہ میں جتنے غلام تھے پہلے کبھی دوسری قوموں کے پاس اتنے نہ تھے ان تمام قوموں میں دونوں قسمیں غلامی کی بے تکلف جاری تھیں۔

اسلام کی برکت دیکھیے کہ دوسری قسم کی غلامی اسلام کے جاری ہوتے ہی ان تمام ممالک سے اٹھ گئی جہاں اسلام کا جھنڈا پہنچا۔ اور اگر پھر قائم ہوئی تو اسلام کے ضعف کے ساتھ قائم

ہوئی۔ یعنی جہاں کہیں زمانہ مابعد میں اصول اسلام سے چشم پوشی کی گئی۔ وہاں اور برائیوں کے ساتھ دوسری قسم کی غلامی بھی جاری ہو گئی۔ لیکن اسلام پر اس کا الزام عاید نہیں ہو سکتا تمام علمائے زمانہ اسے تسلیم کرتے ہیں۔ رہی پہلی صورت۔ اس کی نسبت ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اسلام نے اس کو مٹانا چاہا تھا مگر اسکی بیخ کنی عملی طور پر نہ ہوسکی۔ بعد زمانہ رسولؐ کے وہ مسلمانوں میں قائم رہی لیکن یہ دلیل اس امر کی نہیں ہو سکتی کہ اسلام نے بھی اسکی اجازت دی ہے۔

پہلے ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسلام نے اس کا انسداد کرنا چاہا اور بعد ازاں پھر ہم یہ دکھائیں گے کہ اس پر عمل کیوں نہ ہوا۔

عرب میں اسلام پھیلنے کے وقت چھ قسم کی غلامی جاری تھی۔ اول خود کو بیچ ڈالنا۔ دوم اپنی اولاد صغیر کا بیچ ڈالنا۔ سوم چھوٹے لڑکے یا لڑکیوں کا پھسلا کر یا چرا کر بیچ ڈالنا۔ چہارم زبردستی اور ڈاکہ زنی یا رہزنی سے کسی کو پکڑ کر لانا۔ پنجم زمانہ جنگ میں دشمن کی رعایا کو پکڑ لانا۔ ششم حالت جنگ میں مردوں عورتوں اور بچوں کو قید کر لینا۔ ان جملہ اقسام کے غلام عربوں کے پاس تھے اور جو جتنا ہی زبردست تھا اتنے ہی زیادہ غلام اس کے پاس تھے آنحضرتؐ نے قطعی حکم غلاموں کے آزاد کرنے کا نہیں دیا۔ کیونکہ یہ بالکل ہی خلاف مصلحت تھا لیکن موجودہ غلاموں کے آزاد کرنے کو بے حد باعث ثواب بتایا بلکہ بہت سے جرائم کا کفارہ اسے قرار دیا اور آئندہ غلامی کے انسداد کے لئے صریح حکم سنائے۔

سورہ محمدؐ میں خدا فرماتا ہے:۔ جب تم مقابل ہو کافروں کے تو انکی گردنیں کاٹو اور جب ان پر گھمسان کر چکو تو ان کو قید کر لو پھر قید کرنے کے بعد یا تو ان پر احسان رکھ کر یا ان سے فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دو۔[1]

اب اس سے زائد تر وضاحت کیا چاہیئے۔ صاف محکوم ہوا کہ احسان رکھ کر چھوڑ دو۔ یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ کوئی تیسری یا چوتھی صورت نہیں بتائی گئی یعنی قیدیان جنگ کے قتل کرنے یا غلام بنانے کا حکم قرآن میں کہیں نہیں دیا گیا۔ دو ہی صورتوں میں انحصار کر دیا گیا یعنی صرف احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر چھوڑ دینا بتایا گیا۔ مشرکین عرب کی بہت سی بری رسمیں اس وقت تک مسلمانوں میں جاری تھیں جب تک انکی ممانعت کی نص قطعی نہیں آئی تھی۔ مثلاً جب تک شراب پینے کی ممانعت قرآن میں نہیں ہوئی مسلمان شراب پیتے تھے اور اسی طرح وہ دو بہنوں

---

[1] فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداءً۔ سورہ محمدؐ۔

کو ایک ساتھ زوجیت میں بھی رکھتے تھے۔ باپ کی بیوائیں بھی جب تک اسکی ممانعت نہیں آئی مسلمانوں کی زوجیت میں آتی تھیں۔ اور جب ممانعت ہوئی تو موجودہ عورتیں بدستور زوجیت میں رہیں اور آئندہ کے لئے ممانعت نافذ سمجھی گئی اسی طرح آیت حریت کے بعد وہ غلام جو پہلے سے موجود تھے بدستور حالت غلامی میں رہے لیکن انسداد غلامی کی آیت نازل ہونے کے بعد پھر کوئی نیا غلام نہیں بنایا گیا۔

جو غلام موجود تھے انکی آزادی اور آسائش کے لئے احکام صادر ہوئے غلاموں کا آزاد کرنا پیغمبرؐ نے باعث ثواب بتایا۔ گناہوں کا کفارہ بھی اسے مقرر کیا۔ یہ بتایا کہ غلام اپنی قیمت خود ادا کرنا چاہیں تو ان سے اقرار نامہ لے کر ان کو کمانے کی اجازت دیدو اور ایسے غلاموں کے لئے چندہ کرنے کی ترغیب دی۔ بیت المال سے روپیہ دینا بھی جائز رکھا۔ بعض حالتیں ایسی مقرر کیں کہ لونڈیاں خود بخود آزاد ہو جائیں۔ غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی از بس تاکید کی ان سب احکام سے عالموں کو یہ دھوکا ہوا کہ غلامی قائم ہے حالانکہ آئندہ غلامی کو روک کر موجودہ غلاموں کے لئے یہ احکام بتائے گئے تھے۔

قیدیان جنگ مسلمانوں کے قبضہ میں آکر ان کے حسن سلوک سے ایسا خوش ہوتے تھے کہ وہ گھر کا نام بھی نہیں لیتے تھے اور اس لئے احسان رکھ کر چھوڑ دینا یا فدیہ لے کر چھوڑ دینا یہ ایک حق تھا جس کا مطالبہ غلاموں کی طرف سے نہیں کیا گیا۔ پیغمبرؐ کے بعد جب مسلمانوں میں دولت بڑھی اور حسن اخلاق میں ترقی ہوئی تو غلاموں کو آزاد رہنے سے قید رہنا کہیں اچھا معلوم ہوتا تھا اور پھر وہ غلامی غلامی نہیں رہی وہ ایک قسم کی اخوت تھی جس طرح ہندوستان میں متبنٰی بیٹا بنانے کا دستور ہے۔ چیلے خوشی سے گھر چھوڑ کر گرو کے گھر آتے ہیں اسی طرح یہ غلام بنائے ہوئے بھائیوں کی طرح عیش و عشرت میں عربوں کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ اور گھر کا کام بھی نہیں لیتے تھے اسی طرح رفتہ رفتہ قیدیان جنگ کا غلام بننا جس کا انسداد پیغمبرؐ نے کیا تھا عربوں میں اور ان کے ذریعہ سے تمام بلاد اسلام میں قائم رہ گیا۔

قرآن میں جہاں کہیں احکام غلاموں کے مذکور ہوئے ہیں وہاں صیغہ ماضی مستعمل ہوا ہے جس سے صریح ظاہر ہوتا ہے کہ گزشتہ غلاموں کے متعلق یہ احکام تھے۔ قرآن میں کوئی ایسا لفظ نہیں آیا ہے جس سے معلوم ہو کہ آئندہ رقیت کے متعلق کوئی حکم ہے احادیث اور سیر کی کتابوں کو بغور پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ خدا کے زمانے میں بعد اس آیت حریت کے کوئی قیدی جنگ

غلام نہیں بنایا گیا۔ قرآن کی نص قطعی اور آنحضرت صلعم کا فعل صریح ثبوت اس کا ہے کہ غلامی کا انسداد اسلام نے کیا۔

آج کل یورپ میں قیدیان جنگ کے ساتھ برابر کا برتاؤ ہوتا ہے۔ نہایت آرام سے وہ رکھے جاتے ہیں اور جنگ ختم ہونے کے بعد وہ چھوڑ دیئے جاتے ہیں کبھی تو بطور احسان کے اور کبھی خرچہ جنگ کا معاوضہ لے کر۔ قیدیان جنگ کا قتل کرنا یا انکو بطور مال مفروضہ کے باہم تقسیم کر لینا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ اور اس کے خلاف ہونا صریح بد تہذیبی ہے اور خلاف انسانیت سمجھا جاتا ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن جسکو دعویٰ ہے کہ وہ ہر قرن اور ہر قوم کے مناسب حال ہے اور تمام امور کی نسبت اس میں ہدایتیں ہیں اس بارہ میں کیا حکم دیتا ہے یہ سوال اول اول سرسید کے دل میں پیدا ہوا اور انھوں نے ایک رسالہ اس پر تحریر کیا اور ثابت کیا کہ قیدیان جنگ کا قتل کرنا یا غلام بنانا قرآن میں محکوم نہیں ہے اور نہ پیغمبر خدا نے آیت حریت نازل ہونے کے بعد کبھی قتل کرنے یا غلام بنانے کا حکم دیا اس پر سرسید نے قرآن سے اور قول پیغمبر سے عمدہ عمدہ طور پر اپنا دعویٰ ثابت کر دیا ہے لیکن آخر میں انھوں نے یہ لکھا ہے کہ خلفائے اربعہ کے زمانہ میں غلام بنانے کا قاعدہ جو جاری تھا وہ بیجا تھا۔ خلفائے اربعہ معصوم نہ تھے اور نہ ان کا فعل بہ مقابلہ فعل رسولؐ کے قابل سند ہے" بیشک خلفائے اربعہ معصوم نہ تھے اور ان کا فعل بہ مقابلہ فعل رسولؐ کے قابل سند نہ تھا لیکن وہ قرآن اور فعل رسولؐ کو ہم سے اچھا سمجھتے تھے اگر ہم قرآن وحدیث سے افعال خلفائے اربعہ و اعمال مسلمانان متقدین کی مخالفت قائم نہ ہونے دیں تو یہ ہماری بڑی کامیابی ہے اس لئے سرسید کے خیالات پر مفصلہ . . . ذیل مضمون کا اضافہ کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

قرآن میں یہ حکم ہے کہ "احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو" یوں محکوم نہیں ہے کہ "فدیہ لے کر چھوڑ دو یا احسان رکھ کر چھوڑ دو" اگر پچھلی صورت ہوتی تو چھوڑنا لازم ہوتا۔ پہلی صورت میں چھوڑنا اسی وقت لازم آتا ہے کہ کوئی فدیہ لے کر آئے اور فدیہ بھی معقول ہو اور کہے کہ فلاں غلام میرا عزیز ہے اور یہ اس کا فدیہ ہے چھوڑ دو۔ کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خلفائے اربعہ کے پاس کوئی فدیہ لے کر آیا اور اس کا عزیز یا ہم قوم اسکی درخواست پر چھوڑا نہیں گیا جب ایسا نہیں ہوا تو خلفائے اربعہ پر خلاف نص صریح کے عمل کا الزام عاید نہیں ہوتا۔ جب تک احسان رکھ کر چھوڑنا یا فدیہ لے کر چھوڑنا عمل میں نہ آتا قید میں رہنا لازم تھا مسلمان اگر بجائے قید تنہائی کے قیدیوں کو اپنے گھروں میں بطور شاگردوں کے رکھتے تھے اور انکو ہر طرح کا آرام دیتے تھے ایسا آرام کہ وہ قیدی اپنا

گھر بھول جاتے تھے یہ صورت اچھی تھی بری نہ تھی۔ غلام آزاد کرنے کا بڑا دستور مسلمانوں میں تھا اور یہ صریح طور پر احسان رکھ کر چھوڑنا کہا جائے گا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح پیغمبر خدا بعد آیت حریت کے جنگ ختم ہوتے ہی قیدیوں کو چھوڑ دیتے تھے ویسا خلفائے اربعہ نے کیوں نہ کیا اس کا جواب یہ ہے کہ پیغمبرؐ نے ایسا جو کیا وہ شان پیغمبری تھی اور دوسرے یہ کہ پیغمبرؐ کے عہد میں لڑائیاں ملک عرب میں ہوئیں لڑائی فتح ہوئی اور فوراً قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ تمام قیدی مسلمان ہو کر فوج میں داخل ہو گئے خلفا کے عہد میں غیر قوم کے قیدی منزلوں طے کر کے لائے جاتے تھے نہ وہ بولی سمجھتے تھے اور نہ ملکی رواج سے ہی واقف تھے۔ اپنے ملک میں رہتے تو فساد کرتے۔ عرب میں احسان رکھ کر چھوڑ دیئے جاتے تو بھیک مانگتے۔ بھیک مانگنے سے ان کا کسی کے گھر میں بھائی بن کر رہنا اچھا تھا احسان رکھ کر چھوڑنا مناسب نہ تھا اور فدیہ دینے والا کوئی موجود نہ تھا کہ فدیہ دیکر ان کو اپنے گھر لے جائے ایسی حالت میں سوائے قید کے دوسری صورت نہ تھی اور قید کی بہترین صورت تھی کسی کے گھر میں انکو رکھنا اور یہ کہدینا کہ جب موقع آئے تو احسان رکھ کر آزاد کر دینا بس یہی حالت خلفائے اربعہ کے زمانے کے قیدیوں کی تھی۔

قرآن میں یہ حکم نہیں ہے کہ خواہ مخواہ قیدیوں کو چھوڑ دو اور نہ ایسا حکم مناسب ہو سکتا تھا اب بھی کسی مہذب گورنمنٹ کا یہ قانون نہیں ہے کہ خواہ مخواہ قیدی چھوڑ دیئے جائیں قیدیوں کے قتل کرنے کی ضرور ممانعت ہے اور خلفائے اربعہ کے زمانے میں بھی کوئی آدمی قتل نہیں کیا گیا تھا۔ فتوحات اسلام کے زمانہ میں ریل نہ تھی۔ تار نہ تھا مترجم زبانوں کے بکثرت نہ تھے۔ راستہ کی سہولت نہ تھی فتوحات کی کثرت تھی۔ مسلمانوں کے اخلاق دلوں کو مسخر کر رہے تھے۔ جو قیدی مدینہ میں آیا اس کے بھائی بند گھر پر ہی مسلمان ہو گئے اب بجائے اس کے کہ وہ قیدی کے چھڑانے کے لئے فدیہ بھیجتے ان کو قیدی کی حالت پر رشک آنے لگا کہ اے کاش ہم بھی قید ہو گئے ہوتے تو مدینہ اور مکہ کی زیارت کرتے خلیفۂ وقت کی صورت دیکھتے۔ ہمارا بھائی بڑا خوش نصیب تھا کہ اسکی ہجرت کے لئے غیب سے ایک صورت پیدا ہو گئی۔

قرآن کا یہ معجزہ ہے کہ وہ ہر حالت کے مناسب ہے آیت حریت پر پیغمبرؐ خدا نے جس طرح عمل کیا وہی مناسب تھا بعد ازاں خلفائے اربعہ کے وقت میں جس طرح اس پر عمل ہوا وہی ٹھیک تھا اس وقت اس سے اچھا عمل اس پر ہو نہیں سکتا تھا اب سلطان روم یا شاہ ایران وغیرہ شاہان اسلام کو لڑائی کی نوبت آئے اور قیدیان جنگ کے ساتھ یورپین تہذیب کے ساتھ وہ عمل کریں تو کہا جائے گا کہ قرآن کے موافق انھوں نے عمل کیا قرآن میں قیدیان جنگ کے قتل کرنے کا حکم آیت حریت میں نہیں ہے یورپین بھی

سے قیدی قتل نہیں کرتے ۔ رہا ان کا چھوڑنا ۔ یہ لازم نہیں ہے یورپین کبھی کبھی احسان رکھ کر چھوڑتے ہیں اور کبھی زرِ جرمانہ جنگ لے کر چھوڑتے ہیں اور خرچہ جنگ نہیں ملا یا حسب خواہ نہیں ملا تو نہیں بھی چھوڑتے یہی قرآن بھی کہتا ہے اور یہی اس وقت کی مہذب قوموں کا دستور ہے ۔

فصل نمبر ۶

سودخواری

سودخواری کے متعلق آیات قرآنی حسب ذیل ہیں ۔

"سود کھانے والے (قیامت میں) ایسے کھڑے ہوں گے گویا انہیں شیطان نے چھو کر مخبوط کر دیا ہے یہ ان کے اس کہنے کی سزا ہے کہ جیسا معاملہ بیع کا ہے ویسا ہی سود کا ہے ۔ حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے (یعنی اس میں برکت نہیں دیتا اس میں برکت دیتا ہے) ۔ ۔ مسلمانو تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو [1] "

"مسلمانو! سود نہ کھاؤ کہ دگنا چوگنا ہوتا چلا جائے گا اور اللہ سے ڈرو ۔ عجب نہیں کہ تم فلاح پاؤ [2] "

"تم لوگوں کے مال میں زیادتی کے لئے سود دیتے ہو تو اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ نہیں ہوتی ۔ خدا کے لئے جو زکوٰۃ دے رہے ہیں وہی بڑھا رہے ہیں [3] "

. . . . سود کے ممنوع ہونے کے کئی وجوہ غور کرنے سے سمجھ میں آتے ہیں ۔ اول یہ کہ سود پر روپیہ دینا مخالف ہے تجارت کے ۔ شرع نے سودخواری سے باز رکھ کر زکوٰۃ کا ٹیکس لگایا ہے تاکہ خواہ مخواہ لوگ تجارت کریں ۔ تجارت میں علاوہ قومی نفع کے تجارت کے ذریعہ سے قوم مالدار ہوتی ہے شخصی نفع بھی ہے یعنی سود سے اتنی دولت جمع نہیں ہوتی جتنی کہ تجارت سے جمع ہو سکتی ہے ۔

دوم یہ کہ سود پر روپیہ دینا اگر مدیون کی خانگی ضرورت کے لئے ہے تو صریح شقاوت ہے اور اگر مدیون کو تجارت کے لئے دیتا ہے تو قماربازی کی ترغیب دینا ہے اور دونوں صورتیں مذموم ہیں سودی روپے سے تجارت کرنا ایک قسم کی قماربازی ہے اس کے متعلق میں خود ایک اپنا واقعہ درج کرتا ہوں ۔ میں نے اپنے ایک عزیز کو کچھ روپیہ تجارت کے لئے دیا ۔ اس عزیز نے دو تین برس میں اصل کو دگنا کر دیا اور یہ کامیابی کی صورت تھی مجھ کو خبر ہوئی تو میں نے صرف اتنا کہا کہ "تجارت میں زکوٰۃ ضرور دی جائے اور سود پر کوئی معاملہ نہ کیا جائے ۔ ورنہ بغیر ان دونوں باتوں کے تجارت

---

[1] سورہ بقر رکوع ۳۸ [2] سورہ آل عمران رکوع ۱۴ [3] سورہ روم رکوع ۴ ۔

میں برکت اور پائداری نہیں ہوتی۔ عربوں کی تجارت پشتہا پشت چلتی تھی پانچ پانچ سو برس تک انکی تجارت قائم رہتی تھی۔ مصر کے خاندانی تاجروں کی دولت کی نسبت مورخوں نے لکھا ہے کہ بادشاہوں کو ان سے کوئی نسبت نہ تھی اور آجکل کی یورپین تجارت گویا کچے سوت کا جال ہے روز ہی دیوالہ نکلا کرتا ہے۔ پونجی کچھ نہیں اور انتظام تمام خدائی کا ذرا بل پڑا اور دیوالہ نکلا۔ صنعت وحرفت کو ان لوگوں نے تجارت کے ساتھ ملا دیا ہے اس لئے ذرا پائداری ہے اور جہاں کہیں نری تجارت ہے وہاں کچھ بھی قیام نہیں ہے۔" غرض کہ اس عزیز نے میری نصیحت پر کچھ بھی عمل نہیں کیا اور نتیجہ بد دیکھنے میں آیا نقصان ہوا تو ایسا کہ اصل اور نفع سب جاتا رہا خیریت ہوئی کہ کچھ گھر سے دینا نہیں پڑا تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ پانچ ہزار سے تجارت شروع ہوئی تھی تیسرے برس دس ہزار ہو گئے اور اس دس ہزار کا گھی تانہ نیپال سے کر کلکتہ روانہ کیا گیا آڑھت میں مال پہنچتے ہی ساڑھے نو ہزار سودی مل گئے فوراً ساڑھے نو ہزار کا مال بھیجا گیا اور نو ہزار پھر مل گئے غرض کہ اسی ہیر پھیر میں ایک لاکھ کا گھی دو ماہ کے اندر کلکتہ پہنچ گیا اور ۹۰ ہزار سودی قرض اس مال کی ضمانت پر گویا تجارت کے سر آیا۔ اتفاق دیکھئے کہ گھی کا بازار روز بروز اترتا گیا اور اتنے میں برسات آگئی اور گھی خراب ہونے لگا اب تک مجھے خبر نہیں ہوئی تھی کیونکہ کارکن دوسرے صاحب تھے یہ حالت دیکھ کر میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ بیدار ہو جائیے نہیں تو گھر کی جائداد بھی نیلام ہوا چاہتی ہے۔" تمام حالات مجھ کو ان سے معلوم ہوئے تو مجھ کو بھی پریشانی ہوئی کہ جب گھی خراب ہو جائے گا تو ضروری ہے کہ ۹۰ ہزار میری ذات اور جائداد سے وصول کیا جائے گا یا میری جائداد سے نہ سہی اس شخص کی جائداد سے جس کے نام سے تجارت جاری تھی بہر حال اب مجھ کو فکر ہوئی اور کسی طرح میں نے اس گھی کے بکنے کا بندوبست کیا خیریت ہوئی کہ درگا پوجا کا زمانہ آگیا اور گھی کسی طرح فروخت ہو گیا اور دس ہزار کا نقصان ہوا اصل رقم اور تین سال کا نفع اس نقصان کی نذر ہوا نفع ہوتا تو لاکھ پر ہوتا اور نقصان ہوا تو وہ بھی لاکھ کے برتہ سے ہوا نفع سے ایک دم سے کام بن جانے کی امید تھی اور نقصان میں ایک دم سے سب کاروبار بگڑ گیا اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ لوگ جو کہتے ہیں کہ آجکل کی تجارت بغیر سود کے نہیں چلتی اس کا مطلب یہ ہے کہ آجکل کی تجارت قمار بازی ہے تجارت نہیں ہے حالانکہ تجارت وہی ہے جو شرع میں محکوم ہے کہ سود کا معاملہ نہ کیا جائے اور نہ قمار بازی کی صورت پیدا ہو۔ جتنی دولت ہو اسی کی مقدار سے تجارت کی جائے اور تجارت میں بکری نقد ہو ادھار نہ ہو لوگ کہتے ہیں کہ ادھار بیچے بغیر تجارت نہیں چل سکتی یہ غلط ہے۔ ادھار بیچنا بھی ایک قسم کی قمار بازی ہے بجائے ۲ آنے فی روپیہ لینے کے ۳ آنے کے لالچ میں لوگ قرض دیتے ہیں قرض وصول ہو گیا تو بن گئے اور نہ وصول ہوا تو بگڑ گئے بجائے دو آنے کے پونے دو آنے قبول کئے جائیں اور ۳ آنے نہ

منظور کئے جائیں تو تجارت میں پائداری ہوتی ہے۔ اس وقت ۲ ملتے ہیں اور ۴ ماہ بعد ۳ ملیں گے یہ سود نہیں تو اور کیا ہے۔ غرض کہ سود کے معاملہ سے شرع محمدی نے روک کر انسانی ہمدردی اور اصول تجارت کا پورا اور پکا سبق مسلمانوں کو سکھایا ہے۔

سوم یہ کہ سود لینے سے دلوں میں کمزوری اور نیتوں میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ بے محنت کھانے کو ملتا ہے اور انسان کے لئے سب سے بڑی بلا یہ ہے کہ اسکو محنت نہ کرنا پڑے اور کھانے کو ملتا جائے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سود خوار بنیئے ہندوستان کے بڑے مالدار اور ایماندار ہوتے ہیں اور نہایت لطف سے زندگی بسر کرتے ہیں حالانکہ وہ بالکل خلاف شرع عمل کرتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ بمقابلہ تجار کے سود خوار کم متمول ہوتے ہیں سواحل بحر کے تاجروں سے مقابلہ کیا جائے تو سود خوار بنیئے نہایت قلیل البضاعت ثابت ہوں گے رہی انکی ایمانداری۔ میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ہندوستان کے دیگر پیشوں سے سود خواری اچھی ہے اور اس لئے نسبتہً سود خوار ایماندار بھی ہیں اور خوشحال بھی ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سود خواری تجارت سے اچھی ہے ایک پیشہ ملازمت کا ہے یہاں کی ملازمت میں رشوت کو اخلاقاً معیوب نہیں سمجھتے کتنے ملازم جو سیکڑوں روپیہ ماہانہ رشوت لیتے ہیں اور سود خوار کے گھر کا پانی نہیں پیتے اور کہتے ہیں کہ سود خوار کے گھر کا پانی حرام ہے حالانکہ رشوت لینے اور خیانت کرنے سے سود کھانا اچھا ہے اسی طرح جو زمیندار آسامیوں پر جبر ناجائز کر کے اور پٹی داروں سے بے ایمانی کر کے روپیہ پیدا کرتے ہیں انکی زمینداری سے سود خواری اچھی ہے۔ رقص و سرود کے پیشہ سے جس میں زناکاری لازمی ٹھہرائی گئی ہے سود خواری بدرجہا بہتر ہے حتیٰ کہ تجارت میں جھوٹ بولنے والے اور دغا دینے والے بھی سود خوار سے بدتر ہیں۔ مال یتیم کھانے والے دوسروں کی جائداد پر قبضہ ناجائز رکھ کر تمادی کا عذر پیش کرنے والے بھی سود خوار سے برے ہیں میں ڈرتا ہوں کہ میری تحریر سود خواری کی ترغیب نہ دے۔ سود کھانا برا ہے اور ضرور برا ہے لیکن اس وقت سود کھانے سے بھی زیادہ برے دستور کسب معاش میں جاری ہیں ان سے بھی اجتناب چاہیئے اور سود خواری سے بھی بچنا چاہیئے پھر اکل حلال میں وہ لطف آئے گا اور دولت اتنی جمع ہوگی کہ رکھنے کی جگہ نہ ہوگی یہ خیال غلط ہے کہ فاقہ کشی کے لئے اسلام آیا ہے اسلام پھیلایا گیا ہے انسان کو متمول کرنے کے لئے اسلام کے قاعدوں پر عمل کرنے سے جتنی دولت جمع ہوتی ہے دوسرے ذریعہ سے جمع نہیں ہو سکتی بشرطیکہ ان پر پورا پورا عمل کیا جائے۔

فصل نمبر ۱۷

رسم پردہ

عورتوں کے پردہ کے متعلق جو احکام قرآن میں ہیں وہ یہ ہیں ۔

"اے پیغمبر مسلمانوں سے کہو کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اس میں انکی زیادہ صفائی ہے وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ کو معلوم ہوتا ہے۔ اور مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنے مقامات زینت ظاہر نہ ہونے دیں سوائے اس مقام کے جس کا ظاہر کرنا لابدی ہے اور اپنے سینوں پر دوپٹوں کی بکل مارے رہیں اور شوہر، باپ، سسرہ، بیٹے۔ شوہر کے بیٹے، بھائی، بھتیجے، بھانجے میل جول کی عورت، لونڈی، غلام، مرد خدام جو عورتوں سے غرض نہیں رکھتے یا ایسے لڑکے جو عورتوں کے پردے سے آگاہ نہیں ہیں ان کے سوا دوسروں پر اپنے زینت کے مقامات ظاہر نہ ہونے دیں اور چلنے میں اپنے پاؤں اپنے زور سے نہ رکھیں کہ لوگوں کو ان کے اندرونی زیورات کی خبر ہو۔ مسلمانو! تم سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو کہ تم فلاح پاؤ[1]"

بڑی بوڑھی عورتیں جن کو نکاح کی امید باقی نہیں رہی اگر وہ اپنے اوپر کے کپڑے اتار لیں تو اس میں ان پر کچھ گناہ نہیں ہے بشرطیکہ اپنا بناؤ دکھانا منظور نہ ہو۔ اور اگر اس کی بھی احتیاط رکھیں تو اور اچھا ہے۔ اللہ سنتا ہے اور جانتا ہے[2]"

"اے پیغمبر تم اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمان عورتوں سے کہدو کہ اپنی چادروں کے گھونگٹ نکال لیا کریں اس سے غالباً وہ پہچان پڑیں گی بیویاں ہیں۔ پھر ان کو کوئی نہ چھیڑے گا۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے[3]"

ان آیتوں پر غور کیجئے۔ پہلی آیت میں عورتوں کو صرف یہ تاکید ہے کہ وہ اپنے مقامات زینت نہ ظاہر ہونے دیں اور سینوں پر ایسا کپڑا رکھیں کہ سینے کا ابھار نظر نہ آئے مقامات

---

[1] سورۂ نور رکوع ۴ ۔

[2] سورۂ نور رکوع ۸ ۔

[3] سورۂ احزاب رکوع ۸ ۔

زینت میں سے وہ مقام جنکا ظاہر کرنا لابدی ہے مستثنیٰ کئے گئے ہیں۔ فقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ منہ اور ہتھیلیوں کے سوا عورتوں کو اپنا تمام جسم چھپانا چاہیئے۔ شرع میں قاضی کے سامنے عورتوں کو منہ کھول کر اظہار دینا محکوم ہے۔ تمام عورتیں مسلمانان سابق کے برابر سفر کرتی تھیں۔ باہر نکلتی تھیں۔ آخر وقت تک پیغمبرؐ خدا اپنی ازواج کو برابر اپنے ساتھ ساتھ سفر میں لے جاتے تھے ہندوستان میں جس طرح عورتیں چار دیواری کے اندر قید رہتی ہیں۔ عدالت میں کبھی جانے کا اتفاق ہوا تو ڈولی کے اندر لوٹو بن کر گئیں ریلوے اسٹیشن پر ٹرین سے اترتے چڑھتے وقت تمام مسافروں کا تماشہ بنی رہیں۔ یہ دستور اسلام نے نہیں سکھایا ہے۔ اب بھی عرب مصر۔ شام وغیرہ تمام بلاد اسلام میں عورتیں بے تکلف گھوڑوں پر چڑھتی ہیں سب کام بازار کا کر لاتی ہیں منہ پر برقعہ رکھتی ہیں۔ لیکن یہ برقعہ اچھا ہو یا برا قرآن میں محکوم نہیں ہے اور نہ پیغمبرؐ خدا کے زمانے میں شروع ہوا۔ جس طرح کعبہ کے گرد چار مصلے بن گئے اسی طرح بعد کو برقعہ بھی جاری ہوا۔ اس کے بدعت ہونے میں کلام نہیں۔ حسنہ اور سیئہ کا تصفیہ کرنا نہیں چاہتا۔

غرض کہ منہ چھپانے کا حکم قران میں کہیں نہیں ہے۔ البتہ سورۂ احزاب میں گھونگٹ نکالنے کا حکم ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دہلی اور لکھنؤ میں مہاجنوں کی عورتیں ڈیا۔ بازار یا مقامات پرستش وغیرہ کو پیادہ پا گھونگٹ نکالے ہوئے جھنڈ کی جھنڈ جاتی ہیں اسی طرح قرآن میں بھی مسلمان عورتوں کی نسبت حکم ہے کہ وہ گھونگٹ نکال کر چلا کریں۔ اگر یہ معنی صحیح ہوں جب بھی جو طریقہ پردہ کا مسلمانوں میں رائج ہے اس کی تائید اس سے نہیں ہوتی لیکن واضح رہے کہ "گھونگٹ نکال کر چلنا" یہ متفق علیہ ترجمہ نہیں ہے یہ ترجمہ باعتبار رواج مولوی نذیر احمد صاحب نے اختیار کیا ہے اور ممکن ہے ان کو دھوکہ ہوا ہو مولوی عبدالقادر کے حاشیہ سے۔ جسمیں لفظ گھونگٹ کا استعمال کیا گیا ہے۔ یا تفسیر حسینی میں جو عبارت "ایں پوشیدن سر و روے و بدن" ہے اس نے انکو مغالطہ دیا ہو یا کوئی اور ترجمہ متاخرین کا انھوں نے دیکھا ہے بہر حال دیگر مستند تراجم میں گھونگٹ نکالنا نہیں ہے بلکہ چادر اوڑھنا لکھا ہوا ہے۔

مختلف ترجمے:۔

مولوی نذیر احمد: اپنی چادروں کے گھونگٹ نکال لیا کریں۔

مولوی شاہ ولی اللہ: فرو گذارند بر خود چادر ہائے خود۔

سعدی علیہ الرحمۃ: فرو گزارند بر خود از چادر ہائے خود

مولوی رفیع الدین : نزدیک کرلیں اوپر اپنے بڑی چادریں اپنی۔

شاہ عبدالقادر : نیچی لٹکالیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں۔

مولوی نذیر احمد نے وہ مضمون صاف کر دیا جس کو دب دب کر مولوی عبدالقادر نے لکھا تھا لیکن مولوی رفیع الدین کے ترجمہ سے ذرا بھی گھونگٹ نکالنے کی طرف اشارہ نہیں نکلتا۔ اور نہ سیاق عبارت سے ایسا معلوم ہوتا۔ شان نزول آیت یہ ہے کہ جب مدینہ کی عورتیں باہر نکلتی تھیں تو لوگ دل لگی کرتے تھے۔ شریف کی عورتوں کی شکایت پر لوگوں کو یہ عذر ہوتا تھا کہ لونڈیوں میں اور شریف کی عورتوں میں جب کبھی فرق نہیں ہوتا تو غلطی ہوجاتی ہے۔ حکم ہوا کہ عربوں میں جو دستور پہلے سے تھا کہ عورتیں کئی تہہ کپڑے پہنتی تھیں وہ کیوں نہ جاری رہے یعنی عورتیں سب کپڑوں کے اوپر ایک بڑی سی چادر اوڑھ لیا کریں۔ اس طرح وہ پہچان پڑیں گی کہ بیویاں ہیں اور پھر کوئی انکو نہ چھیڑے گا۔ اس وقت عرب میں گھونگٹ نکالنے کا دستور نہ تھا۔ کہیں سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر عرب کی عورتیں گھونگٹ نکال کر چلتیں تو چھیڑنا موقوف نہ ہوتا وہ تو اور ایک تماشہ ہوجاتا۔

بہرحال عورتیں اسلام میں اسی طرح چل پھر سکتی ہیں اور بے تکلف باہر نکل سکتی ہیں۔ جس طرح یورپین لیڈیاں۔ صرف اس قدر فرق ہے کہ یورپین لیڈیاں۔ صرف اس قدر فرق ہے کہ یورپین لیڈیاں جو سر اور گردن کو کھلا رکھتی ہیں اور سینہ پر کوئی اوڑھنی نہیں رکھتیں یہ خلاف شرع ہے اگر وہ اس قدر ترمیم کرلیں تو انکی پوشش اور روش شرع محمدی کے مطابق ہوجائے۔

بعض ہندوؤں کا قول ہے کہ رسم پردہ مسلمانوں سے ہندوؤں نے لی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ عرب سے کابل تک پردہ کی نوعیت میں وہ سختی نہیں۔ ہے جو شریف ہندوؤں یا شریف مسلمانوں میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پردہ کی موجودہ حالت ہندوؤں میں تھی مسلمانوں نے اسکی تقلید کی اور اتنا مبالغہ کیا کہ ہندوؤں سے بھی بڑھ گئے۔ میں اپنے قیاس کی دلیل یہ رکھتا ہوں کہ قوم منکوب کا شعار ہے عورتوں پر سختی کرنا۔ عرب کو دیکھیئے زمانۂ انحطاط میں وہ کچھ اور نہ کرسکے تو عورتوں کے لیئے برقعہ بنایا۔ یہ برقعہ سر سے پاؤں تک ایک خول کی صورت میں نہایت تکلیف دینے والا ہوتا ہے۔ جن کو عادت نہیں ہے ان کا تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ لیکن پھر بھی شکر ہے کہ ہندوستان کی قید دوام سے تو اچھا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوؤں میں رسم ستی جاری تھی عقد بیوگان کا انسداد تھا۔ عورتوں کو مثل لونڈیوں کے رکھتے تھے۔ کیا کسی عورت سے جب تک وہ

قید کی حالت میں نہ رہے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ شوہر کے ساتھ چتا پر جلنے کو تیار ہوگی۔ یا جوانی کی حالت میں بیوہ ہو کر غیر مرد کی طرف دیکھنا پسند نہ کرے گی۔ اگر ذرا سی بھی عقل لیکن سیدھی عقل ٹیڑھی نہیں ہمارے دماغ میں ہے تو ہم سوا اس کے اور کچھ نہیں سمجھ سکتے کہ پہلے عورتوں کا پردہ قائم ہوا اس کے بعد ان سے فرمائش ہوئی کہ بیوہ ہونے پر پھر کسی مرد کا منہ نہ دیکھو اور بہتر ہے کہ مرد کے ساتھ تم بھی جل جایا کرو۔ یہی وجہ ہے کہ جن رذیل قوموں میں خانگی کاروبار کے جھگڑوں کی وجہ سے رسم پردہ قائم نہ ہو سکی وہاں مردوں کی ہمت اس قسم کی فرمائش کی طرف مائل نہ ہو سکی۔ جس خاندان میں رسم پردہ نہیں ہے وہاں عقد بیوگان جاری ہے جہاں مسلمانوں نے اور بہت سی برائیاں ہندوستان میں سیکھیں وہاں یہ بھی سیکھا کہ جن عورتوں کو گھوڑوں پر دوڑاتے ہوئے اور میدان جنگ کی ہوا کھلاتے ہوئے وہ یہاں تک لائے انکو یہاں مکان کی چار دیواری میں ہمیشہ کے لئے قید کر دیا۔

اس وقت جس طرح ہندوؤں میں چھوت کا بچار معیار شرافت ہے۔ جو جتنا ہی شریف ہے وہ اتنا ہی اس کا پابند ہے اسی طرح یہاں کے شریف مسلمانوں کی پہچان انکی عورتوں کا پردہ ہے۔ جن کے گھروں میں جتنی ہی سختی کے ساتھ پردہ جاری ہے اتنا ہی پرانا خاندانی شریف انکو سمجھنا بجا ہے۔ اور ایک حد تک یہ صحیح بھی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ شرافت کی قائم رکھنے والی گھر کی بیویاں ہیں اگر رسم پردہ اٹھا دی جائے تو بہت بڑا انقلاب ہو۔ جس طرح مرغ قفس قفس سے نکل کر دوسرے جانوروں سے خود کو بچا نہیں سکتا اسی طرح پردہ کی بیویاں اگر ایک دم سے باہر کر دی جائیں تو بہ نسبت رذیلوں کے انکو اپنی عصمت کا محفوظ رکھنا از حد دشوار ہوگا اور ایک بہت بڑا اثر قوم پر ہوگا اور دوسری طرف یہ دقت ہے کہ عورتوں کی تعلیم انکے حقوق کی حفاظت اور انکی جائز آزادی کا قیام منحصر ہے۔ رسم پردہ کی سختیوں کے اٹھنے پر اور انکی تعلیم اور جائز آزادی پر منحصر ہے قوم کی آئندہ ترقی۔ موجودہ حالت میں عورتیں غلام جن سکتی ہیں مرد میدان پیدا نہیں کر سکتیں۔ جب وہ خود غلامی کی حالت میں ہیں تو اولاد کو آزادی کا سبق نہیں سکھا سکتیں۔ دونوں پہلو بتا دیئے گئے بہی خواہان قوم غور کریں کہ ان کو کیا کرنا چاہیئے۔

فصل نمبر ۷

روح اور مسئلہ تناسخ

اسلام میں روح کی نسبت اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ وہ خدا کا حکم ہے۔ لوگوں نے پیغمبرؐ خدا سے روح کی حقیقت پوچھی۔ وحی آئی "قل الروح من امر ربی" ترجمہ (پیغمبر بتا دے کہ روح خدا کا حکم ہے) یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ روح کی حقیقت بیان کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔ ہرگز نہیں اس عالم ناسوتی میں اس سے زاید اگر سمجھایا جاتا تو سمجھ میں نہ آتا۔ کوئی سمجھ سکتا ہے تو صرف اتنا ہی کہ یہ خدا کا ایک حکم ہے اور اس لئے مخاطب کی سمجھ کے مطابق جواب دیا گیا۔ اور در پردہ یہ بتایا گیا کہ اس سے زائد کوئی سمجھنا چاہے تو سمجھ نہیں سکتا کوشش کرنا بیکار ہے۔

حکیموں اور فلسفیوں نے روح کے سمجھنے کی کوششیں کی ہیں اور مختلف زمانہ میں اور مختلف فرقوں میں اس کی مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ ایک ہوا ہے جو آتی ہے اور نکل جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ باری تعالےٰ کی ذات کا ایک پرتو ہے کوئی کہتا ہے کہ وہ ایک الگ شے ہے جس کے تعلق سے حیات قائم رہتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہیئت مجموعی سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اسی کا نام روح ہے اسی طرح بہت سی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ جو مذہب اسلام سے نہ موافق ہیں اور نہ مخالف ہر ایک رائے زن اپنی رائے کی نسبت یقین نہیں رکھتا۔ صرف اتنا کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ یوں ہو۔ اور یہ کسی طرح اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ جو کچھ خلاف ہے وہ اس کے متعلق رائے زنی کرنا ہے۔ یہ ایک راز خلقت ہے اور پیغمبرؐ خدا نے کہا کہ اس پر غور نہ کرو۔ غور کرنے والے جب تھک کر کسی رائے پر قائم نہیں ہوتے تو سوچتے ہیں کہ اسلام نے اس پر غور کرنے سے گریز کیا تو بیجا نہیں کیا۔

مسلمانوں کے یہاں روح کی حقیقت بیان نہیں کی گئی ہے لیکن یہ بتایا گیا ہے کہ تمام جسم میں روح ہی اصل ہے اور اس پر صحیح طور پر اطلاق انسان کا ہوتا ہے یہ جسم خاکی کے نابود ہو جانے کے بعد بھی قائم رہے گی اور جسم خاکی سے تعلق رکھنے کے زمانے میں جس قدر برائیاں اور بھلائیاں اس سے سرزد ہوئی ہیں ان سب پر اس کو انفعال اور مسرت ہوگی بعضوں کے نزدیک اسی انفعال اور مسرت کو زبان تمثیلی سے دوزخ اور بہشت سے تعبیر کرتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

لیکن اتنا ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ عمدہ کام کی ترغیب اور برے کاموں سے اجتناب کے لئے دوزخ اور بہشت کا ہونا زائد تر قرین قیاس صورت اور براز حکمت بیان بہ نسبت اس قول کے ہے کہ تناسخ کے ذریعہ سے روح کو اپنے اچھے برے افعال کا نتیجہ اس عالم میں معلوم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ دوزخ اور بہشت میں روح کو اپنی سابق حالت کا خیال ہوگا تو وہ اسکی خوشی یا رنج کا باعث ہوگا۔ لیکن تناسخ کا مسئلہ اصلاح حال میں کچھ مدد نہیں دیتا اس عالم میں کوئی شخص کتنی ہی بری حالت میں ہے۔ لیکن اس کو کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ گزشتہ جنم میں ہم نے فلاں برائی کی تھی اس لئے اس حال کو پہنچے۔

اسلام کہتا ہے کہ برے کام کروگے تو دوزخ میں چلے جاؤگے اور وہاں اپنی برائیاں یاد کروگے اور پچھتاؤگے۔ اچھے کام کروگے تو جنت ملے گی اور جنت میں اپنی بھلائیاں یاد کروگے تو یاد کروگے اور سمجھوگے کہ تمہارے اعمال کا یہ بدلا ملا ہے ناظرین اس کا فیصلہ خود کرلیں گے کہ اچھے کاموں کی ترغیب دوزخ اور بہشت کے وجود پر ایمان لانے والوں کو ہوگی یا مسئلہ تناسخ پر یقین کرنے والوں کو۔؟

فصل نمبر ۷۳

تجہیز و تکفین

طریقہ تجہیز و تکفین کی نسبت قرآن میں کچھ حکم نہیں ہے۔ جو طریقہ پہلے سے جاری تھا وہی جاری رہا۔ پیغمبر خدا نے اسے مسدود نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ شرع محمدی نے اسے پسند کیا۔ نماز جنازہ پڑھنے کا طریقہ آنحضرتؐ نے البتہ مستزاد کیا اور یہ بطور شعار طریقہ محمدیؐ کے قائم کیا گیا۔ جس طرح آج کل عیسائی قومیں ہر کام کے ساتھ کھانے کا انتظام ضرور کرتی ہیں اسی طرح مسلمانوں میں ہر مجمع کے ساتھ نماز یعنی ذکر خدا کا دستور قائم ہوا ہے۔ مسلمان نماز خدا پڑھ کر خدا کی امانت خدا کو سونپتے ہیں اور چپ چاپ مردہ کو زمین کے اندر دفن کرکے چلے آتے ہیں۔ دنیا میں اس تہذیب و شائستگی کی نظیر نہیں ملتی۔

نماز جنازہ سے الگ ہو کر طریقہ دفن پر اگر گفتگو کی جائے تو ہندوؤں کے جلانے یا دریا میں بہانے اور پارسیوں کے زاغ و زغن کے کھلانے سے مسلمانوں کا قبر کے کیڑوں کی ابری سے بری

صورت ورنہ قبر میں کیڑوں کا کھانا لازم نہیں ہے اور بہت سی لاشیں بغیر اس کے سبھی جزو زمین ہوجاتی ہیں۔) نذر کرنا دیکھنے میں بھلا اور نہایت ہی شائستہ معلوم ہوتا ہے۔

پارسیوں کے طریقے پر عمل کر کے ہوا کا خراب کرنا یا ہندوؤں کے طریقہ سے آب دریا کا خراب کرنا بدیہی طور پر بدنما ہے جس کا معرض بحث میں لانا ہم نہیں چاہتے۔ صرف جلانے کا طریقہ جس کو بعض مہذب یورپین نے بھی پسند کیا ہے قابل لحاظ ہے۔ واضح رہے کہ مردوں کا جلانا یا تو کمال ناشائستگی کے زمانے میں قائم ہوا جبکہ آدمی کو آدمی سیخ پر بھون کر کھا جاتا تھا اور اتنی بھی تہذیب نہ تھی کہ تین چار ہاتھ کا گڑھا وہ آسانی سے کھود سکتا۔ یا اعلیٰ درجہ کی تہذیب پھیلنے کا یہ نتیجہ ہے۔ جیساکہ اب بعض یوربین لوگوں نے اختیار کیا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ جو طریقہ اس وقت مردوں کے پھونکنے کا جاری ہے کہ تھوڑی سی لکڑی پر رکھ کر ان کے اعزہ سیخ کے کباب کی طرح مردوں کو الٹ پلٹ کر کسی طرح نیم برشت کر لیتے ہیں یہ طریقہ نہ تو یورپ میں پسندیدہ ہوسکتا ہے اور نہ ہندوؤں کی مقدس کتاب کی رو سے جائز ہے۔ جلانا وہی پسندیدہ ہے کہ آنکھ سے مردہ نہ نظر آئے اور تھوڑی دیر میں اسکی خاک دیکھی جائے۔ یہ طریقہ سب سے اچھا لیکن زیر زمین دفن کرنے سے کسی طرح بہتر نہیں ہے۔ علاوہ بدنما ہونے کے خلاف مصلحت بھی ہے بعض حالتیں سکتہ کی ایسی ہوئی ہیں کہ پانی سے یا قبر سے مردہ پھر زندہ واپس آیا ہے۔ لیکن آگ کے شعلوں سے آج تک کسی کو زندہ واپس آتے ہوئے نہیں سنا۔ بدنمائی کی نسبت بعض کہتے ہیں کہ قبر کا گلنا سڑنا آگ کے جلنے سے کم ہے۔ یہ صحیح ہے مگر اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ انسان کے شکم میں تمام آلائش بھری ہوئی ہے اور کچھ بھی بدنمائی نہیں ہے وہ ظاہر ہو اور پھر دور نہ کی جائے۔ تو البتہ بدنما اور سخت بدنما ہے۔

اس موقع پر ایک حکایت قابل تذکرہ ہے۔ میرے پاس ایک پنجاب کا مسافر آیا اور اس نے بیان کیا کہ میں سکھ تھا اور مسلمان ہوگیا۔ اس زمانے میں کوئی مسلمان ہو جاتا ہے۔ تو مجھ کو بہت کم خوشی ہوتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہ کڑاہی سے نکل کر آگ میں . . . . . گر ابت پرستی چھوڑ کر قبر پرستی اختیار کی تو اس نے کیا ترقی کی۔ میرا خیال اس مسافر کی نسبت یہ ہوا کہ کسی مسلمان عورت سے تعلق پیدا ہونے سے مسلمان ہوگیا ہوگا یا جھوٹ بولتا ہوگا ایک روز برسبیل تذکرہ اس نے بیان کیا کہ مجھ کو اسلام کے طریقوں کی طرف عرصہ سے رغبت تھی اور جب کوئی مردہ پھونکا جاتا ہے تو مجھے برا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن برادری کے تعلقات سے مسلمان ہونے کی طرف میری ہمت نہیں ہوتی

تھی۔ اتفاق سے میرے باپ کا انتقال ہوا اور مجھے جوان کا سپھو نکنا لازم آیا۔ طوعاً و کرہاً میں نے انکو جلایا لیکن طبیعت بہت زیادہ بدحظ ہوئی۔ گھر پر آتے آتے میں نے اعلانیہ کلمہ پڑھ لیا تاکہ لوگ واقف ہو جائیں اور پھر ایسی سخت خدمت کی توقع مجھ سے نہ رکھیں؛ اس کا یہ بیان سن کر مجھ کو اس سے ہمدردی ہوئی اور میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے اس کا بیان سچ ہو اور اس نے مارل کرج (اخلاقی بہادری) کے مقتضا سے اسلام قبول کیا ہو۔

فصل نمبر ۲۷

مختلف مباحث پر نصوص قرآنی

شہادت

آپس کے معاملات میں گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نظر بہ ضعف حافظہ انسانی دو گواہ شرع میں ضروری ہوتے ہیں اور عورتیں بہ لحاظ اپنی کمزوریوں کے دو ایک مرد کے برابر سمجھی جاتی ہیں۔ قرآن میں گواہی سے گریز کرنا گناہ قرار پایا ہے۔ آیات قرآنی یہ ہیں۔

" اپنے لوگوں میں سے جن پر تمہارا اطمینان ہو دو مردوں کو گواہ کر لیا کرو۔ دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں کہ ایک بھول جائے گی تو دوسری اسے یاد دلا دیگی اور گواہی کو نہ چھپاؤ۔ جو کوئی اسے چھپاتا ہے وہ دل کا کھوٹا ہے[1] "

حُبّ دنیا

" انسان کو مرغوب چیزوں یعنی بیویوں، لڑکوں، سونے چاندی کے بڑے بڑے ڈھیروں عمدہ عمدہ گھوڑوں، مویشیوں اور کھیتی کے ساتھ دل بستگی ہوتی ہے حالانکہ یہ دنیا کی زندگی کے چند روزہ فائدے ہیں اور اچھا ٹھکانا اسی اللہ کے ہاں ہے[2] "

صبر

دنیا کی زحمتوں کا مقابلہ کرنے والی کوئی شے ہے تو وہ صبر ہے۔ اس کے متعلق قرآن میں ہے۔

---

[1] سورۂ بقر۔ رکوع ۳۹۔

[2] سورۂ آل عمران رکوع ۲۔

"مسلمانو تکلیف برداشت کرو اور تکلیف برداشت کرنے کی تعلیم دو اور آپس میں مل کر رہو۔ اللہ سے ڈرو تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو[1]۔"

"تکلیف برداشت کر کہ اللہ نیکو کاروں کے اجر کو ضائع نہیں ہونے دیتا[2]۔"

صادق البیانی والیفائے وعدہ

زمانہ جاہلیت کے عربوں میں تمام عیوب تھے لیکن وعدے کے وہ پکے ہوتے تھے اور کذب کو نہایت مذموم جانتے تھے باوجودیکہ ان کے متعلق عربوں کو چنداں تعلیم کی ضرورت نہ تھی پھر بھی قرآن میں اس کے متعلق بہت سی آیتیں ہیں۔ اگر عربوں کی حالت اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی سی ہوتی تو شاید قرآن کے دو حصوں میں عقد ہوگان اور ایفائے وعدہ کے احکام ہوتے اور ایک حصہ میں دیگر احکام درج کئے جاتے۔ قرآن کی آیتیں جو اس کے متعلق ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

"مسلمانو! اپنے اقراروں کو پورا کرو[3]۔"

"تمہاری لالعینی (یعنی غیر ارادی) قسموں کا خدا مواخذہ نہیں کرے گا۔ ہاں پکی قسموں کا تم سے مواخذہ کرے گا اور اس کا کفارہ ہے دس مساکین کو بیچ راس کا کھانا کھلانا جیسا کہ بال بچوں کو کھلاتے ہو۔ یا دس مساکین کو کپڑا پہنانا یا ایک بردہ آزاد کرنا۔ پھر جسے یہ مقدرت نہ ہو وہ تین دن روزہ رکھے[4]۔"

"جب کہو تو قرابت مند ہی کیوں نہ ہو انصاف کی کہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ اللہ تم کو یہ حکم دیتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو[5]۔"

"مسلمانو! خدا سے ڈرو اور سچ بولنے والوں میں رہو۔"

"اور جب تم آپس میں قول و اقرار کر لو تو اللہ کی قسم کو پورا کرو اور قسموں کو جب پکی کر لو نہ توڑو۔ حالانکہ تم اللہ کو اپنا ضامن ٹھہرا چکے ہو۔ اللہ تمہارے افعال سے ضرور واقف ہے[6]۔"

---

[1] سورۂ آل عمران رکوع ۲۰ [2] سورۂ ہود رکوع ۱۰ [3] سورہ مائدہ رکوع ۱
[4] سورۂ مائدہ رکوع ۱۲ [5] سورہ الانعام رکوع ۱۹ [6] سورۂ نحل رکوع ۱۳

شفاعت و رسالت

نبی۔ پیغمبر اور مصلح قوم ہر قوم میں ہوئے لیکن بعد انکی وفات کے تابعین نے ان کے درجات خدا سے بھی بڑھا دیئے۔ عیسائی حضرت عیسیٰ کو پسر خدا کہنے لگے۔ ہندوستان میں تو بجائے خدا کی پرستش کے انسان کی پرستش صریح طور پر قائم ہے۔ جہاں عرب تمام نبیوں کے بت خانہ کعبہ میں رکھتے تھے وہ بھی ایک قسم کی پرستش تھی۔ غرضکہ ابتدائے اسلام کے وقت اور اب بھی دنیا میں سوائے اسلام کے اور کوئی ایسا مذہب نہ تھا اور نہ ہے جس میں بندہ اور خدا کے درمیان میں کوئی واسطہ نہ ہو۔ یہ شرف اسلام کو حاصل ہے کہ بندہ کو خدا سے بغیر کسی توسل کے تعلق رہتا ہے اور یہ ایک ایسی صفت مذہب اسلام کی ہے کہ تمام علمائے عیسائی زمانہ حال کے اس کے معترف ہیں۔ اسلام میں پیغمبر محض خدا کا پیغام لانے والا بندوں کی طرف سمجھا گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان اپنے پیغمبرؐ کی عزت کم کرتے ہیں۔ بڑی عزت کرتے ہیں لیکن اس کو خدا کا بیٹا یا خدا کے کاموں میں دست اندازی کرنے والا نہیں سمجھتے یعنی اپنے پیغمبرؐ کی ایسی عزت نہیں کرتے جس سے خدا کی عزت کم ہو جائے اپنے پیغمبرؐ کی نسبت انکا مقولہ ہے ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کو بھی لوگ اور امتوں کی طرح خدائے ثانی نہ سمجھنے لگے اس کے متعلق بطور حفظ ماتقدم جو آیتیں قرآن میں ہیں وہ یہ ہیں۔

• محمدؐ ایک رسول ہے اور اس سے پہلے بھی رسول گزرے ہیں[1]۔

• اللہ نے مسلمانوں پر فضل کیا کہ انکے پاس انکی قوم کا ایک رسول بھیجا جو ان کو خدا کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور قرآن اور حکمت ان کو تعلیم دیتا ہے۔ اس پیغمبر سے پہلے وہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے[2]۔"

• اس دن سے ڈرو کہ جب کوئی شخص کسی شخص کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ اس سے معاوضہ قبول کیا جائے گا نہ کسی کی سفارش (شفاعت) فائدہ دیگی اور نہ لوگوں کو کسی سے مدد پہنچے گی[3]۔"

"اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص کسی شخص کے کام ذرا بھی نہ آئے گا۔ نہ کسی کی شفاعت قبول ہوگی نہ معاوضہ لیا جائے گا اور نہ کسی کی مدد پہنچے گی[4]۔"

"کون ہے جو بے حکم اس کے (خدا کے) اسکی جناب میں کسی کی شفاعت (سفارش) کرے[5]۔"

---

[1] آل عمران رکوع ۱۵ [2] آل عمران رکوع ۱۷ [3] سورہ بقر رکوع ۱۵ [4] سورہ بقر رکوع ۶ [5] سورہ بقر رکوع ۳۴۔

"کوئی شخص کسی کا شفیع (سفارش کرنے والا) نہیں ہو سکتا مگر اس (خدا) کی اجازت سے"[1]

"اس دن کی شفاعت (سفارش) کام نہ آئے گی مگر اسکی جسکو خدا اجازت دے اور اسکا بولنا پسند کرے"[2]

مداخلت

یہ کچھ نیکی نہیں ہے کہ پچھواڑے سے گھروں میں آئے۔ بلکہ نیکی یہ ہے کہ پرہیزگاری اختیار کرے اور گھروں میں آئے تو اس کے دروازوں سے ہو کر آئے"[3] (ایام حج میں عرب پچھواڑے سے مکانوں میں آتے تھے حکم ہوا کہ یہ لغو حرکت ہے)

"مسلمانو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں گھر والوں سے پوچھے اور ان کو سلام کئے بغیر نہ جایا کرو۔ تمہارے حق میں یہ بہتر ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ اس کا خیال رکھو اگر گھر میں کوئی نہ ہو تو جب تک اجازت نہ ملے تم اس میں نہ جاؤ اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس جاؤ تو واپس جایا کرو کہ یہ تمہارے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے اللہ کو تمہارے اعمال کی خبر ہے۔"

آج کل تمام مہذب قوموں کا اس پر عمل ہے اور اگر کوئی ہندوستانی اس پر عمل کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ انگریزوں کی تقلید بیجا ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ قرآن کے حکم کی تعمیل ہے۔

"جب تمہارے لڑکے بلوغ کو پہنچیں تو جس طرح ان سے بڑے (گھروں میں آنے کے لئے) اجازت مانگتے ہیں اسی طرح انکو بھی اجازت مانگنا چاہیئے"[4]

صدقہ

خیرات کا مال بس حق ہے فقیروں کا محتاجوں کا ان کارکنوں کا جو صدقات پر تعینات ہیں اور ان لوگوں کا جن کے دلوں کا پرچانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں بھی خرچ کرنا چاہیئے اور قرضداروں اور محتاجوں اور مجاہدوں اور مسافروں کو بھی دینا چاہیئے یہ اللہ کے ٹھہرائے ہوئے حقوق ہیں کہ وہ علیم و حکیم ہے"[5]

"اگر خیرات ظاہر میں دو تو وہ بھی اچھا ہے اور اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے ایسا دینا تمہارے گناہوں کا کفارہ ہو گا۔ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے"[6]

مال یتیم

"یتیموں کے مال ان کے حوالے کرو اور مال طیب کے بدلے مال حرام نہ لو (یعنی اپنے خراب مال سے یتیموں کا اچھا مال نہ بدلو) اور نہ ان کے مال اپنے مالوں میں ملا کر خورد برد کرو۔ یہ بڑے گناہ کی بات ہے...

یتیموں کو کاروبار میں لگائے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچیں۔ اسوقت اگر ان میں صلاحیت دیکھو

---

[1] سورہ یونس رکوع ۱ [2] سورہ طہ رکوع ۶ [3] سورہ بقر رکوع ۲۴ [4] سورہ نور رکوع ۸ [5] سورہ توبہ ۸ [6] سورہ بقر رکوع ۳۷

توانکا مال ان کے حوالے کر دو اور ایسا نہ کرنا کہ ان کے بڑے ہونے کے اندیشے سے جلدی جلدی انکا مال فضول خرچی کر کے کھا پی ڈالو (دنی) یا مقدور کو یتیم کے مال سے بچنا چاہیئے اور حاجتمند بقدر ضرورت کھالے (تو مضائقہ نہیں) اور جب یتیموں کو انکے مال حوالے کرنے لگو تو گواہ کر لو ورنہ حساب لینے کو تو اللہ بس ہے ... جو لوگ ناحق یتیموں کا مال خرد برد کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ انگارے سے بھرتے ہیں اور عنقریب دوزخ میں پڑیں گے[1]"۔

کون ہے جس کے پاس چھوٹے چھوٹے بھانجے اور بھتیجے یتیم ہو کر رہتے ہیں اور وہ قرآن کے مطابق ان کے مال ان کے بلوغ پر گواہوں کے سامنے ان کے سپرد کرتا ہے اور انکی نابالغی میں سمجھتا رہتا ہے کہ ان کے بلوغ پر حساب دینا ہوگا اس زمانۂ انحطاط میں کوئی ایسا نہیں ہے لیکن اپنے عروج کے زمانہ میں جب نیتیں بخیر تھیں تمام مسلمان ایسا ہی کرتے

شاعری:۔ شاعری تو نام ہے کلام موزوں کا لیکن عرب میں ہجوگوئی اور تغزل کا نام شاعری تھا قرآن میں اس لغوگوئی کے متعلق ارشاد ہوا۔ "شعرا کے پیرو گمراہ ہوتے ہیں۔ تو اس بات پر نظر نہیں کرتا کہ شعرا (خیالی) میدان میں سرگرداں رہتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو خود نہیں کرتے[2]"۔ لیکن حدیث سے ثابت ہے کہ شاعروں نے جب اسلام کے متعلق قصیدے لکھے اور پیغمبرؐ کی تعریف کی تو پیغمبرؐ نے پسند فرمایا۔

حرام وحلال:۔ "اس نے تو تم پر بس مرا ہوا (جانور) اور خون اور سور کا گوشت حرام کیا ہے اور نیز وہ جو خدا کے سوا کسی اور کیلئے نامزد کیا جائے۔ جو مجبور ہو عدول حکمی کرنے والا اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو اسپر (کسی چیز کے کھا لینے کا) گناہ نہیں ہے اللہ بے شک بخشنے والا مہربان ہے[3]"۔

"چارپائے جانور تمہارے لئے حلال کر دیئے ہیں باستثنائے ان کے جو آگے تم کو سنائے جائیں گے لیکن حالت احرام میں تم شکار کو حلال نہ سمجھو[4]"۔

"مرا ہوا جانور، خون، سور کا گوشت اور وہ (جانور) جو خدا کے سوا کسی اور کے لئے نامزد کیا گیا ہو گلا گھٹنے سے مر گیا ہو چوٹ سے مرا ہو گر کر مرا ہو اور سینگ لگ کر مرا ہو۔ یہ سب تم پر حرام ہیں اور نیز وہ جانور جن کو درندوں نے کھایا ہو مگر جسکو تم حلال کر لو وہ حرام نہیں ہے۔ اور وہ بھی حرام ہے جو کسی تھان پر ذبح کیا گیا ہو اور تیروں سے جو آپس میں تقسیم کرتے ہو یہ گناہ ہے[5]"۔ (یہ ایک قسم کی قمار بازی تھی کہ اونٹ کے گوشت تیروں سے جہاں عرب باہم تقسیم کرتے تھے۔

فصل نمبر ۵۔

مسلمانان ہند کی حالت زار

یا ابا الفضل رسولِ عربی کی امت ٭ نفس سرکش کی مقلد ہے خدا کی قدرت

---

[1] النسار رکوع ۱ [2] شعرار رکوع ۱۱ [3] البقرہ رکوع ۲۱ [4] المائدہ رکوع ۱ [5] المائدہ رکوع ۱۔

بندۂ خاص تھے ہم مورد الطاف تھے ہم — یوں جدا رہتی نہ تھی ہم سے خدا کی رحمت

دن برے آئے تو مت بدلی زمانہ بدلا — اپنی نیت نہ بدلتی تو نہ ہوتی یہ گت

راہ ٹیڑھی جو چلے اس کا نتیجہ دیکھا — دیکھیے اور دکھاتی ہے ابھی کیا قسمت

چھوڑ دی پیروئ دین محمدؐ ہم نے — جاہ و دولت نے ہمیں چھوڑ دیا یا قسمت

اپنے مذہب کا پتہ ہی نہیں چلتا ہم کو — کون معبود ہے اور کیا ہے ہماری ملت

ہم نہ مومن ہیں نہ کافر نہ مجوسی نہ یہود — دہریہ ہونے سے ہم کو ہے بظاہر نفرت

پارسی ہیں نہ مسیحی نہ کوئی اور طریق — ہم کو آتشکدہ اور چرچ سے بھی ہے نفرت

بت پرستوں کے مقلد ہیں دلوں میں لیکن — منہ سے انکار ہے انکار میں از حد شدت

اپنی آنکھوں سے لگاتے تو ہیں قرآن کو ضرور — اس کے احکام سے لیکن ہے سراسر وحشت

یا تو مجموعۂ احکام سمجھتے ہی نہیں — یا نہیں جانتے قرآن کی اعلیٰ عظمت!

یوں تو پڑھ لیتے ہیں اک رات میں قرآن تمام — ضد ہے مفہوم سے لفظوں سے بظاہر رغبت

پیر جیلاں سے ہے اس طرح حکایت منسوب — پوچھی اک روز مریدوں نے صحابہ کی صفت

حضرت قدوۂ جیلاں نے یہ ارشاد کیا — تم اگر دیکھتے اصحاب نبی کی صورت

یہی کہتے کہ جماعت ہے یہ دیوانوں کی — یہی کہتے کہ نہیں ہے یہ نبیؐ کی امت

اور وہ دیکھتے تم کو تو تحیر ہوتا — کہتے کفار سے بھی انکی ہے بدتر حالت

آخری دور مغل میں تھا ابتر جیسا ہند — اس زمانہ میں تھی ویسی ہی عجم کی حالت

دن دکھائے یہ جہالت نے انھیں آخرکار — ہوئے کفار مغل وارث تخت و دولت

سندھ سے قاہرہ تک کفر کا آوازہ تھا — کعبۃ اللہ میں تھے نام کو اہل سنت

شان معبود کہ کفار مسلمان ہوئے — اور پھر ان سے ہوئی دین کی اپنے عزت

شرک کا نام مٹا دور معاصی گزرا — نور اسلام نے دنیا سے مٹائی ظلمت

کچھ دنوں تک رہی پابندئ احکام رسولؐ — کچھ دنوں تک رہی اسلام کی اچھی حالت

رفتہ رفتہ ہوئی پھر اس میں خرابی پیدا — رفتہ رفتہ ہوئی پھر اس میں نمایاں نکبت

چھا گئیں آکے جہالت کی گھٹائیں ہر سو — چھا گئی دیکھتے ہی دیکھتے کیسی ظلمت

جس طرف دیکھیے ادبار فلاکت طاری — نہ ترقی نہ وہ اقبال نہ علم و دولت

جہل ہی جہل ہو پھر کیوں نہ ہو کمزور خیال — علم کے ساتھ گئی ساری دماغی قوت

جہل اک نام ہے اخلاق کی کمزوری کا — اور تعلیم کا حاصل ہے صفاتی قوت

عبرت اے دیدۂ بینا کہ ہوا ہے کیا حال — مگر افسوس کہ سمجھ میں تو بھری ہے غفلت
کتنے ہم بڑھ گئے تھے جبکہ نہ تھے ہم کچھ بھی — کس قدر گھٹ گئی ہے بڑھ کے ہماری ہمت
سارے ملکوں میں برا ملک ہمارا افسوس — سارے عالم میں برائی کی ہماری شہرت
ساری قوموں سے بری قوم ہماری اے وائے — سب کی قسمت سے بری آج ہماری قسمت
واہ ری ہند کی اقلیم ترا کیا کہنا — تیری قوموں کا عروج اور وہ انکی رفعت
انھیں قوموں میں تھی اک قوم مسلمان جو آج — ظل ظلمت کو سمجھتی ہے فروغ عزت
کوئی درجہ نہیں بے شرمی و گمراہی کا — جبکی تکمیل میں قاصر ہو ہماری ہمت
بت پرستی کے جو دشمن تھے انھیں کی اولاد — بت پرستی کو سمجھتی ہے شعار ملت
بھولی توحید کو قوم مسلمان۔ افسوس — ہیں اگر ہم میں موحد تو بشان ندرت
دیوتا ہند میں دس تھے تو مسلمانوں نے — کر دیئے ہیں یہ بے شرک کی انکے حالت
ہائے انصاف کرے کوئی موحد ہم میں — یا یہ عیسائی کہ تثلیث ہے جن کی ملت
منہ سے کہتے ہیں خدا ایک ہیں لیکن دل میں — یہ سمجھتے ہیں کہ سب میں نہیں خالق کی صفت
اور ہم لوگوں میں وہ جہل کہ خالق ہے ہیچ — روح کو مردوں کو حاصل ہے یہ دست قدرت
بخش کے ساتھ عمر۔ زید۔ بکر کی ترکیب — نام ہی سے ہے عیاں قوم کی پوری حالت
کوئی غازی کہیں بچلا ہے کہیں کوئی شہید ! — کم کہیں پیر و پیمبر سے خدا کی طاقت
پیر در شاہ صفی قوم کے اعلیٰ افراد — ہند میں آئے تو انکی بھی بنی کیسی گت
گنبد و قبر پرستی سے تھی نفرت پہلے — اب اسی کو وہ سمجھتے ہیں شعار ملت
شرم ہم کو ہے نبی کی نہ خدا کا ڈر ہے — کفر سے شرک سے مملو ہے ہماری بدعت
گھر میں بیوائیں چھپے چوری جو چاہیں کر لیں — عقد کا نام کہیں آئے تو آئے شامت
پردہ داری سے ہے مقصود نہ ہو پردہ دری — ایسے پردوں سے دبا ہے کہیں زور فطرت
ہوں جو لوہے کے گھڑے ٹیڑھے تو سیدھا کر دیں — دیکھ لو آنکھ سے تم بھیگے چنوں کی طاقت
دانے بارود کے قلعوں کو اڑا دیتے ہیں ! — دمدمے کیسے ہی مضبوط ہوں آئے شامت
پھاڑ کر پیٹ زمیں کا نکل آئیں شاخیں — روکنے سے کبھی رکتا نہیں زور فطرت
فرض کر لو کہ ہزاروں میں کہیں ہیں دو چار — ایسے گھر جن میں کم آتی ہے گناہ کی نوبت
ایک کا مورد الزام بھی ہونا ہے بہت — منہ دکھائے نہ کبھی قوم جو ہو کچھ غیرت
قوم کی رسم نے مجبور کیا خاطی کو ! — قوم کے فعل سے پہنچی یہ گناہ کی

کامیابی بھی اگر تم کو ہوئی فرض کیا　　رہ گئی عفت و عصمت کی سراسر عزت
تو بھی سمجھو کہ ہوا کام یہ تم سے کیسا　　ہائے وہ کام سراسر جو خلاف سنت
مرد و زن کی کبھی رکھنے کی نہیں یکجائی　　جان لو خوب کہ اس پہ ہے مدار خلقت
آفرینش کے قوانین بدل دے کوئی　　غیر ممکن ہے نہیں اتنی کسی میں قدرت
آفرینندۂ عالم کو بڑھانا مقصود　　ہائے افسوس گھٹانے کی تمہاری نیت
چاند پہ خاک نہ ڈالو کہ غلط ہے کوشش　　خاک بر سر تمہیں رکھے گی تمہاری ذلت
یہ لڑائی تو ہے اللہ سے توبہ - توبہ　　اس کے احکام سے آئین سے تم کو نفرت
کج روی تم میں جہالت کی ہے کیا کام چلے　　کام آ ہی نہیں سکتی ہے کبھی الٹی مت
اس شرافت سے رذالت ہی کہیں بہتر ہے　　اچھے اچھوں سے رذیلوں کی ہے اچھی حالت
انکی بیوائیں کریں عقد رہیں باعصمت　　انکی بیوائیں رہیں قید اٹھائیں ذلت
اپنے دستور سے پابند یہ عصمت کی نہیں　　جن گھروں میں کہ ہو قرآن وہاں یہ حالت
یہی اطوار رہے اور جو کچھ دن قائم　　کیا عجب ہے جو رذیلوں سے ہو بد تر حالت
ناز جس بات پہ اسلاف کو تھا آج وہی　　فہم و دانش میں ہمارے ہے ہماری ذلت
عورتوں پر جو مظالم ہیں وہ لاتحصیٰ ہیں　　بڑھتی ہی جاتی ہے جور اور ستم کی شدت
عورتوں کے جو ہیں مرقوم قصص قرآں میں　　ناخوش اسپر ہے رسولِ عربی کی امت
وہ تو اترا نہیں قرآن زبان میں انکی　　کیا غضب تھا جو سمجھ جاتے یہ اسکی آیت
ہر جگہ اپنی جہالت کا اثر دکھلاتے　　اور کہا جاتے یہ توریث کی ہر اک آیت
کفر ہے کفر کہ قرآن کو اچھا نہ کہیں　　یا یہ سمجھیں کہ ہے قرآن خلاف حکمت
کہے اللہ کہ دختر کو پسر سے دو نصف　　یہ کریں عشر کے دینے میں بھی تُو تُو حجت
عشر بھی دیتے ہیں دس بیس میں دو چار کہیں　　ورنہ کہہ دیتے ہیں لڑکی کو نہیں ہے رغبت
انکو ترکہ کی ریاست کی نہیں کچھ پروا　　گو کریں بنت نبی باغ فدک پر حجت
بعض ایسے ہیں کہ انکا ہے شعار مذہب　　غضب اور ظلم پہ تسبیح ہیں پڑھنا لعنت
قول یہ اور عمل یہ کہ عیاذاً باللہ !　　شیر مادر کی طرح بہنوں کے حق سے رغبت
کم ہیں وہ لوگ کہ لیں کام جو تاویلوں سے　　بہت ایسے نہیں تاویل کی جنکو حاجت
کیسے کیسے شرفاران میں معزز ممتاز　　خود بھی رہ جاتے ہیں آپکو فخر مدّت

جہل اک نا

نازاں فعل پہ جو فعل کہ قرآں کے خلاف
حق منصوص کے دینے میں ہے کیا کیا حجت

کوشش اسکی کہ نہ دے قوم سے کوئی حصہ
کہ نہیں دخت و نسا کو ہے کچھ اسکی حاجت

باپ ماں کی جو یہ حالت ہو تو بھائی ناحق
کیوں ہو بدنام کہ انساں ہے حریص الخلقت

سیر چشمی کے سبق بھول گئے ہیں ہم سب
بخل و اسراف سے ہے دل کو ہمارے رغبت

کوئی مہمان جو آجائے تو گھبرا جائیں !
ہم کو مہمان کی صورت ہے قضا کی صورت

کیسے اللہ کہ وعدے کر و ایفا اپنے
اور عدوں کی نہ ہو دل میں ہمارے عزت

ہوئے محتاج کہ تھے مست مئے جام غرور
آیا ادبار کہ تھی علم و ہنر کی قلت

جہل و نخوت سے سر و کار ہے ہم کو بالکل
اور تعلیم و تعلم سے نہیں کچھ رغبت

نہ تو غیرت ہے نہ ہمت نہ حمیت ہم میں
کمپٹیشن میں ٹھہرنے کی یہی ہے صورت؟

کر لیا آکے توکل نے گھر اپنا ہم میں
ہو گئی کسب معیشت سے ہمیں جب نفرت

نہ سفر کرنے کا ہے شوق نہ غم روزی کا
نہ تجارت سے تعلق ہے نہ شوق محنت

ہم کو کچھ فکر نہیں کل کی کہ ہم کیا ہونگے
جانتے ہی نہیں دنیا کی ہے اب کیا حالت

جھوٹ سچ ہے جو بزرگوں کی کمائی باقی
ہوتی جاتی ہے وہ سب نذر بساط عشرت

ہائے کیا ہو گیا وہ خلق وہ ہمدردئ قوم
ہائے کیا ہو گئی آخر وہ محبت الفت

یا وہی ہم تھے کہ تھے رونق بزم تمکین
یا وہی ہم ہیں کہ ہیں نقش بساط نفرت

یا وہ سطوت کہ چمکتے تھے بسان خورشید
یا یہ حالت کہ ہیں اب شمع سحر کی صورت

یا وہ سرگرمئ تحصیل کہ اللہ - اللہ
یا یہ درماندگئ شوق کہ عبرت - عبرت

یا اسی ہند میں تھے تاج سر اہل غرور
یا یہیں ٹھوکریں کھاتے ہیں خدا کی قدرت

نہ وہ اسلام نہ اب وہ برکات اسلام
بستر عیش پہ ہے قوم کو خواب غفلت

تمام شد

الاسلام

حصّہ دوم

از

علامہ ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی

نفیس اکیڈمی

بلاسس اسٹریٹ ——— کراچی

قیمت دس روپے